لیہ
تاریخ و ثقافت
ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

تاریخ و ثقافت

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر، لاہور (پاکستان)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب کا نام : لیہ (تاریخ و ثقافت)

مصنف : ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

اشاعت اوّل : 2010ء

ناشر : پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگوئج، آرٹ اینڈ کلچر،
پنجابی کمپلیکس-1، قذافی سٹیڈیم فیروز پور، روڈ۔ لاہور
فون: 042-9923165-70

پرنٹر : نیاز جہانگیر پرنٹر/ جہانگیر بک ڈپو

تعداد : 500

قیمت : -/350

پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگوئج، آرٹ اینڈ کلچر، لاہور (پاکستان)
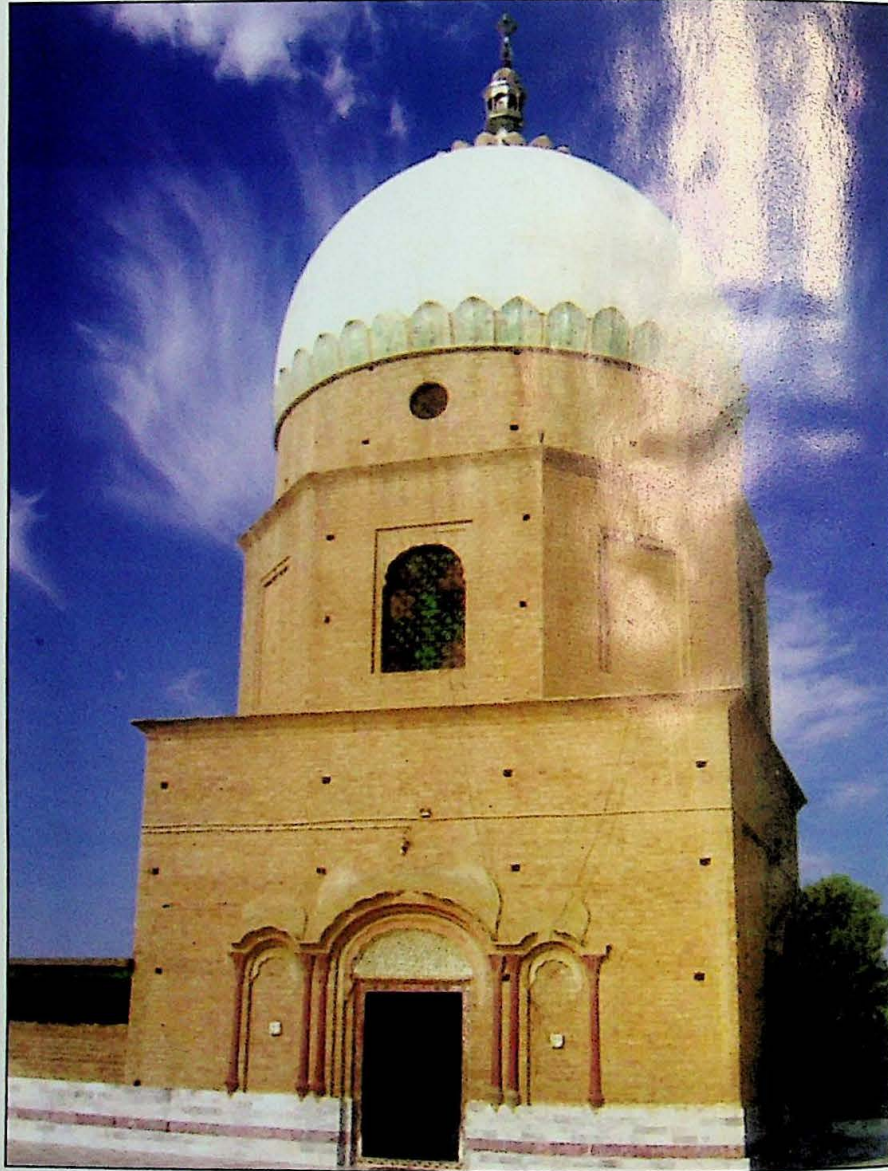
مزار حضرت حافظ سید حسن علی گیلانی المعروف جی شریف، ضلع لیہ

انتساب

چراغِ صحرا

حضرت نسیم لیہ رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

مزار حضرت پیر سواگ شریف، تحصیل کروڑ

مزار حضرت پیر سواگ شریف، تحصیل کروڑ

انتساب

چراغِ صحرا

حضرت نسیم لیہ رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

فہرست مضامین

تاریخی پس منظر اور قبائل

تہذیب وثقافت

شکاریات۔ جنگلی حیات

علمائے کرام اور ترویج اسلام

زراعت وتجارت

حرف وخیال کا جمال

مشہور مقامات

اوراق پارینہ

فہرست کتب

پیش لفظ

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

عہدِ موجود کا عہدِ ماقبل تاریخ کے مبہم اور روایات پر مبنی واقعات کے تسلسل سے ناتا استوار کرنا اور حقائق کو ان کی حقیقی ماہیت کے ساتھ تراش خراش کر آشکار کرنا مشکل اور تھکا دینے والا کام ہے۔ بالخصوص ان خطہ ہائے ارضی کے تاریخی سوتے تلاش کرنا مزید مشکل امر ہے جن کی قسمت میں صاحبِ اختیار افراد کی عدم توجہی رقم کردی جاتی ہے۔ بلاشبہ لیہ کے ریگزار کے ساتھ بھی یہی المیہ درپیش رہا اور جو کام اداروں نے کرنا تھا، وہ کام چند تھلوچی ادیبوں نے اپنے زورِ قلم سے سرانجام دینے کی بھرپور کوشش کی مگر تشنگی باقی رہی۔ ہر چند کہ میں نے تھل کے باغ و بہار، لالہ وگل اور تابِ صحرا کی جو کیفیت برسوں قبل اپنے زمانہ تعیناتی میں دیکھی تھی، اس پر نام نہاد ارتقائی سفر کی دبیز گرد پڑ چکی ہے اور ریگزار تھل کے حقیقی مناظر دھندلا گئے ہیں مگر اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ قدرتی صناعیوں اور انسانی رویوں کی مخلصانہ حدتوں میں ابھی دم خم باقی ہے۔ موسم پہلی سی شدت گنوا چکے ہیں مگر صحرا کی رات ابھی جاگتی ہے۔ میں نے چاہا کہ اپنی آنکھ میں ثبت ان مناظر اور سادہ دل تھلوچیوں کے مخلصانہ رویوں کو صفحہ قرطاس پر نقش کر دوں اور میں نے اپنے شوق کو ادب و تحقیق میں ایک اضافے کے طور پر پیش کر دیا۔ یہ کام آسان نہیں تھا مگر قدرت کی ودیعت کردہ غیر معمولی توانائیاں اسے لحہ بہ لحہ مجھ پر سہل کرتی گئیں اور یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچتا گیا۔

نسیمِ لیہ اور خیال امروہوی کی توانا سانسوں کی حدت آج بھی علاقہ لیہ میں محسوس ہوتی ہے اور اپنا منفرد ادبی گداز دھڑکنوں کو بخشتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو فکری قندیلیں روشن کی تھیں، ان کی کرنیں آج تھل سے نکل کر وطن عزیز میں چہار سو پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان

شخصیات کو بجا طور پر قومی افق پر ادب کے روشن مینار قرار دیا جا سکتا ہے۔

فرزندِ تھل لیہ ناصر ملک سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی تحقیق ''لیہ دی تاریخ''، پر مسعود کھدر پوش ایوارڈ وصول کرنے پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر آیا تھا۔ اس سے قبل میں نے اس کی ایک اور تحقیقی کاوش ''انسائیکلوپیڈیا آف لیہ'' کا مطالعہ کیا تھا۔ ناصر ملک نے پہلی ملاقات میں نسیم لیہ اور ڈاکٹر خیال امروہوی کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ بلاشبہ یہ اُسی قبیل کا شخص ہے اور اپنے اندر بے پناہ صلاحتیں اور ماں دھرتی کی والہانہ محبت رکھتا ہے۔ وہ کم عمری میں تشنگانِ ادب کو آٹھ تحقیقی و تخلیقی کتابیں پیش کرنے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا ہے۔ اردو اور پنجابی کا حساس شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت فعال اور منصف مؤرخ بھی ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں، اس نے اپنی ماں دھرتی سے بے پناہ محبت کے سبب، بہت معاونت کی۔ کتاب کی نظر ثانی کا عمیق کام نہ صرف اپنے ذمہ لیا بلکہ تھل کی نایاب تصاویر بھی زینتِ تحقیق کیں۔ میں ناصر ملک کی معاونت پر دلی طور پر اس کا مشکور ہوں۔

میں نے دریائے سندھ کے کنارے صدیوں کی مسافت کے امین لیہ شہر و علاقہ کو اس کتاب میں مختلف پہلوؤں سے دیکھنے کے بعد اپنی تالیف و تصنیف میں سمیٹنے کی اپنے تئیں پوری کوشش کی۔ یہ بہت بڑا مضمون ہے۔ اس کے بھرپور اور جامع بیان کیلئے ہزاروں صفحات درکار ہیں مگر میں نے دریا کو کوزے میں سمیٹتے ہوئے تشنگانِ تاریخ و ادب کیلئے ایک جہت، ایک سعی کی ہے جو یقیناً اس کارواں میں عمدہ اضافہ قرار پائے گی۔ باوجود کہ اسے اغلاط اور سقم سے مبرا رکھنے کی تمام کوششیں کی گئی ہیں مگر تحقیقی علم ارتقاء کی گنجائش رکھتا ہے۔ احباب ادب کی قیمتی آراء نہ صرف میرا زادِ سفر ہوگی بلکہ میری راہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دے گی۔ انہی سطور کے ذریعہ میں تھل کے عظیم فرزندان اور معروف قلم کاروں جناب پروفیسر مقبول الٰہی، جناب پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین، جناب حمید الفت ملغانی، جناب برکت اعوان اور دیگر احباب قلم جنہوں نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری قلمی معاونت کی، کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہم سب کو ملک و قوم کیلئے خود کو وقف کرنے کی صلاحیت اور شوق سے آراستہ کریں۔ آمین!

دیباچہ

ڈاکٹر مزمل حسین

لیہ دریائے سندھ کے آر پار واقع ہے۔ اس کی مغربی سمت میں دریائے سندھ بہتا ہے۔ اس شہر کا غالب حصہ دریا کے مشرقی کنارے واقع ہے اور کچھ علاقہ دریا کے مغربی کنارے واقع ہے جسے مقامی زبان میں ''بیٹ'' کہا جاتا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ مشرقی حصہ کو ''کچا'' یا نشیبی علاقہ کا نام دیا جاتا ہے۔ شہری آبادی سے ذرا پرے مشرقی طرف کا علاقہ صحرائی ہے جسے ''تھل'' کہتے ہیں۔ تھل کے پانچ اضلاع، خوشاب، میانوالی، بھکر، لیہ اور مظفر گڑھ ہیں۔ اگرچہ لیہ سمیت باقی اضلاع میں بھی ۱۹۴۷ء کی ہجرت اور پچاس کی دہائی میں نہر آنے سے اپر پنجاب سے جو پنجابی لوگوں کی آبادکاری ہوئی اس نے تھل کی تہذیب و ثقافت، شعر و ادب اور رہن سہن کو متاثر کیا لیکن اس تہذیبی و تمدنی تبدیلی کے دور رس اثرات زیادہ تر لیہ پر پڑے اور یہ شہر مقامی اور غیر مقامی آبادی کے امتزاج سے نئے سماجی طرز احساس سے سامنے آیا۔

لفظ ''لیہ'' کے اصل ماخذ کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیگر شہروں کی طرح یقیناً اس لفظ کے بھی کوئی نہ کوئی مقامی معنی ہوں گے لیکن جو نام زیادہ قرین قیاس ہے اور جس پر زیادہ مؤرخین متفق ہیں، وہ ایک مقامی سرائیکی زبان کا لفظ ''لئیاں'' ہے جو تہذیبی عمل سے ہوتا ہوا ''لیہ'' پر منتج ہوا ہے۔ ''لئیاں'' وہ دریائی جھاڑی ہے جو دریا کے کنارے اُگتی ہے چونکہ یہ شہر دریا کے کنارے واقع ہے اس لیے جہاں پر یہ جھاڑیاں کثرت سے اُگتی تھیں، شاید اس رعایت سے پہلے پہل اس علاقے کو ''لئیاں'' اور پھر بعد میں ''لیہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہو۔ اس کی بڑی دلیل یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ ان علاقوں میں جھاڑیوں اور درختوں کی رعایت سے نام رکھنے کی ایک بڑی روایت

موجود ہے۔ مثلاً آج بھی اس علاقے میں "کھجیاں شرف دین" (اس بستی میں کھجوروں کی کثرت ہے) نڑکی پڑوپی (نڑکی ایک جھاڑی کا نام ہے) اور ہرنولی (ہرنولی ایک جھاڑی کا نام ہے) کے نام کی بستیاں موجود ہیں۔

لیہ کی باقاعدہ اور معلوم تاریخ کا آغاز سولھویں صدی سے ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۵۰ء میں میرانی قبیلہ کے ایک مقامی سردار" کمال خان" نے لیہ شہر کی بنیاد رکھی۔ اس وقت اسے غازی حکومت میں صوبہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس سے پہلے تاریخ کے بارے میں ابھی تک مربوط انداز میں اور سائنسی نقطہ نظر سے کوئی نیا نظریہ سامنے نہیں آیا۔ انفرادی کوششوں سے بعض لوگوں نے یہاں سے کچھ آثار قدیمہ دریافت کیے ہیں لیکن کوئی حتمی نتیجہ سامنے نہیں آسکا۔

۱۵۵۰ء سے ۲۰۰۸ء تک ۴۵۵ برس کے عرصہ میں لیہ نے تاریخی اعتبار سے مختلف نشیب و فراز دیکھے۔ میرانیوں سے کلہوڑا، جسکانی، لسکانی، سدوزئی اور ننکائی خاندانوں کی حکومتوں کے بعد یہاں ۱۸۳۷ء میں "دیوان ساون مل" کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸۴۹ء میں ہی انگریزوں نے جب پنجاب پر پوری طرح اپنا قبضہ جمالیا تو لامحالہ طور پر لیہ بھی انگریز سرکار کی تحویل میں چلا گیا۔ ۱۸۴۹ء ہی میں اس شہر کو انتظامی امور کی بہتری کیلئے ضلعی صدر مقام بنادیا گیا۔ کیپٹن ہالنگز اس نو مولود ضلع کے پہلے ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے۔ اس ضلع کی میانوالی، منکیرہ، بھکر، لیہ اور کوٹ ادو تحصیلیں ٹھہریں۔ ایک سال بعد اسے ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا۔ ڈیرہ غازی خان، خان گڑھ، لیہ اور ڈیرہ اسماعیل خان کے اضلاع اس میں شامل کر دیئے گئے۔ کرنل راس اس ڈویژن کے منتظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ یکم جنوری ۱۸۶۱ء کو ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ڈیرہ اسماعیل خان منتقل دیا گیا۔ لیہ کا علاقہ بطور تحصیل ڈیرہ اسماعیل خان میں شامل کر دیا گیا جبکہ پہاڑ پور کو تحصیل کوٹ ادو سے علیحدہ کر کے تحصیل لیہ میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۸۷۲ء میں "سندھو بابا" ایسے بپھرا کہ کئی بستیاں اس کی لپیٹ میں آگئیں۔ یہ سیلابی سلسلہ دو تین برس تک چلتا رہا جس کے باعث یہاں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ گھروں کے گھر اور ہزار ہا جانور غرقاب ہوئے جس کے نتیجہ میں لیہ سکڑ کر رہ گیا۔ ۱۸۷۳ء میں اسے میونسپل کمیٹی کا درجہ دے دیا گیا اور اس کے ایک سال بعد ہی کروڑ لعل عیسن اور کوٹ سلطان میں میونسپل کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ تحصیل تونسہ شریف کے کئی گاؤں اس سے علیحدہ کر کے تحصیل لیہ میں شامل کر دیئے گئے۔ ۱۸۷۸ء میں مسٹر ٹکر صاحب بہادر اور منشی چرن لال کی

زیر نگرانی بندوبست اراضی شروع ہوا۔ یہ لیہ کا پہلا باقاعدہ منظم اور باضابطہ بندوبست ریکارڈ تھا جو تحریری شکل میں ہوا۔ اسی سال کوٹ سلطان کی میونسپل کمیٹی ختم کر دی گئی اور کوٹ سلطان کی یہ محرومی آج تک قائم ہے۔ ۱۸۸۴ء میں لیہ میں ریلوے لائن کو گزار کر اس شہر کو مظفر گڑھ، ملتان، کوٹ ادو، میانوالی اور راولپنڈی سے ملا دیا گیا۔ لیہ میں جدید ذرائع آبپاشی کے لیے کوٹ سلطان کے علاقے میں "ڈھول آلہ" کے مقام سے دریائے سندھ کے نالے "لالہ" سے نہریں نکال کے ایک بڑے علاقے کو سیراب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔

۱۹۰۱ء میں تحصیل لیہ کو ڈیرہ اسماعیل خان سے الگ کر کے ضلع میانوالی سے منسلک کر دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں لیہ کو میانوالی سے الگ کر کے ضلع مظفر گڑھ کے ساتھ بطور تحصیل منسلک کر دیا گیا۔ مظفر گڑھ سے یہ انتظامی الحاق ۷۳ برس تک رہا یعنی ۱۹۸۲ء میں لیہ کو ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ لیہ، چوبارہ اور کروڑ لعل عیسن اس نو مولود ضلع کی تحصیلیں ٹھہریں۔

ضلع لیہ اپنی تاریخ، تہذیب، ثقافت، فنون لطیفہ، شعر و ادب، دستکاریوں، کاشتکاری، آب و ہوا اور مجموعی سماجی فضا کے اعتبار سے منفرد اور انوکھے چلن کا شہر ہے۔ یہ پنجاب کے دور افتادہ اضلاع میں سے ایک ہے، لیکن تہذیبی حوالے سے پس ماندہ نہیں۔ اگرچہ مادی وسائل اور ریاستی نظر التفات کی کمی اس کا مقدر رہی لیکن یہاں کے باسی اپنے مزاج میں لبرل، محنتی، دانشور، وطن سے محبت کرنے والے اور جمہوریت پسند ہیں۔ اس کی تابندہ مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ وطن عزیز میں فوجی آمریت کے بانی ایوب خان نے الیکشن کروایا تو اس کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح نے علم جمہوریت بلند کیا۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں جن شہروں سے وہ کامیاب ٹھہریں ان میں لیہ بھی ایک تھا۔ شاید اسی لیے ذوالفقار علی بھٹو شہید نے اہل لیہ کے بارے میں کہا تھا کہ اس شہر کے لوگ سیاسی شعور سے مالا مال ہیں۔

اس ضلع کی سماجی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے لوگ نہایت پُر امن، انسان دوست اور صوفیانہ طرز احساس کے حامل ہیں۔ ماضی میں مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ مل جل کر رہنے کے عادی تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں کی صوفیانہ روایت بڑی توانا اور درخشاں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر 30 کے لگ بھگ بزرگوں کی خانقاہیں، مزار اور درگاہیں ہیں جن میں سے اکثر پر باقاعدگی سے عُرس منائے جاتے ہیں۔ اوران کے عقیدت مندوں کا حلقہ پورے

برصغیر تک پھیلا ہوا ہے۔ ان درگاہوں پر بلا تفریق ہر مذہب کے لوگ حاضری دیتے چلے آرہے ہیں۔

موسیقی، کھیل تماشے، شعر وادب اور دیگر ثقافتی سرگرمیاں یہاں کے لوگوں کی زندگیوں کا حصہ ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں قیام پاکستان سے قبل نور جہاں عرف نوری، نام کی ایک مشہور گائیک تھیں جو ممبئی میں جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں وہ معروف گائیک ''بدرو'' کی ہم عصر تھیں۔ اسی طرح نذیر (نذیری) اور امیر (میری) بھی اپنے وقت کی مشہور گلوکارائیں رہی ہیں۔ کھیلوں میں ظہور احمد خان المعروف زیڈ۔ اے خان گولہ، شارٹ پٹ اور ڈسکس تھرو میں بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ ۱۹۴۸ء میں انگلینڈ ورلڈ اولمپک طائفہ کے سربراہ کے طور پر اس نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ قائداعظم ان پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ ان کا تعلق اسی ضلع لیہ سے تھا۔ ظہور احمد خان جوانی میں مہاراج آف پٹیالہ کی فوج میں کیپٹن بھی رہے۔ ان کے علاوہ ڈُلی کمہار، تاجو مشہدی اور خدا بخش مشہدی (مشہدی برادران) پنجاب کے بڑے پہلوانوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے بعد حمید اعوان عرف لڈو، شیخ عزیز چن، بابر خان، عارف چھینہ، آفتاب چیمہ اور کامران حیدر معروف کھلاڑی رہے ہیں۔

لیہ کی قدامت کے آثار، سکوں، ٹھیکریوں، لوک ادب اور قدیم قبرستانوں کی خستہ حال قبروں میں نمایاں ہیں۔ لیہ کی قدیم بستیوں میں کوٹ سلطان، نواں کوٹ، چوبارہ، جمن شاہ، پہاڑ پور، پیر جگی وغیرہ شامل ہیں۔ لیہ شہر ایک ایسا شہر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شہر بنیادی طور پر ''بھنگ'' تھا۔ اس کی مثال بھنگ والی آوی (کمہاروں کی بھٹی) ہے جو شہر کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔ اس شہر کے اردگرد روایتی انداز کی حفاظتی دیوار (فصیل) اور دروازے تھے، جن کے آثار ۱۹۷۰ء تک قائم رہے۔ اب بھی مین بازار کے شروع کو شمالی گیٹ اور آخر کو جنوبی گیٹ کہا جاتا ہے۔ بیلے والا محلہ اور دھینگڑا محلہ (موجودہ محلہ گڑیانوی)، بھبے بازار، سبزی چوک اور جنڈ والی گلی، ماضی کی یادوں کو سمیٹے قائم دائم ہیں۔ مائی ماتا کا مندر، نانوں والا تھلہ، گاڑھو لعل کا مندر وغیرہ ماضی کی یادوں کے امین ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل لیہ کے لوگوں کا مذہب اسلام اور ہندومت تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہیں۔ تاریخی واقعہ ہے کہ نانواں آلہ تھلہ کے پاس گاؤشالہ پر ہر سال

موسیقی کی محفل ہوتی تھی اور دور دور سے گائیک آیا کرتے تھے۔ ان میں ایک ہندو گائیک گھن پت (ملتان) بھی آتا تھا جو گانے سے پہلے حسینی دوہڑے سناتا تھا۔ اس لیے لوگ اسے ''حسینی بھانبڑ'' بھی کہتے تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں پر مسلمان اور مسلمانوں کے تہواروں پر ہندو نہایت عقیدت واحترام سے آتے تھے۔ یہ رویہ یہاں کے لوگوں کی کائناتی محبت اور رواداری کا ترجمان ہے۔

اس ضلع کی تاریخ میں اہل سیاست کے کردار کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ قیام پاکستان سے قبل معروف کانگریسی راہنما جیسا رام ایک ایسا لیڈر تھا جس نے آزادی ہند کی جدوجہد میں سب سے پہلے اس علاقے میں اپنی گرفتاری پیش کی اور جب رہا ہوا تو اس نے تمام انگریزی ملبوسات کو چوک میں جلا ڈالا۔ قیام پاکستان کے بعد نذر حسین شاہ لیہ کے ایسے قابل فخر سیاست دان تھے جنھوں نے ذاتی جدوجہد سے سیاست میں اپنا مقام بنایا اور رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ اسی طرح بعد میں ملک قادر بخش جکھڑ بھی اپنے عہد کا نمایاں وکیل اور سیاست دان تھا۔ ان لوگوں نے اپنی سیاسی جدوجہد سے اہل ضلع کو وہ سیاسی شعور دیا کہ بڑے بڑے جاگیردارانہ ذہنیت کے سیاست دانوں کو اپنا رویہ، جمہوری اور عوامی بنانا پڑا، موجودہ دور میں ذاتی شخصیت اور جدوجہد سے نمایاں ہونے والے سیاست دانوں میں فرید خان میرانی، غلام محمد سواگ، مہر اللہ ڈیوایا تھند، الطاف چودھری، اصغر علی گجر، عابد انوار علوی، مہر اعجاز اچلانہ اور بابر خان کھتران نمایاں ہیں۔ لیہ کی قدیم درسگاہوں میں گورنمنٹ بھراتری ہائی سکول لیہ، گورنمنٹ پرائمری سکول نمبر ا لیہ، گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول لیہ، چندرائن سکول جمن شاہ، گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ سلطان، گورنمنٹ ہائی سکول کروڑ، آغاز ہی سے نمایاں ہیں۔

اہل لیہ کی قدیم ترین زبان سرائیکی ہے جسے یہاں کی غالب آبادی بولتی چلی آرہی ہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اُردو پنجابی بولنے والے طبقے کے آتے ہی یہاں پر زبان میں ایک نمایاں تبدیلی آنا شروع ہوئی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اہل لیہ، ذہین، علم وادب سے شغف رکھنے والے، زندگی کے ہر میدان میں ایک فعال کردار ادا کرنے والے لوگ ہیں۔ شعر وادب میں راجہ عبداللہ نیاز، ڈاکٹر مہر عبدالحق، ارمان عثمانی، نسیم لیہ، وقار انبالوی، غافل کرنالی، خیال امروہوی، نذیر چودھری، ڈاکٹر فیاض قادری، جعفر بلوچ، شعیب برکت اعوان، نور محمد تھند، ملک مقبول الٰہی، انجم صحرائی، اکرم میرانی، طارق گجر، منور بلوچ،

عدیم صراطی، سلیم گورمانی، جمشید ساحل، احسن بٹ، کاشف مجید، میاں شمشاد سرائی، احمد اعجاز، منظور بھٹہ، طاہر مہار، جسارت خیالی اور ناصر ملک کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

ٹریڈ یونین اور تنظیمی امور کے معاملے میں بھی اہل لیہ کسی سے پیچھے نہیں۔ مولا داد خان، پی آئی اے یونین کے نمایاں رہنما، ڈاکٹر اختر رشید ڈاکٹرز کی مرکزی یونین کے مرکزی رہنما، پروفیسر امیر ملک پروفیسرز یونین کے اہم رہنما، واحد بخش بھٹی پاکستان ریلوے میں مرکزی حیثیت کے رہنما مقصود فاروقی یو۔ بی۔ ایل یونین کے مرکزی رہنما، معروف قانون دان میاں عباس احمد پاکستان بار کونسل کے وائس چیئرمین، لیہ کے نوجوان وکیل جناب غلام مصطفیٰ جونی پنجاب بار کونسل کے ممبر اور اسی طرح ماضی میں منظور لاشاری جامعہ پنجاب کے مانے ہوئے طلبہ یونین کے رہنما رہے ہیں۔

تعلیم کے میدان میں لیہ کے طلباء و طالبات نے اپنے اپنے میدان میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ اس وقت ملک کی مختلف جامعات، میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا تعلق اس ضلع سے ہے۔ براڈ کاسٹنگ اور صحافت کی دنیا میں ملک عزیز اولکھ، خورشید ملک، پروفیسر گل عباس اعوان، وڈا خان عبدالحکیم شوق، نثار عادل، انجم صحرائی اور رؤف کلاسرہ معروف ہیں۔

سول اور ملٹری بیوروکریسی میں بھی یہاں کے لوگوں کا ایک خاص حصہ رہا ہے۔ حال ہی میں ترقی پانے والے جنرلز میں لیہ ہی کے محترم آب پروفیسر عزیز طارق خان، میجر جنرل کے عہدے پر پہنچ کر حیدرآباد میں GOC تعینات ہوئے ہیں۔ ان سے قبل مشکور احمد خان نامور سول بیوروکریٹ تھے۔ گویا یہ وہ شہر ہے جس نے انتہائی نامساعد حالات میں علمی، ادبی، تہذیبی اور معاشی مراکز سے بہت دور رہ کر اپنا الگ مقام بنایا اور اس مرتبہ پر پہنچا ہے کہ بقول شاعر

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے
آتا ہے جی میں کہ یہیں عمر بسر ہو

اس متنوع تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی پہلو رکھنے والے ضلع کی اک مربوط تاریخ کی اشد ضرورت تھی۔ اگرچہ اس ضلع کی تاریخ محترم نور محمد تھند اور پرنس خدا بخش ناصر (ناصر ملک) قلم

بند کر چکے ہیں۔ اور تواریخ بھی نہایت جانفشانی سے ترتیب دی گئی ہیں لیکن ان کتابوں میں تاریخ لیہ کے بعض پہلو ابھی تشنہ تھے اور کہیں کہیں بے جا طوالت سے کام لے کر ان کتب کی ضخامت کو خواہ مخواہ بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بعض جگہوں پر ماخذ کی نشاندہی سے بھی گریز کیا گیا ہے۔

اسی خلا کو پُر کرنے کیلئے کسی ایسے مرد قلندر کا انتظار تھا جو آگے بڑھے اور اس اہم علمی اور تاریخی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ اس سلسلہ میں ملک کے معروف سکالر، ادیب، شاعر اور محقق محترم ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا اور لیہ کے اہل دانش و بینش کو لیہ کی تاریخ مرتب کرنے کیلئے اکٹھا کیا۔ اس حوالے سے ۱۹۹۸ء میں راقم الحروف کی رہائش گاہ پر لیہ کے اہم لکھاریوں کو مدعو کیا گیا اور انھیں لیہ کی تاریخ کے مختلف موضوعات پر لکھنے کی درخواست کی گئی جسے انھوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا اور اس طرح بڑے قلیل عرصہ میں تاریخ کا مسودہ مرتب ہو گیا۔ لیکن نیازی صاحب کی مصروفیت کی وجہ سے اشاعت التواء میں رہی۔ اس بے جا تاخیر کے بعد اس برس اس کام کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کیلئے دوبارہ حوصلہ کیا گیا اور کتاب کے وہ پہلو جو ابھی تشنہ تھے، ان پر نظر ثانی کی گئی اور تاریخ لیہ ایک مربوط اور متوازن انداز میں تیار ہو گئی۔

اس ملک میں ایک المیہ یہ رہا ہے کہ یہاں پر ملک کے دور دراز علاقوں اور ان علاقوں میں بسنے والے لوگوں کی تاریخ پر کبھی نگاہ نہیں ڈالی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک ٹیم ورک کی صورت میں پورے ملک کی تاریخ اس طرح مرتب کی جاتی کہ بستی بستی، گاؤں گاؤں اور شہر شہر اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ تاریخ کے آئینے میں محفوظ ہو جاتے اور یہ کٹھن کام ریاست کا تھا۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ انگریز جس کا اس ملک کے ساتھ سوائے حکومت کرنے کے کوئی تعلق نہ تھا، اس نے بھی مختلف اضلاع کے گزیٹر مرتب کروا کے یہاں کی تاریخ کو محفوظ کرنے کی ابتدائی کاوشیں کیں، لیکن دھرتی سے محبت کے دعویداروں نے اس اہم فریضہ کی جانب معمولی سی بھی توجہ نہیں دی اور نتیجتاً یہاں کے لوگوں کی تاریخ دبیز پردوں میں دبتی ہی چلی گئی۔

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی دھرتی کا بیٹا ہے۔ انھوں نے اس خلا کو شدت سے محسوس کیا اور فرائض منصبی کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنی مدد آپ کے تحت مختلف اضلاع کی تاریخ

نقشہ ضلع لیہ

مرتب کرنے کی ذمہ داری لی اور اسے کما حقہٗ نبھایا۔ تاریخ چکوال، تاریخ میانوالی اور اب تاریخ لیہ قارئین کے سامنے ہے۔ تاریخ بھکر اور تاریخ بہاولپور پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ تاریخی سیریز بہت جلد تکمیل کے مراحل طے کرے گی۔

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی کا مختلف علاقوں کی تاریخ کو مرتب کرنا ایک اچھوتا اور انوکھا تصور ہے۔ اس باشعور سکالر نے اس نکتے کو بڑی باریکی سے سمجھا ہے کہ ایک فرد کے مقابلے میں زیادہ افراد کی ایک ہی موضوع پر ایک ہی وقت میں کاوشیں زیادہ گہرائی کی حامل ہوتی ہیں اور اگر ان افراد کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہو، جس کی تاریخ مرتب کرنا مقصود ہے تو کام زیادہ دقیع اور جامع انداز میں سامنے آتا ہے۔ اپنے اسی تصور کے پیش نظر انھوں نے کوشش کی کہ ایسے تمام سکالر جو علم و ادب، تاریخ اور سماجی علوم سے وابستہ ہیں ان کی خدمات حاصل کی جائیں اور انھیں اپنے اپنے ذوق کے مطابق موضوعات پر کام کرنے کی دعوت دی جائے، اس حوالے سے وہ خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس اندازِ تاریخ کا ایک منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ مختلف اندازِ نظر رکھنے والے لوگوں کے نقطہ ہائے نظر سامنے آنے کے باوجود فاضل مرتب نے کوشش کی ہے کہ تاریخی حقائق اور شواہد میں تضاد کی صورت پیدا نہ ہو، اس لیے ان کی مرتب کی گئی تواریخ بطور خاص تاریخ لیہ میں تحقیق کے بنیادی اصولوں کو ہر اعتبار سے پیش نظر رکھا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں نہایت احتیاط اور دانش مندی سے کتابیات مرتب کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی مُلک کے ایک ایسے سکالر ہیں جو علمی و ادبی، لسانی، تہذیبی، تاریخی اور سماجی شعور سے مالا مال ہیں۔ وہ تاریخ جیسے حساس موضوع کو نبھاتے ہوئے کسی ذاتی یا مالی منفعت کا شکار نہیں ہوتے اور نہ ہی بے بنیادی، لایعنی، فضول یا خواہ مخواہ کسی جانبداری سے کام لیتے ہیں اور وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ "تاریخ"، پر قلم اُٹھانا، نہ صرف حساس کام ہے بلکہ یہ ایک مقدس اور ذمہ دارانہ فریضہ بھی ہے۔ اسی لیے ان کی مرتب کی گئیں تواریخ تمام تعصبات اور جانبداریوں سے پاک ہوتی ہیں جس کے لیے وہ خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میرا لیہ مرے اسلاف کی عظمت کا امین

کتنی تابندہ درخشاں ہے زمینِ لیہ
جس کے ذرات میں شامل ہے مرے فن کا لہو
میرا لیہ ہے فقیہانِ ادب کا کعبہ
جس کے انگ انگ سے پھوٹا ہے مرا چشمۂ فکر
میرے لیہ کو تمدن کا خزینہ کہیے
جس کے ماحول کی نزہت سے پشیمان ہیں چمن
میرے لیہ کو ثقافت کا مدینہ کہیے
جس کی تہذیب ہری صبح تغزل کی کرن
جس کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے نسیمِ لیہ
جس کی مٹی میں دو نور چکاں ملتے ہیں
جس کو دیکھو وہی کردار کی عظمت کا امین
جس میں تاریخ کی عظمت کے نشاں ملتے ہیں
یہ نئے دور کے سقراط و ارسطو کی زمین
کتنی تابندہ درخشاں ہے زمین لیہ
یہ نئے وقت کے بقراط و فلاطوں کا نگر
علم و حکمت کی سحر پہلے یہیں سے پھوٹی

نابغہ اس کے یہاں درسِ خرد لیتے ہیں
پھر کہیں خطۂ یونان کی زمیں سے پھوٹی
اس کے ذروں سے اجالے بھی سند لیتے ہیں
میرے لیہ کو ثقافت کا مدینہ کہیے
کتنی تابندہ درخشاں ہے زمینِ لیہ
میرے لیہ کو تمدن کا خزینہ کہیے
میرا لیہ مرے اسلاف کی عظمت کا امین

نسیم لیہ

تھل

وہ تھل وہ ریگ زارِ شعلہ سامان میں ہے جس کا
بھڑک کر پھونک ''دینا'' یا جلانا ''کام'' ہے جس کا
وہ تھل گرمی سے جو بالکل جہنم زار ہوتا ہے
جہاں سایہ بھی سُورج کا علمبردار ہوتا ہے
وہ تھل لیہ سے جس کو ہر کوئی موسوم کرتا ہے
وہاں میرا جنوں آیات کو منظوم کرتا ہے
جہاں گرمی میں بھی اہلِ سخن کی سرد مہری ہے
جہاں کسب و ہُنر کی علم وفن کی سرد مہری ہے
جہاں بس ریت پر تعمیر ہوتے ہیں محل اکثر
جہاں مٹی میں مل جاتی ہے شاعر کی غزل اکثر
جہاں آندھی سے ہو جاتی ہیں گل افکار کی شمعیں
جہاں روشن کبھی ہوتی نہیں اشعار کی شمعیں
وہ تھل جس میں ادب کا نام لینا جرمِ سنگیں ہے
خرد کے میکدے سے جام لینا جرمِ سنگیں ہے
جہاں کانٹوں کے بستر پر قلم سوتا ہے شاعر کا
جہاں تضحیک کے خنجر سے خوں ہوتا ہے شاعر کا

جہاں شاعر ہے ایسے جس طرح ہو شعر بھرتی کا
سمجھتے ہیں جہاں فنکار کو اک بوجھ دھرتی کا
جہاں تشہیر کا باعث ہے ہاتھوں میں قلم لینا
جہاں اللہ کی قدرت ہے شاعر کا جنم لینا
اسی تھل میں کتابِ شعر لے کر میں اُتر آیا
مرے خونِ قلم سے وقت کا چہرہ نکھر آیا
میں آیا ہوں کہ لفظوں کو لباسِ شعر پہنا دوں
میں آیا ہوں کہ دل کے ساز سے محفل کو گرما دوں

نسیم لیہ

معارفِ لیہ

ناصر ملک

محل وقوع

لیہ کے شمال میں ضلع بھکر، مغرب میں دریائے سندھ اور اس کے پار ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور ضلع ڈیرہ غازیخان، جنوب میں ضلع مظفر گڑھ جبکہ مشرق میں ضلع جھنگ واقع ہیں۔ شرقاً غرباً 64 میل جبکہ شمالاً جنوباً 52 میل پھیلاؤ ہے۔ یہ سطح سمندر سے 500 فٹ کی بلندی پر اور 31-33 درجے طول بلد اور 71-52 عرض بلد پر واقع ہے۔

آبادی

1981ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع لیہ کی آبادی 6 لاکھ 64 ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس میں لیہ شہر کی آبادی 51564، چوک اعظم شہر کی آبادی 11250، فتح پور شہر کی آبادی 7835، کروڑ لعل عیسن شہر کی آبادی 11280 اور کوٹ سلطان کی کل آبادی 4900 نفوس پر مشتمل تھی۔ اسی مردم شماری کے مطابق شہری آبادی 13 فیصد جبکہ دیہاتی آبادی 87 فیصد تھی۔ 2001ء کے اعداد و شمار کے مطابق ضلع لیہ کی کل آبادی 1179564 نفوس پر مشتمل تھی جس میں تحصیل لیہ 623834، تحصیل کروڑ لعل عیسن 384168 جبکہ تحصیل چوبارہ 171562 افراد پر مشتمل تھی۔

آب و ہوا

یہاں گرمیوں میں سخت گرم، سردیوں میں سخت سرد اور خزاں اور بہار کے بھرپور موسم آتے

ہیں۔ تھل کی رات ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہے جبکہ دن میں لو اور آندھیاں چلتی ہیں۔ ساون بھادوں میں حبس جبکہ سردیوں میں دھند اور کورا پڑتا ہے۔ درجہ حرارت 5c سے 51c تک ریکارڈ کیا جاتا ہے۔

انتظامی تقسیم

لیہ کو دورِ قدیم سے ہی انتظامی اہمیت حاصل رہی ہے۔ لنگاہ دورِ حکومت میں اسے صوبہ کا درجہ دیا گیا اور کروڑ لعل عیسن کو اس صوبے کا دارالحکومت بنایا گیا۔ محمد خان سدوزئی نے منکیرہ کو دارالحکومت بنا دیا۔ 1849ء میں انگریز راج نے اِسے ڈویژن کا درجہ دیا۔ 1860ء میں یہ ڈسٹرکٹ بنا۔ 1861ء میں اسے تحصیل ہیڈکوارٹر بنا کر ڈیرہ اسماعیل خان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ 1901ء میں اسے میانوالی اور مابعد 1909ء میں ضلع مظفرگڑھ سے منسلک کر دیا گیا۔ 1982ء میں اسے ضلع کا درجہ دیتے ہوئے کروڑ لعل عیسن، چوبارہ اور لیہ تحصیل ہیڈکوارٹرز بنا دیے گئے۔ ضلع لیہ کی کل تین تحصیلیں ہیں۔ (ا) تحصیل لیہ جس میں 23 یونین کونسلیں ہیں، (۲) تحصیل کروڑ لعل عیسن جس میں 14 یونین کونسلیں جبکہ (۳) تحصیل چوبارہ جس میں 7 یونین کونسلیں ہیں۔

ضلع لیہ میں سات تھانے ہیں۔ تھانہ صدر لیہ، تھانہ سٹی لیہ جس کے زیرِ انتظام 87683 ایکڑ رقبہ، تین چوکیاں اور ایک ماڈل پوسٹ ہے۔ تھانہ کروڑ کے زیرِ انتظام 61000 ایکڑ پر مشتمل علاقہ دیا گیا ہے۔ تھانہ فتح پور کے زیر اہتمام 56635 ایکڑ رقبہ، تھانہ چوک اعظم کے زیر انتظام 46450 ایکڑ رقبہ، تھانہ چوبارہ کے زیر انتظام 694482 ایکڑ رقبہ جبکہ تھانہ کوٹ سلطان کے زیرِ انتظام 201433 ایکڑ رقبہ دیا گیا ہے۔

تفصیل رقبہ جات

ضلع لیہ کا کل رقبہ 6290 مربع کلومیٹر (1552668 ایکڑ) ہے۔ تحصیل وار رقبوں کی تفصیل یوں ہے:

تحصیل لیہ: 1722 مربع کلومیٹر	494657 ایکڑ
تحصیل کروڑ: 1824 مربع کلومیٹر	363509 ایکڑ
تحصیل چوبارہ: 2754 مربع کلومیٹر	694482 ایکڑ

قدرتی تقسیم کے لحاظ سے کچھی کا کل رقبہ 499181 ایکڑ، تھل جنڈی کا رقبہ 249958 ایکڑ جبکہ تھل کلاں کا رقبہ 803511 ایکڑوں پر مشتمل ہے۔ کل آبپاش رقبہ 614030، غیر آبپاش رقبہ 938618 ایکڑ ہے۔

اوقاف

آسا رام بھراتری سکول کی وقف شدہ املاک میں 162 کنال شہری رقبہ اور 3000 ایکڑ زرعی رقبہ شامل ہے۔ لیہ شہر میں 315 دکانیں، مندر گاڑھولال کا وقف شدہ رقبہ 121 ایکڑ، نواں کوٹ دھرم سال 1 کنال پر مشتمل عمارت، کوٹ سلطان میں عیدگاہ کے علاوہ بہت سی املاک ضلع لیہ وقف شدہ ہیں۔

دریائے سندھ

دریائے سندھ موضع بیٹ بخشند چاہ باغ والا ضلع بھکر سے لیہ میں داخل ہوتا ہے۔ دریا کی مغربی سمت ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازیخان واقع ہیں جبکہ مشرقی جانب ضلع لیہ کا علاقہ ہے۔ ضلع لیہ میں اس کی لمبائی 75 کلومیٹر ہے اور اس کا پاٹ 15 سے 22 کلومیٹر تک چوڑا ہے۔ ضلع لیہ میں یہ چار نالوں کی صورت میں بہتا ہے۔ لیہ کی جانب بہنے والے نالے کو ''لالہ'' کہا جاتا ہے۔

نہریں

ضلع لیہ میں سب سے پہلی نہر دیوان ساون مل کے بیٹے کرم نرائن چند نے 1830-40ء میں بنوائی۔ یہ ہزاری مل نہر تھی۔ دوسری نہر کا نام اس نے لکھی مل رکھا تھا۔ 1884ء میں انگریز دورِ حکومت میں دریائے سندھ سے کوٹ سلطان (ڈھولن والا) کے قریب نہر نکالی گئی تھی۔ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے قیام کے بعد کھودی گئی نہر تھل کینال کی دو برانچوں منڈا کینال اور انڈس کینال اور ان سے نکلنے والی نہریں شاہ پور، بھاگل، لیہ، محبوب، عنایت، حیات، ماچھو، لنڈی، داد اور کئی مائنرز لیہ کے علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔

تجارت

ضلع لیہ میں تجارتی لحاظ سے تین شہر اہم ہیں۔ (ا) لیہ (۲) چوک اعظم (۳) فتح پور۔ چوک

اعظم میں علاقے کی سب سے بڑی منڈی مویشیاں منعقد ہوتی ہے۔ کوٹ سلطان، لیہ، فتح پور، چوک اعظم، دھوری، کروڑلعل عیسن میں اجناس کی بڑی منڈیاں موجود ہیں۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر شہر میں سبزیوں کی منڈیاں منعقد ہوتی ہیں۔ دو بڑی شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہونے کی بدولت چوک اعظم کو کاروباری/تجارتی لحاظ سے ضلع بھر میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ضلع کونسل لیہ

ضلع کونسل کا قیام 1982ء میں عمل میں لایا گیا۔ پہلی 13 رکنی کونسل کے چیئرمین غلام فرید میرانی اور وائس چیئرمین چوہدری جلال الدین کھکھ منتخب ہوئے۔ 1983ء کے انتخابات کے نتیجے میں 18 رکنی کونسل میں چوہدری محمد حنیف چیئرمین جبکہ غلام فرید میرانی وائس چیئرمین تھے۔ 1987ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی 32 رکنی کونسل سے صاحبزادہ فیض الحسن سواگ بہ طور چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1991ء چوہدری محمد افضل بہ طور چیئرمین منتخب ہوئے۔ 2000-01ء کے نئے بلدیاتی نظام کے تحت سردار شہاب الدین سیہڑ ناظم اور مہر فضل حسین سمرا نائب ناظم منتخب ہوئے۔ دوسرے دورانیے کے لئے ملک غلام حیدر تھند ناظم ضلع منتخب ہوئے۔

متفرق معلومات

۱۔ ضلع لیہ میں ریلوے لائن کی کل لمبائی 80 کلومیٹر ہے۔

۲۔ ضلع لیہ میں لیہ، کروڑ، سامٹیہ، راجن شاہ، شاہ پور دوربٹہ، کوٹلہ حاجی شاہ، جمن شاہ، کوٹ سلطان اور پہاڑ پور میں ریلوے اسٹیشن موجود ہیں۔

۳۔ ضلع لیہ سے مہر ایکسپریس (راولپنڈی تا ملتان)، خوشحال ایکسپریس (کراچی تا پشاور)، تھل ایکسپریس (ملتان تا راولپنڈی) اور پسنجر (ملتان تا ماڑی انڈس) گزرتی ہیں۔

۴۔ ضلع لیہ سے شائع ہونے والا پہلا اخبار "جانباز" ہے جو 1957ء میں ایم آر روحانی کی زیرادارت شائع ہوا۔

۵۔ ضلع لیہ میں پانچ صوبائی انتخابی حلقے ہیں۔ لیہ ا PP262۔ لیہ ۲ PP263۔ لیہ ۳ PP264۔ لیہ ۴ PP 265 اور لیہ ۵ PP266۔ دو قومی انتخابی حلقے ہیں۔ لیہ ا NA 181 اور لیہ ۲ NA 182۔

۶۔ کماد، چنا، گندم، کپاس ضلع لیہ کی اہم فصلیں ہیں۔

۷۔ ضلع لیہ کی تاریخ کے موضوع پر تین کتب شائع ہوئی ہیں۔ (ا) تاریخِ لیہ از مہر نور محمد تھند (۲) انسائیکلوپیڈیا آف لیہ از پرنس خدا بخش ناصر (ناصر ملک) اور (۳) لیہ دی تاریخ (مسعود کھدر پوش ایوارڈ یافتہ) از ناصر ملک۔

۹۔ ضلع لیہ کی سب سے بڑی درس گاہ "گورنمنٹ کالج لیہ" ہے۔

۱۰۔ ضلع لیہ کی سب سے پرانی رجسٹرڈ این جی او "یونین ویلفیئر سوسائٹی لیہ" ہے جس کی رجسٹریشن 1965ء میں ہوئی۔

۱۱۔ ضلع لیہ کی سب سے بڑی انڈسٹری لیہ شوگر ملز کا افتتاح بیگم وقارالنسا نون نے 31 مارچ 1955ء کو کیا۔

مدارس و مکاتب

ضلع لیہ میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے درس و تدریس کے سلسلے میں مدارس و مکاتب کھول رکھے ہیں جہاں طالب علموں کو دینی علوم سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ہر مدرسہ سالانہ اجتماع کا انعقاد کرتا ہے اور اس موقع پر فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کو اسناد و اعزازات سے نوازتا ہے۔ چند اہم مدارس کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے:

1- دارالعلوم فاروقیہ، لیہ
2- امام خانہ جعفریہ، لیہ
3- اشرف المدارس، لیہ
4- امام خانہ حسینیہ، لیہ
5- مدنیۃ العلوم، لیہ
6- جامعہ القائم، لیہ
7- مدرسہ قاسم العلوم، لیہ
8- مدرسہ غوثیہ فاروقیہ۔ چوک اعظم
9- مدرستہ البنات غوثیہ۔ چوک اعظم
10- مدرسہ تجوید القرآن، لیہ
11- مدرسہ جامعہ نعمانیہ رضویہ، لیہ

ان کے علاوہ کروڑلعل عیسن، فتح پور، کوٹ سلطان، پہاڑ پور، لدھانہ، دھوری اڈہ اور چوبارہ میں بھی عظیم الشان مدارس قائم ہیں جو تشنگانِ علم کی روحانی سیرابی بہ عمدگی سرانجام دے رہے ہیں۔

ضلع لیہ کی سیاست

ضلع لیہ کی سیاست دوسرے علاقوں کی طرح چند خاندانوں کے گرد گھومتی ہے۔ یہاں سیاسی بساط پر سیہڑ، جکھڑ، اولکھ، گجر اور سواگ خانوادے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ قیام پاکستان کے عہد میں سید نذر حسین شاہ بخاری نڈر لیڈر تھے۔ان کے ساتھ فیض اللہ خان بھٹی نے سیاسی اشتراک کیا۔ یونینیسٹ پارٹی کی طرف سے ملک قادر بخش جکھڑ سیاسی افق پر جلوہ افروز تھے جبکہ مسلم لیگ کے سردار غلام جیلانی گرمانی کی معاونت فضل خان سیہڑ اور چینو شاہ نے کی۔

ملک قادر بخش جکھڑ وزیر زراعت, MLA اور MNA منتخب ہوئے۔ عبداللہ جوتہ (پیر بارو شریف) مہر منظور حسین سمرا، پیر محمد سید شاہ، سردار بہرام خان سیہڑ، سردار جہانگیر خان سیہڑ، چوہدری رحمت علی علوی، ملک غلام حیدر تھند، ملک نیاز احمد جکھڑ، چوہدری اصغر علی گجر، ملک احمد علی اولکھ، سردار لعل خان مگسی، سردار قیصر عباس مگسی، شہاب الدین خان سیہڑ، مہر اللہ ڈیوایا تھند، چوہدری الطاف حسین، چوہدری افضل گجر، غلام فرید خان میرانی، سید خورشید شاہ بخاری، سید ثقلین بخاری، مہر اعجاز احمد اچلانہ، چوہدری جلال الدین ککھ، صاحبزادہ فیض الحسن، ملک غلام محمد سواگ، چوہدری محمد حنیف، ملک اللہ بخش سامٹیہ، عابد انوار علوی، سردار حسنین خان مگسی، رائے صفدر عباس بھٹی، پیر فیض الٰہی شاہ، چوہدری نور احمد، مہر فضل حسین سمرا، ملک عمر علی اولکھ، سید غلام حسین شاہ، افتخار بابر خان کھتران، مہر حبیب اللہ گرواں، سردار بہادر خان سیہڑ، سردار محی الدین سیہڑ، راجہ فیاض سکھیرا، چوہدری بشارت رندھاوا، سردار افتخار خان سیہڑ، پیر فقیر حسین شاہ، سردار سجاد سیہڑ اور ملک مشتاق سامٹیہ ضلع لیہ کی سرگرم سیاسی شخصیات ہیں۔ان میں سے بیشتر قومی، صوبائی اور ضلعی اسمبلیوں کے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔

تاریخی پسِ منظر اور قبائل

تاریخِ لیّہ

پروفیسر مقبول الٰہی

لیّہ کی کوئی قدیم تاریخ نہیں

لیّہ کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ آریان (Arrian) کے مطابق سکندرِ اعظم تقریباً 327 قبل مسیح میں جہلم سے نیچے کی طرف دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ اس کے سنگم کی طرف آبی سفر پر روانہ ہوا، جبکہ اس کی برّی فوجیں دو جتھوں کی شکل میں دریا کے دونوں طرف روانہ ہوئیں۔ ہوسکتا ہے قراطیروس (Craterus) جو دائیں کنارے پر تھا، موجودہ ضلع لیہ کے کچھ حصّوں میں کناروں کے ساتھ ساتھ چلا ہو اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ جہاں تک اس علاقہ کا تعلق ہے اس دور میں اس کے اندر دریاؤں کا راستہ ہی قیاس آرائی کا موضوع ہے۔

ضلع سب سے پہلے سکھوں کے ماتحت متحد ہوا

ضلع مظفر گڑھ کی مجموعی طور پر کوئی مکمل تاریخ نہیں تھی۔ یہاں تک کہ یہ ملتان کے گورنر دیوان ساون مَل کے ماتحت، سکھوں کے زیرِ حکومت متحد ہوا۔ تاہم یہاں ہمسایہ حکومتوں کی تاریخ کا ذکر برمحل ہے کیونکہ صرف اسی تاریخ سے ہی ان قبائل، جو اب اس ضلع میں آباد ہیں، کی اصل تاریخ اس تواتر سے جس سے انہوں نے اس پر تسلط قائم کیا، معلوم ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اہم عصر تاریخ ممکنہ اختصار کے ساتھ دی جائے گی۔

ہندو حکمران خاندان

شروع سے ہی اس ضلع نے سلطنت سندھ کے مقدر کی پیروی کی۔ یہاں کی جاٹ آبادی

پر، جو کھشتری یا راجپوت نسل کی ایک شاخ ہیں اور کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر جماعت سے خارج کر دیئے گئے، ہندوؤں کے رائے اور برہمن خاندانوں نے حکومت کی۔ یہ راجپوت جو یہاں کے قدیم باشندے کہے جاسکتے ہیں، جاٹوں کے آباؤاجداد ہیں۔ وہ جاٹ جو آبادی کے تقریباً دو تہائی حصے پر مشتمل ہیں اور باقی تمام قبائل بعد کی آمد ہیں۔

عرب فاتحین، سومرا اور سُوما

ابتدائی عرب فاتحین سندھ اور ملتان پر ۷۱۱ء سے لے کر ۷۵۰ء تک قابض رہے۔ جبکہ انہیں ایک راجپوت قبیلے جنہیں ''سومرا'' کہا جاتا ہے اور جس کے جانشین ابھی تک اس ضلع میں پائے جاتے ہیں، نے یہاں سے نکال دیا۔ ۱۳۵۱ء میں سومروں کو ایک اور راجپوت قبیلے سُماؤں، جن کے اخلاف کا کھوج علی پور تحصیل کے اُنڑوں میں ملتا ہے، نے یہاں سے نکال دیا، تمام سُما حکمران جام کے لقب کے حامل تھے۔ آج تک بھی یہ لقب ان مسلمانوں کے ہاں جو سندھی الاصل ہیں ایک عزت کے لقب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ انہی راجپوت قبائل کے سندھ اور ملتان پر حکومت کے عہد میں ہی ہندوستان سے راجپوتوں کی نقل مکانی واقع ہوئی۔ اس ضلع میں ایسے قبائل جیسا کہ سیال ''گورایے''، بھٹی اور چھجڑے کی موجودگی اسی امر کی مرہون منت ہیں۔

ملتان کا لنگاہ خاندان

اس ضلع کی تاریخ پر اثر انداز ہونے والا دوسرا واقعہ ملتان میں لنگاہ خاندان کی حکمرانی ہے۔ اس نے ۱۴۴۵ء سے ۱۵۲۶ء تک حکومت کی۔ ابھی تک ضلع میں لنگاہ موجود ہیں اور لنگاہ حکومت کے دوران ہی اُس جگہ پر جو اب علی پور تحصیل ہے، نہروں کے ہاتھوں سیت پور کی خود مختار ریاست قائم ہوئی۔ اسی خاندان کی حکومت کے دوران ہی بلوچ سب سے پہلے کوہ سلیمان سے نکلے اور انہوں نے دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے علاقے پر قبضہ کیا۔

چار حکومتوں میں ضلع کی تقسیم

سیت پور کی خود مختار سلطنت کا قیام ضلع کی مربوط تاریخ کا نقطہ آغاز تھا۔ اب سے بعد ضلع میں چار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ جنوبی گوشے میں سیت پور کی حکومت تھی جو پہلے نہروں کے قبضے

میں، پھر سیت پور کے مخدوموں کے قبضے میں اور بعد ازاں بہاولپور کے نوابوں کے قبضے میں آئی۔ ڈیرہ غازی خان کے بالمقابل ضلع کے مغربی وسطی حصے پر ڈیرہ غازی خان کے حکمرانوں کی حکومت تھی۔ پہلے میرانی بلوچوں کی، پھر گُجروں اور کلہوڑوں کی، پھر مختلف گورنروں کی جو کابل کے درانی بادشاہوں کی طرف سے براہ راست مقرر ہوتے تھے اور آخر میں بہاولپور کے نوابوں کی۔ چناب کے دائیں کنارے پر واقع ملتان کے بالمقابل ضلع کے مشرقی وسطی حصے پر ملتان کے گورنروں کی برائے نام حکومت تھی۔ ضلع کے شمالی حصے بشمول تھل، ایک طوائف الملوکی کے مرحلے سے گزرنے کے بعد منکیرہ کے گورنروں کے محکوم بن گئے۔ جنہیں مقامی طور پر تھل کے نواب کہا جاتا تھا۔

سیت پور میں پہلی حکومت، نہر، بلوچ اور مخدوم

وہ خاندان جس نے سیت پور کی سلطنت کی بنیاد رکھی نہر تھا۔ ۱۴۵۵ء (۸۵۴ھ) میں جب بہلول خاں لودھی، جو ملتان کا گورنر رہا تھا، دہلی کا بادشاہ بنا، تو اس نے (سندھ کا) وہ علاقہ جو اس وقت چناب سے اُچ کے مقام پر ملتا تھا اور سلسلہ کوہ سلیمان کے درمیان واقع تھا، جو ہرند اور اُچ کے درمیانی خط کے جنوب کی طرف اور سندھ میں شکار پور کے شمال کی طرف اپنے رشتہ دار اسلام خان لودھی کو عطا کر دیا۔ یہ قطعہ اس علاقے پر مشتمل تھا جو اب ضلع کی علی پور تحصیل کا جنوبی حصہ، ضلع ڈیرہ غازی کا جنوبی حصہ اور سندھ کا شمالی حصہ بنتا ہے۔ اسلام خاں یا اس کے اخلاف نے نہر کا لقب اختیار کیا۔ اسلام خاں کے پوتوں نے آپس میں جھگڑا کیا اور علاقے کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا۔ موجودہ تحصیل علی پور کے جنوبی حصے جس کا سب سے بڑا شہر اس وقت سیت پور تھا، طاہر خان کے حصے میں آئے۔ اس نے اپنا سکہ وہاں پر قائم کیا اور مر گیا۔ نہر خاندان کی ستائیس نسلیں تھیں۔ نہروں کا آخری فرد بخش خان تھا جو علی پور تحصیل میں چپڑاسیوں کا جمعدار تھا اور جو حکومت سے خاندان کے مزارات کی دیکھ بھال کے صلہ میں ایک معمولی سا وظیفہ حاصل کرتا تھا، اس کے بعد اس ذمہ داری کی حامل بیوہ خواتین تھیں۔ ایک نہر نے اپنی زندگی میں ہی ایک عمدہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو ابھی تک موجود ہے، اس کا نام طاہر خان تھا۔ جو سخی یا دریا دل، کہلاتا تھا۔ ایک دوسرے شخص نے جس کا نام علی خان تھا، علی پور کی بنیاد رکھی۔ نہروں کی کوئی دوسری یادگار باقی نہیں ہے۔

پندرھویں صدی کے آخر پر بلوچوں نے پہاڑوں سے نکلنا شروع کر دیا اور انہوں نے دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر سیت پور سے لے کر تحصیل لیہ میں کوٹ کروڑ تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۴۸۴ء (۸۸۷ھ) میں ایک میرانی بلوچ حاجی خان نے ڈیرہ غازی خان کی اور ایک خاندان کی بنیاد رکھی، جس کے حکمران باری باری حاجی خان اور غازی خان کے لقب اختیار کرتے تھے۔ ان سرداروں نے ضلع ڈیرہ غازی خان کے جنوب سے نہروں کو نکال دیا اور سیت پور کے نہروں پر بہت سخت دباؤ ڈالا۔ سازش نہروں کے اپنے دروازے پر ہی مصروف عمل تھی۔ شیخ راجو، جو سیت پور کا مخدوم تھا اور نہروں کی کونسل کا رکن تھا، نے اپنے اقتدار کے لئے علاقے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے نہروں کو بالکل خارج نہیں کیا کیونکہ جب اپنی باری آنے پر بہاولپور کے نوابوں نے اس کا تختہ الٹ دیا تو علاقے کے کچھ حصے ابھی تک نہروں کے قبضے میں تھے تاہم ضلع کے جنوب میں بہت بڑے حصے پر سیت پور کے مخدوموں کی حکومت تھی بہاولپور کی یورشوں کے شروع ہونے تک نہروں یا مخدوموں کی حکومت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ نہر کچھ لاپرواقسم کے حکمران تھے۔ اُنہوں نے اپنے پیچھے طاہر خان کے مقبرے کے علاوہ کوئی تعمیرات عامہ کا کام نہیں چھوڑا۔ اس بارش سے محروم اور سیلابی علاقے میں ایک اچھے حکمران کا معیار یہ ہے کہ اسے نہریں اور حفاظتی پشتے تعمیر کرنے چاہئیں تھے۔ نہروں کا لقب انہیں ان کی غارت گری کی وجہ سے دیا گیا، زبان زدعام کہانیاں ان کی عقل کی کمی کی شہادت دیتی ہیں۔ ایک سردیوں کی رات کو گیدڑ سیت پور کے اردگرد غرّا رہے تھے۔ طاہر خان دریادل نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ وہ کیوں غرّا رہے ہیں۔ وزیر نے جواب دیا کہ سردی کی وجہ سے نہر نے ان کے لئے کپڑے تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ اگلی رات کو گیدڑ دوبارہ غرّانے لگے اور نہر نے وزیر سے پوچھا کہ وہ کس لئے غرّا رہے ہیں۔ وزیر نے جواب دیا وہ آپ کی سخاوت کی وجہ سے آپ کے لئے دعائیں کر رہے ہیں۔ ان کے برعکس سیت پور کے مخدوم اچھے حکمران تھے۔ اُنہوں نے نہریں کھدوائیں۔ زراعت کو ترقی دی اور ان میں سے ایک نے ضلع ڈیرہ غازی خان میں راجن پور کے قصبے کی بنیاد رکھی۔

بہاولپور کے نواب سیت پور پر قبضہ کر لیتے ہیں

سیت پور کی تقسیم شدہ اور کمزور ریاست نے پہلی مرتبہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں

بہاولپور کے نوابوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا۔ اُنہوں نے اس ضلع کے ایک حصے پر ایک سو سال تک حکومت کی اور یہاں پر اپنے عوامی کاموں اور ایک منظم مالیاتی نظم ونسق متعارف کرانے سے اپنا ایک نقش چھوڑا۔ بہاولپور کی ریاست کا بانی شکار پور سندھ کے ایک ممتاز شہری ملا مبارک خان کا بیٹا صادق محمد خان تھا۔ نواب صادق محمد خان کو سندھ کے کلہوڑا گورنروں میں پہلے گورنر نور محمد کلہوڑا کی دشمنی کی بنا پر (جس کی وجہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہے) بھاگنا پڑا۔ صادق محمد خان نے ۱۷۲۷ء (۱۱۴۰ھ) میں شکار پور کو چھوڑا اور اپنے پیروکاروں کے ایک گروہ کے ساتھ ضلع مظفر گڑھ میں سے ہوتا ہوا لیہ تحصیل کی سرحد بیٹ دبکی پہنچا۔ سندھ کی افواج نے میر شاہ داد خان کی زیر قیادت اس کا قریبی تعاقب کیا۔ ایک جھڑپ ہوئی جس میں سندھیوں کو شکست ہوئی۔ پھر صادق محمد خان نے اُچ کے مخدوموں کے ہاں پناہ لی۔ جنہوں نے اُسے اپنی سفارشات کے ساتھ گورنر ملتان حیات اللہ خان کے ہاں بھیج دیا۔ حیات اللہ خان نے اسے ستلج کے جنوب میں چوہدری کا ضلع جاگیر میں دے دیا۔ صادق محمد خان نے اپنے آپ کو کاشتکاری کے توسیع کنندہ اور لٹیروں کو دبانے والے کے طور پر نمایاں کر لیا۔ ۱۷۳۹ء (۱۱۵۲ھ) میں صادق محمد خان نے نادر شاہ کی طرف سے نواب کا خطاب حاصل کیا اور نادر شاہ کے حملے کے بعد پیدا ہونے والی طوائف الملوکی میں وہ اس علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کی حدود، شمال میں ستلج، مشرق میں بیکانیر تک جنوب میں صوبہ سندھ تک اور مغرب میں دریائے سندھ تک تھیں۔ صادق محمد خان کا جانشین اس کا بیٹا بہاول خان بنا جس نے بہاولپور شہر کی بنیاد رکھی اور جسے بہاول خان اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے جانشین مبارک خان کے عہد میں ہی بہاولپور کے نوابوں نے اپنے آپ کو مستقل طور پر اس ضلع میں مستحکم کیا۔ ۱۷۵۱ء (۱۱۶۴ھ) میں مبارک خان نے نہروں سے ٹڈوالا جو کہ اب چناب کے دائیں کنارے پر شہر سلطان اور علی پور کے درمیان ستلج اور چناب کے سنگم کے عین اس پار ایک بڑا سا گاؤں ہے چھین لیا اور اسی سال اس نے بیٹ ڈوما جو کہ سیت پور کے جنوب میں ایک گاؤں اور ایک قطعہ زمین ہے، سیت پور کے مخدوم شیخ راجو سے چھین لیا۔ بہاول خان ثانی دوسرا نواب تھا۔ ۱۷۸۱ء (۱۱۹۴ھ) میں اس نے جتوئی کا پرگنہ سیت پور کے مخدوم شیخ راجو سے لے لیا۔ ہندوستانی تاریخیں یہ کہتی ہیں کہ اس نے یہ مستاجری پر لیا تھا۔ لیکن یہ بات بمشکل قابل یقین ہے۔ نواب انتہائی طاقتور تھا اور مخدوم دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتے جا

رہے تھے۔ نواب نے پہلے ہی مخدوموں کے علاقے کا ایک حصہ بزور لے لیا تھا اور باقی ماندہ بھی وہ تھوڑے عرصے بعد لینے والا تھا۔ یہ تقریباً ۱۷۹۰ء کے لگ بھگ تھا کہ دریائے سندھ نے اپنے پُرانے راستے کو چھوڑ دیا جو اُچ کے قریب چناب سے ملتا تھا اور وہ پاٹ اختیار کرلیا جس پر یہ اب بہتا ہے۔ اس طرح اس ضلع کا جنوبی حصہ بہاولپور کے حملوں کے لئے کھلا تھا اور نواب نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے علی پور، شہر سلطان، سیت پور اور خیر پور بغیر کسی مزاحمت کے لے لئے۔ غرضیکہ علی پور تحصیل کا بقیہ حصہ نہروں اور سیت پور کے مخدوموں سے لے لیا۔ اس نے مظفر گڑھ تحصیل کا پورا مغربی اور جنوبی حصہ ڈیرہ غازی خان کے حکمرانوں سے لینے کے لئے بھی کاروائی کی۔ فی الحال علی پور تحصیل کو اس کے قبضے میں چھوڑ کر باقی ماندہ حکومتوں کا جو اس ضلع میں قائم تھیں حال بیان کیا جاسکتا ہے۔

دوسری حکومت ڈیرہ غازی خان

یہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ پندرھویں صدی کے اختتام پر بلوچوں نے دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر قبضہ کرلیا اور یہ کہ ۱۴۸۴ء میں حاجی خان نے ڈیرہ غازی خان کی بنیاد رکھی۔ اس کا بیٹا غازی خان تھا اور ۱۷۶۹ء (۱۱۸۳ھ) تک حاجی خان اور غازی خان باری باری سے حکومت کرتے رہے۔ جہاں تک اس ضلع کا تعلق ہے وہ اچھے حکمران تھے۔ اُنہوں نے زراعت کی حوصلہ افزائی کی اور نہریں کھودیں، ان میں سے ایک نے جسے غازی خان کہا جاتا تھا۔ دریائے سندھ پر کینجھر قصبے کی بنیاد رکھی۔ محمود گجر یوسف نامی شخص کا بیٹا تھا۔ وہ آخری غازی خان کا وزیر بن گیا اور حکومت کو سازشیوں کے ہاتھوں سے بچانے کے بہانے سندھ کے گورنر غلام شاہ کلہوڑا کو دعوت دی، جس نے ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کرلیا۔ غازی خان کو گرفتار کرلیا اور اسے قیدی بنا کر سندھ لے گیا جہاں وہ مرگیا۔ غلام شاہ نے محمود خان گجر کو اپنے پیچھے ڈیرہ غازی خان کا گورنر بنا دیا۔ اُسے خراسان کے بادشاہوں نے برقرار رکھا اور اس نے ان کی طرف سے نوابی اور جان نصر خان کا لقب حاصل کئے۔ محمود خان گجر نے ۳۰ سال تک حکومت کی اور اس کا جانشین اس کا بھتیجا برخوردار بنا۔ جس کی جگہ خراسان سے براہِ راست مقرر کئے جانے والے گورنروں نے لی۔ محمود خان گجر کی اس ضلع میں ایک اچھے حکمران کی شہرت ہے۔ اس نے بہت سی زمین خریدی جو آج تک حکومت کی ملکیت ہے۔ اس نے محمود کوٹ کے قلعے کی تعمیر کی۔ اس ضلع میں شیعہ مسلمانوں کی تاریخ

کا آغاز محمود خان گجر کی وجہ سے ہونے والے کلہوڑا حملے سے ہوا ہے۔ گجروں کے بعد بہت سے گورنر براہ راست خراسان سے بھیجے گئے۔ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر طوائف الملوکی پھیل گئی۔ جس نے اس علاقے کو ۱۷۹۱ء میں بہاول خان دوم کے حملے کے لئے تیار کیا۔ یہاں مظفر گڑھ کے ڈیرہ غازی خان والے حصے کو اسی جگہ چھوڑا جاتا ہے جہاں سیت پور کو چھوڑا گیا تھا اور ضلع کے اس حصے کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ جو ملتان کے زیر نگین تھا۔ تاہم چوتھی حکومت کو زیر بحث لاتے ہوئے بلوچوں کی تاریخ کی طرف دوبارہ رجوع کیا جائے گا۔

تیسری حکومت ملتان

لنگاہ جن کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ ۱۵۲۹ء میں افغانوں کی طرف سے جو برائے نام بابر کی طرف سے نیابت کررہے تھے نکال دیئے گئے اور اکبر کے دور حکومت میں ملتان کو ایک صوبے کے طور پر دہلی حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ ملتان کی ذیلی قسمتوں میں سے آئین اکبری میں جن دو کا ذکر ہے وہ صرف رنگ پور اور سیت پور ہیں اگرچہ عام تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ضلع کبھی دہلی کے ماتحت رہا ہوگا اور کبھی خراسان کے، ان دونوں بادشاہتوں میں سے کسی کا اس کی اندرونی تاریخ پر کوئی اثر نہیں تھا اور مقامی سرداروں نے اپنی عوامی ترقیاں اور اپنی چھوٹی چھوٹی جنگیں مرکزوں کی کسی مداخلت کے بغیر جاری رکھیں۔ وقتاً فوقتاً دونوں مخالف حریفوں میں سے کوئی ایک دہلی یا کابل کی طرف سے فرمان بخشش حاصل کرکے اپنے مقصد کو تقویت دینے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن پیروکاروں کا مضبوط ہاتھ کسی سند یا فرمان سے زیادہ بہتر سہارا ثابت ہوتا تھا۔ کسی ایسے سردار کے عروج کو بیان کرنے کے ضمن میں جو ایک مستحکم حکومت کے موجود ہونے کی صورت میں پھانسی چڑھ جاتا۔ مقامی مورخوں کا ایک پسندیدہ قول یہ ہے:

اُدھر دلّی کی سلطنت میں فتور
ادھر شاہانِ کابل کی نظروں دُور

لہٰذا یہ بہتر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو برائے نام مرکزی حکومت پر توجہ دینے سے گریز کیا جائے اور اس کی غیر متعلق تاریخ کو صرف اس حد تک جس حد تک اس کا اس ضلع پر اثر ہے بیان کیا جائے۔ اس اصول کی بنا پر ملتان کی تاریخ کا اس ضلع کی تاریخ سے گاہوں کے وقت سے لے کر

ملتانی پٹھانوں کے وقت تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سدوزئی افغانوں کا ایک خاندان تھا اور اس خاندان کی ایک شاخ تھی جس سے کابل کے بادشاہ احمد شاہ، تیمور شاہ، زمان شاہ اور شاہ شجاع تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کا پہلا شخص جو ہندوستان میں آیا حسین خان تھا۔ جس نے اورنگ زیب کے وقت میں، اس ضلع میں رنگ پور کو بطور جاگیر رکھا۔ زاہد خان اس خاندان کا پہلا شخص تھا جو ملتان کا نواب بنا۔ یہ ۱۷۳۸ء کی بات ہے، زاہد خان اور اس کے بیٹے شجاع خان کی تخت نشینی کے درمیانی عرصے میں محض طوائف الملوکی پھیلی رہی، شجاع خان کو ملتان کی حکومت ۱۷۶۷ء میں سونپی گئی۔ اس نے خان گڑھ کے بالمقابل ضلع ملتان میں شجاع آباد کی بنیاد رکھی۔ اس کے وقت میں بھنگی سکھوں نے ملک کو تاراج کیا اور شجاع خان کو شجاع آباد دھکیلتے ہوئے ملتان پر قبضہ کر لیا۔ آج تک بھنگی سکھوں کے حملے اور ان کے مظالم دریائے چناب کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ رہنے والے کسانوں کے دلوں میں زندہ ہیں، شجاع خان کا جانشین اس کا بیٹا مظفر خان ہوا۔ جو ملتان کو ۱۷۷۹ء تک واپس نہ لے سکا۔ جب وہ کابل کے بادشاہ تیمور شاہ جس نے سکھوں کو نکال دیا اور مظفر خان کو نواب کے خطاب کے ساتھ بطور گورنر مقرر کیا، کے ہاتھوں بحال ہو گیا۔ مظفر خان نے ۱۸۱۸ء تک ملتان پر حکومت کی جب اس کا محاصرہ کر لیا گیا اور یہ سکھوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور نواب اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ قتل ہو گیا۔ مظفر خان کا عہد ایک مسلسل جنگ کا عہد تھا۔ اس کا تعلق اس ضلع سے محض ایک سرکاری گورنر کا تھا اور یہ چیز حیرت انگیز ہے کہ اس نے چناب کے دائیں کنارے کے علاقے میں اس قدر ترقیوں کے لئے وقت پا لیا، اس ضلع میں واقع علاقوں میں جو ملتان سے منسلک تھے، رنگ پور، مراد آباد، مظفر گڑھ، خان گڑھ اور غضنفر گڑھ کے تعلقے شامل تھے۔ مظفر خان نے نہریں کھدوائیں پشتے بنوائے اور کاشتکاری کو وسعت دی۔ اس نے اس حصے میں اپنے قبیلے کے بہت سے افراد کو مستحکم کیا، جو ایک یادگار حقیقت رہے گی، جب بھی ملتانی پٹھانوں کے عہد کا حوالہ دیا جائے گا۔ ۱۷۹۴ء میں اس نے مظفر گڑھ کے قلعے اور شہر کی بنیاد رکھی۔ اس کی بہن خان بی بی نے خان گڑھ کے قلعے اور قصبے کی جبکہ اس کے بھائی غضنفر خان نے غضنفر گڑھ کے شہر اور قلعہ کی بنیاد رکھی۔

چوتھی حکومت تھل نواب

چوتھی حکومت اس علاقے پر مشتمل تھی جو اب بڑی حد تک کوٹ ادو تحصیل اور لیہ ضلع ہے۔

اِس علاقے کی تاریخ بھکر، ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کی تاریخ سے وابستہ ہے اور علیحدہ تذکرہ کی متقاضی ہے۔

لیہ تحصیل ۱۷۳۹ء تک مغل سلطنت کا حصہ رہی

لیہ تحصیل ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ کے حملے تک جب کہ اس علاقے کو عام طور پر تاراج کیا گیا، مغل سلطنت کا حصہ رہی۔ ۱۷۳۹ء میں دریائے سندھ کا مغربی علاقہ شہنشاہ کی طرف سے نادر شاہ کو دے دیا گیا اور اس کی وفات کے بعد احمد شاہ ابدالی کو منتقل ہو گیا۔ احمد شاہ کی افواج نے اس ضلع میں سے متعدد بار مارچ کیا، جس میں دریائے سندھ سے ادھر کا علاقہ، باقی پنجاب کے ساتھ ۱۷۵۶ء میں درانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ احمد شاہ کے عہد حکومت کے بیشتر حصے میں کابل حکومت کی طرف سے کوئی باقاعدہ گورنر مقرر نہیں کئے جاتے تھے۔ یہ علاقہ ہوت اور جسکانی سرداروں اور متعدد قریباً خود مختار سرحدی قبائل کے درمیان تقسیم شدہ تھا۔ کبھی کبھار بادشاہ کے سرداروں میں سے کوئی ایک فوج لے کر علاقے میں مارچ کرتا تھا، ایک بے قاعدہ اور اکثر طاقت کے ذریعے سے وہ محاصل وصول کرتے ہوئے جس کا غالباً مختلف علاقوں پر تخمینہ لگایا جاتا تھا، لیکن احمد شاہ کے عہد کے اختتام تک علاقے کی اندرونی نظم ونسق کی صورت حال پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی، اپنی وفات سے دو یا تین سال پہلے احمد شاہ نے نصرت خاں کو معزول کر دیا جو کہ ڈیرہ کا آخری ہوت حکمران تھا۔ اور اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان کے صوبے پر کمال الدین اور کابل سے مقرر کئے جانے والے دیگر گورنر حکومت کرتے رہے، کوئی دس سال بعد محمود خاں گجر جس نے ڈیرہ غازی خان کی حکومت میں میرانیوں کی جانشینی کی تھی، کے اخلاف کو بھی اسی طرح ہٹایا گیا اور ۱۷۸۶ء میں لیہ کے قدیم جسکانی خاندان کو عبدالنبی سرائی نے نکال باہر کیا جسے یہ علاقے بادشاہ کی طرف سے جاگیر میں عطا کئے گئے تھے۔ صدی کے اختتام پر دریا کے دونوں طرف موجودہ ضلع پر نواب محمد خاں سدوزئی کے تحت ایک حکومت کے تحت منظم کیا گیا تاہم آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہو گا کہ قدیم بلوچ قبائل کے تحت اس علاقے کی تاریخ کی تفصیلات کو چھیڑا جائے۔

1469ء میں ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کی بنیاد رکھنے والے قبائل کی آباد کاری

دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پہلے بلوچ سرداروں کی آباد کاری کے حوالے تاریخ فرشتہ

میں اور ایک فارسی مسودہ مترجمہ لیفٹیننٹ میکلیگن میں موجود ہیں۔ موخر الذکر کی طرف سے دیا گیا بیان یہ ہے کہ ۸۷۴ھ (۱۴۶۹ء) میں قطب الدین کے بیٹے سلطان حسین نے ملتان کی حکومت حاصل کرلی۔ اس نے شور (کوٹ)، چنیوٹ (ضلع جھنگ)، کوٹ کروڑ (کروڑ لعل عیسن) اور دین کوٹ (نزد کالا باغ) کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کے فوری بعد ایک دودائی بلوچ ملک سہراب اپنے بیٹے اسماعیل خان، فتح خان اور اپنے قبیلے کے دوسرے لوگوں کے ہمراہ کیچ مکران سے یہاں پہنچا اور سلطان حسین کی ملازمت میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت ملتان کے صوبے میں پہاڑی لٹیرے بہت تکلیف رساں ہوتے جا رہے تھے لہٰذا سلطان حسین ملک سہراب کی بر موقع آمد پر بہت خوش ہوا اور قلعہ کروڑ سے دین کوٹ تک کا علاقہ اس کی تحویل میں دے دیا۔ یہ بات معلوم ہونے پر کیچ مکران سے، بہت سے بلوچ آ کر سلطان کی ملازمت میں شامل ہوتے گئے۔ دریائے سندھ کے کنارے کے ساتھ ساتھ پڑی ہوئی کاشت شدہ اور بنجر زمینیں بلوچوں کی تحویل میں دے دی گئیں اور شاہی محصول میں اضافہ ہونے لگا۔ ڈیرہ غازی خان اور ملتان کے قدیم باشندے بیان کرتے ہیں کہ سہراب کی آمد کے بعد حاجی خان اپنے بیٹے غازی خان اپنے بہت سے رشتہ داروں اور قبیلے کے ساتھ کیچ مکران سے آ کر سلطان کی ملازمت میں شامل ہو گیا جبکہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ کے علاقے ملک سہراب اور حاجی خان کے ہاتھوں میں تھے۔ ملک سہراب نے ایک ڈیرے کی اسماعیل خان کے نام پر اور حاجی خان نے ایک دوسرے ڈیرے کی غازی خان کے نام پر بنیاد رکھی۔ اس بیان کی تصدیق مورخ فرشتہ بھی کرتا ہے۔

ان بلوچ سرداروں کی شہنشاہ شیر شاہ کی اطاعت ۱۵۴۰ء

دوبارہ ہم ان سرداروں کے بارے میں ۱۵۴۰ء میں سنتے ہیں۔ اس سال شہنشاہ شیر شاہ نے خوشاب اور بھیرہ کا دورہ کیا (ضلع شاہ پور میں) اور پنجاب کے جنوب مغربی حصوں کو زیر اطاعت لانے کا اہتمام کیا۔ ان دوسرے سرداروں کے ساتھ جو وہاں نمودار ہوئے اور جنہوں نے اطاعت قبول کی، دودائی بلوچ اسماعیل خان، غازی خان اور فتح خان بھی شامل تھے۔ یہ لوگ غالباً ان آدمیوں کے اخلاف تھے جن کا اوپر ذکر کیا گیا' کیونکہ ان خاندانوں میں یہ رسم تھی کہ وہ ایک مشترک نام رکھ لیتے تھے۔ جس سے وقت کا حکمران سردار ہمیشہ پہچانا جاتا تھا۔ پس ڈیرہ اسماعیل خان کے ہوت ہمیشہ اسماعیل خان کہلاتے تھے جبکہ ڈیرہ غازی خان کے میرانی ہمیشہ حاجی خان

اور غازی خان کہلاتے تھے۔ بلوچوں کا ذکر اس وقت کے احوال میں ایک وحشی اور جرات مند قبیلے کے طور پر ملتا ہے۔ جو زیریں پنجاب میں کافی عرصے سے آباد تھے۔ مسٹر فرائر (Fryer) اپنی ضلع ڈیرہ غازی خان کی آبادکاری رپورٹ (Settlement Report) میں ذکر کرتے ہیں کہ غازی خان اول ۱۴۹۴ء میں فوت ہوا' جیسا کہ اس کے مزار پر لکھی ہوئی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ مذکورہ بالا مسودہ کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے اور پندرہویں صدی کے آخری نصف کو ایک ایسے دور کے طور پر متعین کرتی ہے جس میں بلوچوں کی بڑی ہجرت واقع ہوئی۔ یہ چیز بلوچوں کے سرداروں کو اتنا وقت بھی مہیا کرتی ہے کہ وہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کے خوشاب کے دورے تک علاقے کے تسلیم شدہ سردار رہ چکے ہوں' ان بلوچ آبادکاروں کی تاریخ بہت زیادہ ابہام زدہ ہے۔ جو بڑی حد تک مقامی مؤرخوں کی اس عام عادت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ بڑے قصبوں اور گاؤں کی بنیاد رکھنے کو ان ابتدائی آبادکاروں یا ان کے بیٹوں کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں جن کے بارے میں گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کا نام رکھا۔

قدیم تاریخ سے حاصل ہونے والے بنیادی حقائق

تسلیم شدہ بنیادی حقائق کچھ ایسے لگتے ہیں کہ ابتدائی آبادکار دو سرکردہ خاندانوں میں گروہ بند ہو گئے تھے۔ اسماعیل خاندان اور غازی خاندان غالباً یہ دونوں ایک ہی سلسلہ سے تھے یعنی دودائی بلوچ لیکن دودائی کا نام یکسر غائب ہو جاتا ہے۔ اور مقامی تاریخ میں غازی خان کا قبیلہ میرانی بلوچوں اور اسماعیل خان کا ہوت بلوچوں کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ بلوچوں کے مطابق دودائی جاٹ دراصل ایک مخلوط قبیلہ تھا جو سٹھائی سُرما کے بڑے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جس کی نمائندگی اب لیہ کے سُرما کرتے ہیں ان کے بانی دودا نے ایک بلوچ عورت سے شادی کی۔ یہ قبیلہ بلوچ یورش سے پہلے ڈیرہ غازی خان کا مالک تھا۔ بلوچوں کی طرف سے ضم کر لئے جانے پر بھی اس نے اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ڈیرہ غازی خان کے میرانی دودائی تھے۔ اس کے برعکس ہوت خالص النسل بلوچ تھے۔ بلوچ روایت کے مطابق ہوت ان پانچ بڑی شاخوں میں سے جن میں بلوچ بنیادی طور پر تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ایک شاخ ہیں یعنی رند' لاشاری' ہوت' کورائی اور جتوئی' جنہوں نے اپنے نام میر جلال خان جو سب کا مشترکہ مورث اعلیٰ ہے کے چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے اخذ کئے۔ لہٰذا یہ بمشکل ہی دودائی قبیلے کی کوئی شاخ ہو سکتے ہیں۔ لگتا ہے ملتان کے گورنر نے ان

دونوں خاندانوں کو دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بشمول سندھ چناب سنگم سے اوپر کی جانب دریا کے دونوں طرف کے علاقے کی زمین تحویل میں دی۔ انہوں نے پہلے پہل اپنے آپ کو دائیں کنارے پر مستحکم کیا لیکن بتدریج ان جماعتوں کو جنہوں نے بائیں کنارے پر قبضہ کیا، بھی نکال پھینکا۔ ان ہوت سرداروں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ انہوں نے اپنی پہلی آبادکاری سے لے کر تقریباً ۱۷۷۰ء تک ڈیرہ اسماعیل خان پر مسلسل حکومت کی۔ جب ان کے آخری سردار نصرت خاں کو کابل کے احمد شاہ نے معزول کر دیا اور اسے قیدی بنا کر کابل لے جایا گیا، ۱۷۹۴ء میں صوبے کی حکومت محمد خان سدوزئی کو منتقل ہوگئی۔ اب احمد شاہ ابدالی ہوت تاریخ سے غائب ہو جاتے ہیں۔

لیہ میں میرانی سرداروں کی حکومت: آخری ہجرت سردار نصرت خان کو احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۷۰ء میں معزول کر دیا

لگتا ہے پرانے ضلع ڈیرہ غازی خان کی جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ لیہ تحصیل کی زمینیں سندھ کی وادی کے اس حصے میں شامل کر لی گئیں تھیں جو میرانیوں کی تحویل میں دیا گیا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کوٹ ادو، کوٹ سلطان، لیہ اور نوشہرہ کی بنیاد رکھی، نوشہرہ سے آگے کا علاقہ غالباً انتقال نامہ کی اصل شرائط کے مطابق پہلے ہوتوں کی ملکیت تھا۔ مذکورہ بالا قصبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی بنیاد ۱۵۵۰ء میں غازی خاندان کے چار بیٹوں نے رکھی تھی۔ ان میں سب سے بڑے لیہ کے بانی کمال خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے باقی بھائیوں پر برتری حاصل تھی۔ تاہم ایسے لگتا ہے کہ میرانیوں نے کبھی لیہ پر خود مختار حکومت نہیں کی۔ غازی خاندانوں نے لیہ حلقہ پر ایک غازی علاقے کے طور پر قبضہ رکھا۔ کافی حد تک اسی طرح جس طرح ڈیرہ کے ہوتوں نے دریا خان پر اپنا تسلط رکھا۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی دریائے سندھ سے ادھر کی تحصیلوں میں اپنا صدر مقام نہیں رکھا۔

یہ انہی حالات میں تھا کہ (جسکانیوں، میرانیوں) نے اقتدار حاصل کیا، میر چاکر صوبہ لیہ میں آباد ہونے والے ابتدائی بلوچوں میں سے سرکردہ شخص تھا۔ اس کے اخلاف میں سے ایک داؤد خان نامی شخص نے لیہ اور کروڑ کے درمیان کے جنگلوں میں اپنا صدر مقام واڑہ گشکوری میں

رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ایک لٹیرے سردار کے طور پر منوایا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کی ایک خاصی بڑی تعداد جمع کی اور پانچ سو گھوڑ سواروں کی قیادت کرتے ہوئے ڈیرہ غازی خان کے میرانیوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ہوتوں دونوں سے بغاوت کی، جن کی سرحدوں پر وہ اپنے آپ کو مستحکم کر چکا تھا۔ یہ سولھویں صدی کے آخری نصف میں اکبر کے عہد میں ہوا۔ آخرکار شہنشاہ اکبر نے اس کے خلاف ایک فوج بھیجی۔ وہ قتل ہو گیا اور اس کا جتھہ ٹوٹ گیا۔ تاہم لگتا ہے کہ یہ قبیلہ دوبارہ مجتمع ہوا اور سترھویں صدی کے آغاز میں ان کے سردار بلوچ خان نے شہنشاہ سے محمود کوٹ سے لے کر ضلع میانوالی میں کھولہ کے مقام تک کا علاقہ بخشیش کے طور پر حاصل کیا۔ تاہم لگتا ہے جسکانی بخشیش شدہ حصے میں اس حصے کا قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جو دریا خان کے شمال میں تھا۔ اس پر اٹھارویں صدی کے اخیر تک ڈیرہ کے ہوتوں کا قبضہ رہا۔ غالباً جسکانیوں نے اس سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کیا جو وہ پہلے ہی رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ برائے نام ہوتوں اور میرانیوں کی ماتحتی میں تھے۔ اب سے بعد وہ خود مختار تھے اور میرانیوں نے حلقہ لیہ پر اپنا اقتدار بالکل کھو دیا۔ کہا جاتا ہے کہ میرانی حتمی طور پر لیہ سے ۱۶۲۰ء کے لگ بھگ باہر ہوئے۔ لیہ اور بھکر تحصیلوں کے تمام سرکردہ بلوچ، بلوچ خان کی نسل میں سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ جسکانی، مندرانی، ممدانی، کندانی، سرگانی، اور ملیانی ہیں۔ بلوچ خان کے جانشین جسک خان، بھکر خان، لنگر خان، اور اس کے خاندان کے دوسرے سردار تھے۔ جن کے کارناموں کے بارے میں مقامی روایات بہت مبالغے سے کام لیتی ہیں۔ سترھویں صدی کے آغاز میں جسکانیوں نے لیہ، بھکر اور تھل کے آر پار چناب کی سمت حکومت کی، لگتا ہے کہ وہ اُچ کے سیالوں کے ساتھ کم و بیش جنگ کی حالت میں تھے اور وقتاً فوقتاً سکھوں کے ساتھ بھی ان کا واسطہ پڑتا رہا، جو اس وقت پنجاب میں ایک طاقت بن رہے تھے۔ بلوچ خان اوندھا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جسکانیوں کے مشہور لوگوں میں سے ایک تھا۔ ۱۷۴۶ء میں سکھ لیڈروں جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ کے ساتھ جنگ میں مارا گیا۔ اس بات کا امکان ہے۔ اس واقعے کی حقیقی تاریخ کچھ بعد کی ہو اور یہ جھنڈا سنگھ غالباً وہی ہو جس نے ۱۷۷۲ء میں ملتان پر قبضہ کیا۔ کننگھم کی سکھوں کی تاریخ، (History of Sikhs) میں ذکر ہے کہ ۱۷۷۲ء سے لے کر شاہ کابل کے دوبارہ ملتان پر قبضے تک بھنگی سکھ تمام جنوبی پنجاب پر غالب تھے اور لگتا ہے کہ انہوں نے منکیرہ اور ساتھ ہی ساتھ

ملتان پر قبضہ کرلیا تھا اور کالا باغ سے نیچے کے علاقے میں محصولات نافذ کرتے رہتے تھے' مقامی روایت رنجیت سنگھ کے آخری قبضے سے پہلے منکیرہ پر سکھوں کے قبضے کے خلاف ہے اور اس سلسلے میں کی جانے والی کوئی مہم محض ایک وقتی حملے سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتی۔ اس دور کی تاریخ بہت دھندلکے میں لپٹی ہوئی ہے اور احوال محض روایت پر مبنی ہونے کی وجہ سے متصادم ہیں۔

فتح خان جسکانی ۱۷۴۶-۷۰ء

فتح خان اپنے باپ بلوچ خان اوندھا کا جانشین ہوا۔ اسکے عہد حکومت کے اختتام کے قریب ڈیرہ اسماعیل خان کا نصرت خان ہوت دریا کو عبور کر کے بھکر آیا اور فتح خان کے بیٹے کو جس کا نام بھی نصرت تھا شکست دی۔ اور اسے قیدی بنا کر اپنے ساتھ ڈیرہ لے گیا۔ حسن خان لشکرانی کو جو فتح خان کا وزیر تھا ڈیرہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اس نے بہانے بنائے اور نصرت خان جسکانی کی ماں کی طرف سے اپنے بیٹے کی رہائی حاصل کرنے کی کوشش' نصرت خان ہوت کی طرف سے اس کی بے حرمتی پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد نصرت خان رہا ہوگیا لیکن اس بے عزتی پر شرم کی وجہ سے اس نے اور اس کے باپ دونوں نے اپنے آپ کو زہر دے دیا۔ یہ پورا واقعہ ایک بدنامی کا داغ تھا اور کیونکہ نصرت خان ہوت ایک جابر اور رند بادشاہ کے طور پر بُرے کردار کا مالک تھا لہٰذا احمد شاہ نے جو ان نیم خود مختار صوبوں پر اپنا اقتدار مضبوط کرنے کی خواہش رکھتا تھا' اس بہانے سے فائدہ اٹھایا اور اسے حکومت سے معزول کرنے کے بعد قیدی بنا کر کابل لے گیا۔

وزیر حسن خان لسکرانی

اسی دوران حسن خان لسکرانی نے سابق سردار فتح خان کے پوتے حیات خان کے نام پر دریائے سندھ سے ادھر کے علاقے پر حکومت کی تاہم حکومت کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے کا خواہش مند ہونے کی وجہ سے اس نے حیات خان کو منکیرہ کے قلعے میں اپنی کڑی نگرانی میں رکھا اس کے بعد بھی جب موخرالذکر بلوغت کو پہنچ چکا تھا۔ آخر کار حیات بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور ایک جماعت کو اکٹھا کر کے اس نے حسن خان کو شکست دے کر قیدی بنالیا۔ اس کے جلد ہی بعد حسن خان حیات خان کے کچھ ملازموں کے ہاتھوں جو اس کے مخالف تھے قتل ہوگیا۔ تاہم اب

جسکانیوں کی حکومت بہت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ سرگانی جو اس وقت ایک مضبوط قبیلہ تھا' اور حیات خان کے لاڈ پیار سے بہت بگڑ گیا تھا' حیات خان کی طرف سے تیار کی گئی ایک مہم میں جو اُچ کے ایک نیک نیت شخص گل محمد کے خلاف تھی' جو چناب کے علاقے میں اپنی خود مختاری قائم کرنا چاہتا تھا ناراض ہوگئے۔ لہٰذا انہوں نے دھوکے سے اس پر حملہ کر دیا اور ۱۷۸۷ء میں منکیرہ کے قلعے میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد سرگانیوں نے اپنے سردار گولا خان کی سرکردگی میں کچھ عرصے تک محمد خان جو مرحوم حیات خان کا بھائی اور جانشین تھا، کے خلاف استقامت دکھائی۔ آخر کار انہیں جسکانی پارٹی کے ہاتھوں دیوان لدھارام کی سرکردگی میں شکست ہوئی اور ان کے سردار گولا خان کے اس ایکشن میں قتل ہو جانے پر سرگانیوں نے محمد خان سے صلح کر لی اور انہیں منڈا شیر گڑھ کا علاقہ دے کر' جو انہیں جاگیر میں عطا ہوا تھا ان سے گلوخلاصی حاصل کر لی گئی۔

ڈیرہ غازی خان کی ہم عصر تاریخ

اب دوبارہ ڈیرہ غازی خان کے حالات کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس کے سرداروں کا ہمیشہ جسکانی ریاست کے لیہ والے حصے پر خاصا اثر تھا۔ اگرچہ اقتدار نہ تھا ڈیرہ غازی خان کی تاریخ زیادہ تر ٹکڑے ٹکڑے اور باہم متصادم ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کے پورے عہد کے دوران (۱۷۴۷-۷۳ء) پرانا میرانی خاندان' درانی بادشاہ اور سندھ کے کلہوڑوں کے مابین کچلا جا رہا تھا اور اس پورے دوران میں محمود خان گجر جو آخری غازی خانوں کے ماتحت وزیر تھا' اپنے اقتدار کی خاطر دوسرا کھیل کھیل رہا تھا۔ کبھی وہ ایک طرف ہوتا تھا اور کبھی دوسری طرف۔ جب دریائے سندھ کا مغربی علاقہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کو سونپ دیا گیا تو اس نے محمود خان کو بطور گورنر مستقل کر دیا اور لگتا ہے کہ احمد شاہ نے بھی جب اس کا ۱۷۴۸ء میں ڈیرہ غازی خان سے گزر ہوا' اسے جاری رکھا۔ تاہم یہ سارا وقت سندھ کے کلہوڑا حکمرانوں نے ملک کی خود مختاری کا دعویٰ کئے رکھا اور اگرچہ خود سندھ برائے نام اس سرزمین کا حصہ تھا جو دہلی کے شہنشاہ کی طرف سے کابل میں شامل کی گئی تھی' ابھی تک کابل کے بادشاہ کا اقتدار ڈیرہ غازی خان پر بھی کمزور اور وقفوں وقفوں سے تھا اور سخت لڑائی کے بغیر سندھ سے محصولات حاصل نہ کئے جا سکے۔ اس وقت کے کلہوڑا شہزادے تھے۔ نور محمد جسے عام طور پر نور محمد سرائی کہا جاتا ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غلام شاہ۔ یہ وہی نور محمد ہے جو ڈیرہ اسماعیل خان کے ہوتوں کے خلاف لڑا اور کیپٹن

میکنزی کے مطابق اس نے لیہ اور سندھ ساگر دوآب پر چناب تک حکومت کی۔ کیپٹن میکنزی کہتا ہے کہ اس نے جسکانیوں کو پیچھے دھکیل دیا اور دریا خان تک قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ بیان اس بیان سے مطابقت نہیں رکھتا جو صحیح محسوس ہوتا ہے۔ جسکانیوں کا لیہ پر ۱۷۸۷ء تک تسلط رہا۔ جبکہ دریا خان پر ان کا تسلط کبھی نہیں رہا۔ تاہم یہ بات ممکن لگتی ہے کہ جسکانیوں نے نادر شاہ کے حملے سے پہلے کچھ وقت کے لئے کلہوڑوں کی برتری کو تسلیم کر لیا ہو جو اس وقت عملی طور پر ایک بڑے اور دولت مند صوبے کے خود مختار شہزادے تھے اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اقتدار کو شمال کی طرف چھوٹے سرداروں تک بڑھا لیا ہو۔ ڈیرہ غازی خان میں میرانی خاندان کے آخری حکمرانوں اور محمود خان گجر جو اگرچہ اپنے عہدے کے لحاظ سے ان کا وزیر تھا لیکن درحقیقت وہ اپنے ان برائے نام آقاؤں سے زیادہ طاقتور محسوس ہوتا ہے، نے بھی اپنی حکومت کلہوڑوں کی ماتحتی میں قائم رکھی اور اگرچہ موخر الذکر کی حکومت احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد وقفوں وقفوں سے تھی لیکن لگتا ہے جب تک وہ خود سندھ کی حکومت سے نکال باہر نہیں کئے گئے انہوں نے ڈیرہ غازی خان پر اپنا دعویٰ ختم نہیں کیا۔ ۱۷۵۸ء میں بادشاہ نے کوڑا مل کے تحت ایک فوج بھیجی جس کے ہاتھوں سندھ پارٹی کو ڈیرہ غازی خان شہر کے قریب ایک لڑائی میں شکست ہوئی۔ اس موقع پر میرانی مخالف دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ جنہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کی اور ان میں بہت سے اس واقعہ کے بعد لیہ کے قرب و جوار میں ہجرت کر گئے' جہاں وہ ابھی تک خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ کوڑا مَل بعد میں ملتان کا گورنر بنا اور بادشاہ کے ماتحت اس نے ڈیرہ غازی خان کے میرانیوں اور لیہ کے جسکانیوں پر ایک طرح کا اقتدار چلایا۔ ۱۷۶۹ء میں غلام شاہ کلہوڑا نے دوبارہ ڈیرہ غازی خان پر حملہ کیا اور آخر کار میرانیوں کو وہاں سے دھکیل دیا۔ اس نے محمود خان گجر کو بطور گورنر تعینات کیا اور محمود خان کے بعد اس کا بھتیجا برخوردار جانشین ہوا جو ۱۷۷۹ء میں قتل ہو گیا۔ جب صوبہ، کابل حکومت کی طرف سے براہ راست مقرر کئے جانے والے گورنروں کی ماتحتی میں آ گیا۔ مدتوں محمود خان نے اور نہ برخوردار نے لیہ اور دریائے سندھ سے ادھر کے علاقہ پر کوئی اقتدار استعمال کیا۔ وہ خالصتاً ڈیرہ غازی خان کے گورنر تھے۔ غلام شاہ نے ۱۷۶۹ء میں ڈیرہ غازی خان کو حاصل کیا لیکن ۱۷۷۲ء میں خود کلہوڑے سندھ میں تالپوروں کے ہاتھوں باہر دھکیل دیے گئے۔ اس چیز نے انہیں کلیتہً شاہ کابل کے ہاتھوں میں ڈال دیا اور وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ ضلع

ڈیرہ غازی خان میں واپس آ گئے۔ جہاں انہیں خاصی جاگیریں عطا کی گئیں۔ اب سے بعد وہ اپنے پرانے نام کلہوڑا کی بجائے سرائی کہلانے لگے۔ اب سرائیوں نے ڈیرہ غازی خان میں اپنے آپ کو مشکل میں پھنسے ہوئے پا کر مسلح پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ کسی نئی سرزمین کی تلاش شروع کر دی جہاں وہ نئی ریاست کی بنیاد رکھ سکیں۔

جسکانی علاقہ اندرونی دھڑے بندی کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا اور پرانی روایت کے ذریعے ڈیرہ غازی خان سے منسلک تھا' بالکل ہی قریب تھا اور اس مقصد کے لئے ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ لہٰذا تیمور شاہ کی طرف سے ایک سند سے لیس ہو کر غلام شاہ کے بھائی عبدالنبی سرائی نے شورش پسند سرگانیوں سے ملی بھگت کی اور ۱۷۸۹ء میں لیہ پر چڑھائی کی۔ محمد خان جسکانی کو شکست ہوئی۔ وہ ٹوانہ کے علاقے کی طرف اور وہاں سے بہاولپور بھاگ گیا۔ غالباً نواب بہاولپور اسے اپنا علاقہ واپس لینے میں مدد دیتا' لیکن محمد خان نے بلوچوں والے غرور کے ساتھ نواب کو باز کے شکار کے بارے میں ایک اہم کام جس کے لئے اس نے اسے کہا تھا انجام دینے سے توہین آمیز طریقے سے انکار کر دیا اور ساگر کے نتکانی سردار حسن خان کا دست نگر بن کر اپنے دن پورے کر لیے۔ جسکانی خاندان کے موجودہ جانشینوں کا ذکر ''سرکردہ خاندانوں پر نوٹس'' میں کیا جائے گا۔ اس طرح جسکانی سرداروں کی نسل دو سو سال کی حکومت کے بعد ختم ہوئی۔ عبدالنبی سرائی نے لیہ پر صرف تین سال تک حکومت کی۔ بادشاہ کو اسکی ظالمانہ حکومت کے بارے میں شکایات کی گئیں جبکہ محمد خاں سدوزئی کے لئے تقرری کا مطالبہ کیا گیا۔ وہ ملتان کے نواب مظفر خان کا چچازاد بھائی تھا جس کی نمائندگی میں اس نے بادشاہ کے اطمینان کے مطابق کچھ عرصے تک گورنر کے طور پر بھی کام کیا۔ پس فوری طور پر ایک سند تیار کی گئی جس کی رو سے محمد خان کو نواب اور سندھ ساگر دوآب' کلورکوٹ سے لے کر محمود کوٹ تک اور سندھ سے لے کر چناب تک کا گورنر مقرر کیا گیا۔ محمد خان نے ابھی قبضہ حاصل کرنا تھا جو بغیر جنگ کے نہیں ہو سکتا تھا' اس کا مقابلہ عبدالنبی سرائی سے لیہ کے قریب ہوا اور بعد میں ہونے والی لڑائی میں پہلے سرائیوں کو برتری حاصل ہوئی اور نواب کے لوگ بھاگ گئے۔ خود نواب محمد خان بھی بھاگنے کو تیار تھا یہ کہتے ہوئے کہ ''بادشاہ بغیر فوج کے کیا کر سکتا ہے؟'' لیکن اس کے ایک جمعدار نے روک لیا۔ جس نے کہا ''بھاگ جانے سے مر جانا بہتر ہے''۔ آخر کار اس نے اپنی افواج کے ایک حصے کو اکٹھا کیا اور اسی

دوران میں کچھ لبانے بھنگ کے کھیت سے چھپتے ہوئے آئے اور سرائیوں پر پیچھے سے حملہ کرتے ہوئے عبدالنبی کے بیٹے محمد عارف جو جنگ کا روح ورواں تھا، کو قتل کر دیا جس کے نتیجے میں سرائیوں نے بددل ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ سرائیوں کو اپنی جائیداد وہاں سے منتقل کرنے کے لئے ایک دن دیا گیا اور وہ کشتی کے ذریعے جنوب میں اپنے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔

اسی دوران تیمور شاہ ۱۷۹۳ء میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کا جانشین زمان شاہ ہوا تاہم اُس کے استحقاق پر شہزادہ ہمایوں نے جھگڑا کیا۔ ۱۷۹۴ء میں ہمایوں نے اپنی سلطنت زمان شاہ سے واپس لینے کی دوسری کوشش کی، لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ ساگر کی طرف بھاگ گیا۔ جہاں ساگر کے سردار مسو خان نتکانی نے اس کی مدد کی اور اس نے اسے دریا پار کرا کے ڈیرہ فتح خان گھاٹ کی طرف پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ لیہ پہنچ گیا اور ایک کنویں پر ٹھہرا، جہاں اس کے چند گنوں کے عوض سونے کی ایک اشرفی عطا کرنے پر تجسس پیدا ہوا۔ یہ خبر نواب محمد خان کے کانوں تک پہنچی جو اس وقت اتفاق سے لیہ میں تھا۔ نواب کو شک گزرا کہ یہ لازماً شہزادہ ہمایوں ہو گا جس کی گرفتاری کے لئے زمان شاہ کی طرف سے سخت احکامات اور ساتھ ہی ساتھ ان گنت انعامات جاری ہوئے تھے۔ اندریں حالات اس نے کچھ گھڑ سوار لیے اور ہمایوں کا پیچھا کیا، جسے اس نے تھل میں لیہ سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک کنویں پر جا گھیرا۔ ہمایوں کے ساتھ کوئی بیس یا تیس گھڑ سوار تھے جنہوں نے جان پر کھیل کر ایک اچھی لڑائی لڑی۔ ہمایوں کا نوجوان بیٹا قتل ہو گیا خود ہمایوں قید ہو گیا اور لیہ لایا گیا۔ نواب نے فوراً ہمایوں کی گرفتاری کی اطلاع بادشاہ زمان شاہ کو دی جس نے یہ احکامات بھیجے کہ ہمایوں کی آنکھیں نکال لی جائیں اور اس کے ساتھیوں کی انتڑیاں نکال لی جائیں۔ اس نے نواب کو سربلند خاں کا خطاب بھی عطا کیا اور پہلے سے موجود سلطنت کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خان کی حکومت بھی۔ بادشاہ کے احکامات پر لیہ میں عمل درآمد کیا گیا۔ ہمایوں کے ملازموں میں سے جنہوں نے تکالیف اٹھائیں ان میں فتح خان کا ایک بھائی بارک زئی بھی تھا۔ خود ہمایوں نے اپنی بقیہ زندگی قید میں گزاری۔

ایک نتکانی سردار کی حکمرانی تھی، کے علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ نواب محمد خان نے اپنا صدر مقام ڈیرے کا صوبہ جس کا اب محمد خاں گورنر بن گیا تھا کا سلسلہ خانسر سے لے کر ساگر، جس پر منکیرہ اور بھکر رکھا ہوا تھا اور ڈیرے پر ایک نائب کے ذریعے حکومت کرتا تھا۔

نواب محمد خان کی وفات ۱۸۱۵ء

نواب محمد خان ۱۸۱۵ء میں وہ فوت ہو گیا۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کا جانشین اس کا داماد حافظ احمد خان بنا۔ محمد خان بلاشبہ عظیم کردار کا آدمی تھا اور اس کی زندگی کے دوران سکھ لیہ کے علاقے پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ اس کی وفات کے فوراً بعد حافظ احمد خان سے خراج کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے انکار پر خان گڑھ اور محمود کوٹ کے قلعوں پر سکھوں نے قبضہ کر لیا اور قرب و جوار کی مسلمان آبادی پر بہت زیادہ ظلم کئے گئے۔ یہاں تک کہ حافظ احمد خان نے سکھ فوجوں کی واپسی کا خاصی رقم کی ادائیگی کے عوض اہتمام کیا اور اس طرح قلعے واپس لئے اور اس کے ساتھ لُوٹے ہوئے مال کا کچھ حصہ بھی۔ اس کے بعد سکھ حکومت نے نواب پر ہر قسم کے ظالمانہ مطالبوں سے دباؤ جاری رکھا۔ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ رنجیت سنگھ کسی بھی قیمتی گھوڑے کو جس کے بارے میں وہ سن لیتا تھا، قبضے میں لینے کا بڑا شوقین تھا اور اس نے نواب کو بھی اپنے کچھ مخصوص پسندیدہ گھوڑوں کو پیش کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۱۸ء میں نواب مظفر خان کی طرف سے بہادرانہ مزاحمت کے باوجود ملتان سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ حافظ احمد خان نے نواب کے بھائی اور اس کے رشتہ داروں کی اس جدوجہد میں مدد نہ کی اور اس کی باری بھی جلد آنے والی تھی۔ ۱۸۲۱ء کے موسم خزاں میں رنجیت سنگھ زیادہ سنجیدہ مسائل سے آزاد ہو گیا اور اس نے اسے زیر کرنے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ اس نے ایک فوج کے ساتھ شاہ پور سے ڈیرہ اسماعیل خان کے سامنے دریا کے مخالف سمت میں ایک مقام تک مارچ کیا۔ اس نے آٹھ ہزار آدمیوں کی ایک فوج دریا کے پار بھیجی اور اس پر یہ شہر گورنر دیوان مانک رائے کی طرف سے ان کے حوالے کر دیا گیا، بھکر، لیہ، خان گڑھ اور موج گڑھ، تمام بتدریج بغیر کسی مزاحمت کے سر کر لئے گئے۔ منکیرہ جو مٹی کی ایک دیوار سے محصور تھا اور اس میں اینٹوں کا بنا ہوا قلعہ بھی تھا جو صحرا کے وسط میں ہونے کی وجہ سے زیادہ محفوظ تھا۔ اب باقی بچ جانے والا واحد قلعہ تھا اور اس کی فتح کے لئے بھی ایک ڈویژن ۱۸ نومبر کو روانہ کر دیا گیا۔ ایک بہادر پر جوش انسان نے سردار خان بادوزئی حافظ احمد خان کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً باہر نکلے اور سکھوں پر حملہ کر دے۔ اس نے کہا "میدان میں لڑنا شیر کا کام ہے اور بل میں لڑنا لومڑی کا" تاہم حافظ احمد خان اس پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے محصور ہو کر مقابلہ کرنے کو ترجیح دی۔ اب سکھوں نے بیلداروں کو فوج کے استعمال کے لئے کچھ کنویں

کھودنے پر لگا دیا اور اس دوران میں پانی اونٹوں اور بیلوں پر موج گڑھ سے لانا پڑا۔ ۲۵ نومبر تک کنوئیں تیار ہو گئے اور پھر رنجیت سنگھ اپنی بڑی فوج کے ساتھ منکیرہ منتقل ہو گیا۔ اس جگہ پر بمباری اس کے دس دن بعد بھی جاری رہی لیکن یہ محاصرین کے نقصان کے بغیر نہ تھی۔ آخر کار قلعے کی مسجد کے ایک مینار کے محاصرین کے حملے سے ٹوٹ جانے کے بعد حافظ احمد خان نے اسے ایک بُرا شگون سمجھا اور یہ سوچ کر کہ عزت کی خاطر بہت کچھ کیا جا چکا ہے، صلح کی شرائط پیش کر دیں اور اس شرط پر قلعہ حوالے کرنے کی پیشکش کر دی کہ اسلحہ اور جائیداد کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ڈیرہ کا شہر اور صوبہ مناسب جاگیر کے ساتھ اسے رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ رنجیت سنگھ نے شرائط قبول کر لیں چنانچہ یہ جگہ ان کے حوالے کر دی گئی۔ نواب کے ساتھ بہت شرافت کا سلوک کیا گیا اور اسے حفاظت میں ڈیرہ بھیجا گیا۔ اب رنجیت سنگھ نے دریائے سندھ سے ادھر کی تحصیلوں کو ساتھ شامل کر لیا۔ یہ تصور نہیں کرنا چاہتے کہ سکھوں کے ماتحت دریائے سندھ سے ادھر کا پورا علاقہ ایک متحدہ حکومت بن گیا تھا۔ اس کا بہت بڑا حصہ جاگیر کی شکل میں رکھا گیا۔ ہر جاگیر دار اپنی جاگیر کی حدود میں عدلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات رکھتا تھا اور وہ اس کاردار سے بالکل خود مختار ہوتا تھا جسے ضلع کا خالصہ حصہ پٹے پر دیا جاتا تھا۔ یہ جاگیر دار تقریباً ہمیشہ غیر رہائشی ہوتے تھے اور اپنی جاگیروں کا انتظام کرنے کے لئے اپنے گماشتے مقرر کرتے تھے۔ جنہیں حاکم کہا جاتا تھا۔ یہ حاکم کم و بیش ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور ان کے مویشی چُرانے کے عادی تھے اور علاقہ دیوان ساون مل کے وقت تک عام طور پر ایک ابتری کی حالت میں تھا۔ یہ جاگیریں زیادہ تر تھل میں تھیں۔ دریائے سندھ سے ادھر کی جاگیریں جو سکھوں کی طرف سے عطا کی گئیں، سوائے ایک یا دو چھوٹے سے گاؤں کے تمام کی تمام اب دوبارہ واپس کر لی گئی ہیں۔

چار حکومتوں کا اتحاد

چار حکومتوں کی تاریخ اب ایک ایسے نقطہ پر پہنچ گئی ہے جہاں وہ گرنا اور ایک سربراہ کے تحت متحد ہونا شروع ہوتی ہیں۔ یہ عمل ۱۷۹۰ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان مکمل ہوا۔ بہاول خان ثانی کے لئے دریائے سندھ کے مغرب کی طرف ہٹ جانے اور ان تعلقوں پر قبضہ کر لینے سے جن پر اب تحصیل علی پور مشتمل ہے پورا ضلع کھلا پڑا تھا۔ ضلع کے اس حصے میں جس پر ڈیرہ غازی خان

سے حکومت کی جاتی تھی طوائف الملوکی طاری تھی جو محمود خان گجر کی حکومت کے بعد شروع ہوئی۔ ۱۷۹۰ء اور صدی کے اختتام کے درمیان کے عرصے میں بہاول خان ثانی نے ارائیں، کینچھر، کھور، ماہرا، سیری اور ترنڈ کے تعلقوں پر قبضہ کر لیا جو اب مظفر گڑھ تحصیل کے جنوبی اور مغربی حصے ہیں۔ یہ علاقہ اور علی پور تحصیل، تھل نوابوں کے کچھی شمالی کے مقابلے میں کچھی جنوبی کہلاتے تھے۔ وہ اور اس کے جانشین صادق خان دوم، اور بہاول خان سوم علاقے کو ایک مستحکم حکومت کے تحت لائے۔ انہوں نے کاشتکاری کی حوصلہ افزائی کی اور نہریں کھدوائیں۔ ان کی تخت نشینی اور فوتیدگی کی تاریخیں گورنر بہاول خان سوم کے وقت تک ریکارڈ پر نہیں ہیں جس نے ملتان کے محاصرے میں ایڈورڈز کی مدد کی تھی۔ وہ ۱۸۵۲ء میں فوت ہوا۔

۱۸۱۸ء میں سکھوں نے ملتان پر قبضہ کیا اور ان تعلقوں پر جن پر پہلے مظفر خان حکومت کرتا تھا یعنی رنگ پور، مراد آباد، مظفر گڑھ، خان گڑھ اور غضنفر گڑھ اب سے بعد ملتان کے سکھ گورنروں کا راج قائم ہو گیا۔ ۱۸۱۹ء میں سکھوں نے ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کر لیا لیکن بہاول خان کا قبضہ اپنی فتوحات پر برقرار رہا۔ ۱۸۲۱ء میں سکھوں نے منکیرہ پر بھی قبضہ کر لیا جہاں سے اس ضلع کے شمال پر حکومت کی جاتی تھی۔ بہاول خان نے سکھوں کی اطاعت اختیار کر لی اور اس طرح پورا ضلع رنجیت سنگھ کی حکومت کے تحت متحد ہو گیا۔ پھر ایک تقسیم نو عمل میں آئی۔ بہاول خان کی فتوحات کی توثیق کر دی گئی۔ جو اسے متاجری پر دے دی گئیں جس کے معاوضے کی رقم یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ ضلع کے شمالی حصوں پر منکیرہ سے حکومت کی جاتی رہی اور مظفر خان کے تعلقوں پر ملتان سے حکومت کی جاتی تھی۔ ملتانی پٹھان علاقے سے بھاگ گئے اور زیادہ تر ڈیرہ اسماعیل خان چلے گئے جو اس وقت تک واپس نہ آئے جب تک کہ برطانوی ۱۸۴۹ء میں یہاں آئے۔ ۱۸۲۲ء میں انہوں نے ملتان کے گورنر کے پیش کار دیوان ساون مل کی رسم تخت نشینی ادا کی۔ بھاوا بدن ہزاری اپنے افسر سے لڑ پڑا اور مظفر گڑھ، مراد آباد اور غضنفر گڑھ کے تعلقے، رنجیت سنگھ کی طرف سے اسے متاجری پر دے دیئے گئے۔ بہاول خاں، وہ رقم، جس کے عوض اس کا علاقہ اسے متاجری پر دیا گیا تھا، ادا کرنے میں ناکام رہا۔ لاہور سے جنرل ونچورا (General Ventura) کو ایک فوج کے ساتھ بھیجا گیا اور اس نے بہاولپوریوں کو اس ضلع سے چناب کے پار نکال دیا جو اس وقت سے اس ضلع اور بہاولپور کے درمیان ایک سرحد ہے۔ آخر کار ۱۸۳۷ء میں مظفر گڑھ کے

موجودہ ضلع کو دیوان ساون مل کے تحت متحد کیا گیا جو سکھوں کے ماتحت ملتان کا گورنر تھا۔

اگرچہ بہاولپور کے نوابوں کی حکومت میں ضلع کے کچھ حصوں نے خاص مستحکم نظم و نسق دیکھا۔ دیوان ساون مل کی حکومت اس سے پہلے آنے والی حکومتوں میں سب سے بہتر تھی۔ اس کا مقصد وحید دیوان کے لئے دولت جمع کرنا تھا۔ عوامی کاموں کی بجا آوری، انصاف کا انتظام اور جان و مال کی حفاظت ثانوی اغراض تھیں اور ان پر صرف اس لئے زور دیا جاتا تھا کیونکہ ان کے بغیر زراعت ترقی نہ کرتی اور محصولات ادا نہ ہوتے۔ اس کے نظام محصولات پر تیسرے باب میں توجہ دی گئی ہے۔ اس کے عہد کے دوران لبانہ آبادکاروں کی ایک بڑی تعداد ضلع میں آباد ہوئی۔

دیوان ساون مل ۲۹ ستمبر ۱۸۴۴ء کو فوت ہوا اور اس کا جانشین اس کا بیٹا مول راج ہوا جس کے بارے میں اس ضلع سے خصوصی طور پر متعلقہ کوئی چیز معلوم نہیں ہے۔

جنگ ملتان ۱۸۴۸ء

اپریل ۱۸۴۸ء میں لاہور ریذیڈنٹ کے اسسٹنٹ سر ہربرٹ ایڈورڈز نے ملتان میں شورش اور وینس ایگنیو (Vans Agnew) کے قتل کے بارے میں سنا۔ وہ اس وقت ڈیرہ فتح خان میں تھا۔ وہ فوراً دریا عبور کر کے لیہ آیا لیکن مول راج کی بھیجی ہوئی فوج کی پیش قدمی پر پسپا ہو گیا۔ اگلا مہینہ لیہ کے گردونواح میں نقل و حرکت اور جوابی نقل و حرکت میں صرف ہو گیا۔ اسی دوران میں ایڈورڈز نے ایک مخلوط فوج تیار کر لی تھی جو زیادہ تر ملتانی پٹھانوں، پانڈا پور اُسترانوں اور دیگر سرحدی قبائل کے آدمیوں پر مشتمل تھی۔ ۲۱ مئی کو اس نے وین کورٹ لینڈ (Van Courtland) کی سرکردگی میں فوج سندھ کے دائیں کنارے کے نیچے کی طرف بھیجی۔ فوج کے ہاتھوں ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کے بارے میں سنا۔ پھر اس نے ملتان کی طرف حرکت شروع کی۔ اپنی مارچ کے دوران اس نے کنیری اور سدوزام کی لڑائیاں لڑیں جن میں اس کی سخت جان افواج نے زبردست بہادری کا مظاہرہ کیا۔ انہی فوجوں نے جنرل وِش (General Whish) کی سرکردگی میں ملتان کے محاصرے میں حصہ لیا۔ ۲۲ جنوری ۱۸۴۹ء کو ملتان کی فتح پر ایک بہت بڑی تعداد کو فارغ کر کے گھر بھیج دیا گیا۔ تاہم ایڈورڈز کے دستوں میں سے دو ہزار کو سرکاری ملازمت میں برقرار رکھا گیا اور تمام سرکردہ سردار حکومت سے خاص پنشن وصول کرتے رہے۔ ۲۹

مارچ ۱۸۴۹ء کو پنجاب کو برطانوی سلطنت میں ضم کر لیا گیا اور ضلع خان گڑھ اور ضلع لیہ کی طرح موجودہ ضلع پر مشتمل علاقے جو زیادہ تر پہلے ہی برطانوی افسروں کے زیر انتظام تھے وہ رسمی طور پر سلطنت برطانیہ کا حصہ بن گئے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کا مندرجہ ذیل بیان پنجاب بغاوت رپورٹ (Punjab Mutiny Report) میں سے لیا گیا ہے۔ میجر براؤن اس ضلع کے بارے میں رقم طراز ہے

''خان گڑھ کا ضلع بجز اس خطرے کے جو یورپین لوگوں کو ملتان میں موجود باغی فوجوں کی قربت اور بہاولپور سے لٹیروں کے گروہوں کے ہاتھوں ضلع کے زیریں حصوں پر حملہ کے امکان میں محسوس ہوا کسی قسم کے بُرے اثرات سے محفوظ رہا''۔

تاہم احتیاطی اقدامات ضروری تھے۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ہینڈرسن (Henderson) نے جیل، کچہری، بڑے خزانے اور ضلعی خزانوں کو مضبوط بنایا۔ تمام انگریزوں کو مسلح کیا اور تمام گھاٹوں پر کڑا پہرا مقرر کیا۔ اس نے لیفٹیننٹ فیرس (Ferris) اسسٹنٹ کمشنر کو چناب کے کناروں کے ساتھ ساتھ چوکیوں کا ایک سلسلہ قائم کرنے پر مامور کیا۔ یہ کام پورے طور پر مکمل ہو گیا۔ خود دیہاتیوں نے اس قدر رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دیں کہ جلد ہی ۱۰۴ چوکیوں کا ایک حلقہ جو چھبیس میل تک پھیلا ہوا تھا، قائم ہو گیا۔ ایک دوسرے موقع پر گھڑ سوار فوج کا ایک سلسلہ چودھویں نیٹو انفنٹری (14th Native Infantry) کے بچے کھچے حصے کو جو جہلم سے آ سکتا تھا اور رکھنے کے لئے چناب سے لے کر سندھ تک ضلع کے ساتھ ساتھ تعینات کر دیا گیا خان گڑھ، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ اور ملتان کے درمیان ایک انٹیلی جنس کا محکمہ بھی منظم کیا گیا۔

ضلع لیہ بھی بہت پر سکون رہا۔ غدر سے متعلقہ جرائم کے سلسلے میں صرف ایک یا دو ہلکی سی سزائیں دی گئیں۔ ایک موقع پر کیپٹن ہاکن (Captain Hockin) کی سرکردگی میں سترھویں ارریگولر کیولری (17th Irregular Cavalry) کے ایک بازو کی آمد سے خاصی پریشانی پیدا ہو گئی لیکن صورت حال مستحکم رہی۔ جب ستمبر میں کھرل بغاوت کی تحریک شروع ہوئی تو کیپٹن ہاکن نے لیہ میں چالیس آدمی چھوڑتے ہوئے، جو مشتبہ ہو گئے تھے باغیوں کے خلاف مارچ کیا۔ اس کے مارچ کرنے سے ایک دن پہلے لیہ میں یہ خبر پہنچ گئی کہ پوری نویں ارریگولر کیولری (9th Irregular Cavalry) نے میانوالی میں بغاوت کر دی ہے۔ کیپٹن فینڈل کہتا ہے۔ ''میں نے

یقیناً پہلے یہ سمجھا کہ پورے ملک کو ابھارنے کی کوئی گہری اسکیم تھی کہ نویں ارریگولری کیولری کو ڈیرہ اسماعیل خان کے سامنے نمودار ہونا تھا اور انتالیسویں نیٹو انفینٹری سے مل کر لیّہ آنا تھا' پھر سترھویں لائٹ کیولری کے ایک بازو کو وہاں سے ساتھ ملانا تھا پھر گوگیرہ کی طرف جانا تھا' قبائل کے ساتھ اتحاد کرنا تھا اور پھر ملتان کی طرف مارچ کرنا تھا' جہاں نیٹو انفینٹری کی دو مشتبہ رجمنٹیں تھیں۔ یہ ممکن العمل تھا اور یہ ہمیں زیریں پنجاب سے عارضی طور پر محروم کر دیتا"۔ لیکن یہ خوفناک اتصال واقع نہ ہوا۔ یہ خبر ایک مبالغہ آرائی ثابت ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ نویں ارریگولر کیولری کے باغی سب کے سب ستلج سے ادھر کی ریاستوں کے آدمی تھے تعداد میں صرف بتیس تھے اور ایک دلیرانہ لڑائی میں کلّی طور پر شکست کھا گئے۔ جس میں لیّہ کے ایکسٹرا اسسٹنٹ مسٹر تھامسن خطرناک طور پر زخمی ہو گئے۔ اس بہت پر جوش چھوٹی سی لڑائی میں اس کا بہادرانہ کردار نمایاں تھا۔

ضلع کی ترکیبی ساخت اور سرحدوں کی تبدیلیاں

خان گڑھ کے برطانوی ضلع میں مظفر گڑھ اور علی پور کی موجودہ تحصیلیں اور گڑھ مہاراجہ اور احمد پور کے تعلقے شامل تھے جو اب ضلع جھنگ میں ہیں۔ پہلے خان گڑھ کا نام ضلع کے صدر مقام کے لئے تجویز کیا گیا۔ لیکن ۱۸۵۹ء کے اختتام سے پہلے یہ مظفر گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ خان گڑھ میں چار تحصیلیں تھیں۔ رنگ پور' خان گڑھ جس کا صدر مقام مظفر گڑھ میں تھا کینجھر اور سیت پور۔ ۱۸۵۹ء میں کوٹ ادو تحصیل لیّہ سے علیحدہ کر دی گئی اور اس ضلع میں شامل کر دی گئی۔ اور اس ضلع نے مظفر گڑھ کا نام اختیار کر لیا اور ملتان ڈویژن کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ ۱۸۶۱ء میں رنگ پور تحصیل ختم کر دی گئی۔ گڑھ مہاراجہ اور احمد پور کے تعلقے جھنگ میں شامل کر دیئے گئے اور باقی ماندہ تحصیل کو مظفر گڑھ تحصیل کے ساتھ منسلک کر دیا گیا کینجھر تحصیل ختم کر دی گئی اور اس کے تعلقے مظفر گڑھ میں شامل کر دیئے گئے۔ سیت پور تحصیل علی پور منتقل کر دی گئی۔

ضلع لیّہ کی تشکیل کی گئی

اشتمال سے پہلے دریائے سندھ سے ادھر کے ٹکڑے کو دیوان ساون مل کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ ضلع کے پہلے انتظام کے مطابق ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور ضلع بنوں کی سندھ پار کی تحصیلوں پر مشتمل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان بنایا گیا جس کا صدر مقام بنوں تھا۔ دریائے سندھ

سے ادھر کی تحصیلیں یعنی میانوالی' بھکر اور لیّہ ۱۸۵۹ء تک مظفر گڑھ کی تحصیل کوٹ ادو' لیّہ ضلع کی تشکیل کرتی تھیں جس کا صدر مقام لیّہ تھا۔ یہ انتظام جو اگرچہ کئی لحاظ سے بعد والے انتظام سے سہل تر تھا۔ ۱۸۶۱ء میں برطرف کر دیا گیا کیونکہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ڈپٹی کمشنر کے لئے اتنی لمبی سرحد کی ذمہ داری بہت بھاری سمجھی جاتی تھی۔ پھر ان دونوں اضلاع کے شمالی حصوں پر مشتمل ضلع بنوں تشکیل دیا گیا اور جنوبی حصوں پر مشتمل ضلع ڈیرہ اسماعیل خان۔ ابتدائی ڈویژن طُولانی (لمبائی کے رُخ) تھا۔ جس میں دریائے سندھ سرحد تھا۔ نیا ڈویژن عرضی (چوڑائی کے رُخ) تھا۔ اس طرح کہ سندھ کے دونوں اطراف کے کچھ حصے دونوں اضلاع میں شامل تھے۔

نیا ڈیرہ اسماعیل خان ضلع پانچ تحصیلوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ڈیرہ اسماعیل خان' کلاچی اور ٹانک دریائے سندھ کے پار تھیں اور لیّہ اور بھکر دریائے سندھ سے ادھر یکم جنوری ۱۸۶۱ء کو قدیم ضلع لیّہ کو توڑ کر کمشنری کے صدر دفاتر لیّہ سے ڈیرہ اسماعیل خان منتقل کر دیئے گئے۔ جو کہ ایک دور دراز مقام سے ڈویژن کا صدر مقام بن گیا۔ لیّہ کی نئی تحصیل میں قدیم منکیرہ تحصیل جو کہ ۱۸۵۳-۵۴ء میں توڑ دی گئی کا جنوبی حصہ شامل تھا۔ جبکہ چوبارہ' نواں کوٹ اور موج گڑھ کے تعلقے لیّہ کو منتقل کر دیئے گئے۔ پہاڑ پُور کا گاؤں ۱۸۶۱ء میں کوٹ ادو تحصیل سے منتقل کیا گیا اور دریا کے کنارے والے گاؤں کی ایک پٹی ۱۸۶۹ء میں سنگھڑ تحصیل سے منتقل کی گئی۔ ۱۸۷۴ء میں سکھانی اور چھ دوسرے گاؤں ضلع ڈیرہ غازی خان کی سنگھڑ (موجودہ تونسہ) تحصیل سے لیّہ منتقل کئے گئے۔

لیّہ کے کمشنر

کرنل راس (Col Rass) لیّہ ڈویژن کا پہلا کمشنر تھا اور اس نے یہ عہدہ ۱۸۵۰ء سے لے کر اپنی وفات یعنی ستمبر ۱۸۵۷ء تک سنبھالے رکھا۔ اس کا مقبرہ لیّہ کے قبرستان میں ہے۔ پھر چند ماہ کے لئے اس وقت کے ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر میجر پولاک (Major Pollock) نے عارضی طور پر اس کی جگہ لی اور اس کے بعد میجر براؤن (Major Brown) ۱۸۶۰ء تک رہا۔

لیہ کے ڈپٹی کمشنر

پرانے ضلع لیہ کا چارج مندرجہ ذیل ڈپٹی کمشنروں کے ہاتھ میں رہا۔

نام	از		تا
کیپٹن ہالنگز Captain Hallings	۱۸۴۹ء	تا	۱۸۵۲ء
مسٹر سیمسن Mr. Simson	۱۸۵۲ء	تا	۱۸۵۶ء
کیپٹن مسٹر نیل Captain Mr. Neile	۱۸۵۶ء		
کیپٹن بیکن Captain Bacon	۱۸۵۶ء	تا	۱۸۵۷ء
کیپٹن فینڈال Captain Fendall	۱۸۵۷ء	تا	۱۸۵۹ء
کیپٹن پارسنز Captain Parsons	۱۸۵۹ء	تا	۱۸۶۰ء
لیفٹیننٹ سیمول	۱۸۶۰ء		

۱۹۰۱ء میں لیہ نئے ضلع میانوالی میں منتقل ہو گیا

شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پنجاب سے علیحدہ ہونے پر مزید ترکیب نو واقع ہوئی اور ۹ نومبر ۱۹۰۱ء کو چار تحصیلوں عیسیٰ خیل، میانوالی، بھکر اور لیہ سے جن میں سے اول الذکر بنوں سے لی گئی اور موخر الذکر دو ڈیرہ اسماعیل خان سے، ضلع میانوالی کی تشکیل کی گئی۔ اس کے صدر دفاتر میانوالی میں رکھے گئے۔ لیہ اور بھکر تحصیلوں کا ایک سب ڈویژن بنایا گیا جس کا صدر دفتر بھکر میں تھا اور اِس ضلع کو ملتان ڈویژن میں شامل کیا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو لیہ تحصیل کو ضلع مظفر گڑھ میں منتقل کر دیا گیا اور یہ اس کا سب ڈویژن بن گیا۔

ملتانی پٹھان

برطانوی عہد میں متعارف ہونے والے واحد سیاسی آباد کار ملتانی پٹھان تھے۔ جنہوں نے واپس آ کر وہ زمینیں دوبارہ حاصل کیں جن سے ۱۸۱۸ء میں سکھوں نکالے گئے تھے۔

بعد کی تاریخ

ضلع کی بعد کی تاریخ میں کوئی چیز اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ لوگ پُر امن اور وفادار رہے ہیں۔ جنگ عظیم ۱۵۔۱۹۱۴ء کے دوران کچھ بے چینی پیدا ہوئی اور ڈکیتیوں کا ایک سلسلہ شروع

ہوا۔ جو ان افواہوں کے ساتھ شروع ہوا کہ جرمنوں کی طرف سے حملہ ہونے والا ہے۔ تاہم یہ سیاسی سے زیادہ فرقہ وارانہ اور معاشی تھا کیونکہ ان مسلمانوں نے جو ہندوؤں کے مقروض تھے انہیں لُوٹا، ہندوؤں کی اس ضلع پر معاشی گرفت تھی۔ مسلمان مقروض تھے۔ یہ چیز فرقہ وارانہ کشیدگی کا سبب بنتی رہی۔

آثار قدیمہ کی باقیات اور محفوظ یادگاریں

اس ضلع میں حقیقی آثار (قدیمہ کی) دلچسپی کی حامل کوئی جگہیں نہیں ہیں۔ حضرت لعل عیسن کے مزار کی تاریخ تعمیر ۱۴۰۰ء ہے۔ لیکن یہ محفوظ یادگار نہیں ہے۔ اسی طرح دائرہ دین پناہ کا مقبرہ ہے۔ ان کے حوالے کہیں اور بھی دیئے گئے ہیں۔ رنجیت سنگھ کے وقت کے مٹی کے قلعے منڈا چوبارہ وغیرہ میں ہیں۔

نوٹ: (اس مضمون کی تکمیل میں ڈسٹرکٹ گزیٹر مظفر گڑھ سے استفادہ کیا گیا)۔

لیّہ (ایک شہر بھی اور ایک انجمن بھی)

ڈاکٹر خیال امروہوی

انسانی تمدن کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے۔ انسان نے دنیا کے تقریباً ہر خطے میں اپنی ضروریات کے مطابق بستیاں آباد کیں، بنجر زمینوں کو سرسبز بنا دیا' پہاڑوں پر شہر بسائے' دریاؤں کے دل چیرے' ساحلوں کے ساتھ تاریخی عمارتیں تعمیر کیں' نت نئے تمدن پیدا کئے اور علوم وفنون اور ہنر کاری سے بیش قیمت تہذیبی ورثوں کو وجود بخشا۔

لیّہ بھی قدیم انسانی تاریخ کا ایسا ہی حصہ ہے جو ہر دور میں زندہ اور تابندہ رہا اور آج بھی زندگی سے بھرپور ہے۔ محبتوں اور خلوص کی یہ سرزمین' وفاداری اور وسیع المشربی کا افسانوی علاقہ ہے جہاں کی شاعری میں چھپی۔ ہجر و وصال کی داستانوں میں کونجوں کی دل گداز صدائیں اور کرلاہٹیں، حسن و جمال میں قلوپطرہ کے خدوخال اور ذہانت میں فکرِ یونان کی مہکار شامل ہے۔ یہاں کی موسیقی سے دلوں کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور یہاں کی ثقافت مانگے کی نہیں بلکہ مقامی سرمایہ ہے۔

قدیم دور میں سلطان حسن لنگاہ ملتان کے حاکم تھے۔ انہوں نے کچھ علاقے مقامی بلوچ قبائل کو دے دیے تھے۔ لیّہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مطابق میرانی بلوچ خاندان نے اس علاقے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ اسی خاندان کے کمال خان میرانی نے ۱۵۵۰ء میں شہر لیّہ کو آباد کیا' لیکن یہ شہر کمال خان کے نام سے منسوب نہ ہو سکا بلکہ اس علاقے کی مخصوص نباتات ''لئیاں'' کی مناسبت اور اس کے یہاں کثرت سے استعمال کے باعث اس شہر کا نام لیّہ پڑ گیا۔ لیّہ نے راجہ داہر' محمد بن

قاسم' بلوچ قبائل' احمد شاہ ابدالی' رنجیت سنگھ اور برطانوی سامراج کا دور دیکھا ہے اور پھر تحریک پاکستان میں بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔

لیّہ کے شمال میں ضلع میانوالی اور بھکر' جنوب میں ضلع مظفر گڑھ اور کوٹ ادو کے صنعتی شہر' مشرق میں جھنگ اور مغرب میں ڈیرہ غازی خان اور فورٹ منرو سے گھرا ہوا ہے۔ ضلع لیّہ میں لیّہ شہر، کروڑ اور چوبارہ شامل ہیں۔ لیّہ کو ضلعی حیثیت بہت پہلے برطانوی عہد میں بھی دی گئی تھی۔ اس وقت اس ضلع میں میانوالی اور خوشاب کے علاقے بھی شامل تھے۔ بعد میں اس کی ضلعی حیثیت ختم کر دی گئی۔ 1982ء میں لیّہ کو دوبارہ ضلع بنا دیا گیا۔ ضلع کا کل رقبہ ۲۴۲۸ مربع میل ہے۔ ضلع کی آبادی ساڑھے آٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے جبکہ شہر کی آبادی کم از کم تین لاکھ ہے۔

لیّہ ڈیرہ غازی خان سے ۱۳۲ کلومیٹر' ملتان سے ۱۷۷ کلومیٹر اور لاہور سے براستہ جھنگ ۳۷۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیّہ سے بسوں اور ویگنوں کے ذریعہ ملتان' ڈیرہ غازی خان' کروڑ' چوک اعظم' کوٹ سلطان کے لئے ہر وقت سفر کیا جا سکتا ہے۔ بسوں کا اڈہ شہر سے تین کلو میٹر دور ہے جبکہ ویگنوں کے اڈے شہر کے قلب میں واقع ہیں۔ لیّہ ریلوے اسٹیشن شہر کے مرکز میں واقع ہے۔ ریلوے لائن شہر کے درمیان سے گزرتی ہے اور شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ ریلوے لائن کی مغربی سمت قدیم لیّہ اور مشرقی جانب جدید لیّہ آباد ہے۔ شہر کے اندر آمد و رفت کے لئے تانگے' رکشے اور ڈالے استعمال ہوتے ہیں۔ شہر سے نزدیک ترین ہوائی اڈہ ملتان کا ہے۔

ضلع لیّہ کا زیادہ حصہ ریتلا ہے جسے تھل کہتے ہیں۔ اس کا بڑا حصہ غیر آباد ہے۔ بقیہ حصہ نشیبی دریائی میدان پر مشتمل ہے جہاں فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ لیّہ میں ایک ہی نہر ہے جو ''تھل نہر'' کہلاتی ہے۔ اس نہر کے ذریعے پانی مختلف علاقوں میں پہنچایا گیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لیّہ والے دوسرے پیشوں کے مقابلے میں زراعت کو اپنانا زیادہ پسند کرتے ہیں، یوں تو بہت سے شہری سرکاری اداروں' شکر کے کارخانوں اور تجارت کے پیشے سے بھی وابستہ ہیں۔ مرغبانی' ماہی پروری' دنبہ پروری اور بھیڑ بکریوں کی افزائش کے کاروبار میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ تھل نہر ضلع میانوالی میں کالا باغ کے مقام پر دریائے سندھ سے نکالی گئی ہے۔ یہ نہر سارا سال رواں رہتی ہے۔ تازہ اطلاع کے مطابق مزید ایک نہر ''گریٹر تھل'' کے نام سے نکالی جا رہی ہے

جومیانوالی' بھکر سے ہوتی ہوئی نواں کوٹ کے راستے ضلع لیّہ میں داخل ہو گی۔

لیّہ میں پہلے درختوں کی کمی تھی۔ اب یہ صورت نہیں ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گرم و خشک ہے۔ موسم گرما میں تند و تیز آندھیاں چلتی ہیں۔ بارش یوں تو بہت کم ہوتی ہے لیکن جب ہوتی ہے تو جل تھل ایک ہو جاتا ہے۔ فروری تا اپریل موسم بہار رہتا ہے۔ یہ کسانوں کے میلوں اور شادی بیاہ کے لئے مخصوص موسم ہے۔ لیّہ کے نہری علاقوں میں آم' مالٹا' کینو اور لیموں کے باغات ہیں۔ آم اور کھجوریں یہاں کی خاص سوغات ہیں۔ اجناس میں گندم' گوار' چنا' گنا' کپاس اور سبزیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔

لیّہ میں طلباء و طالبات کے متعدد تعلیمی ادارے علم کی جوت جگائے ہوئے ہیں ان تعلیمی اداروں میں گورنمنٹ ماڈل اسکول' گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج' کمرشل کالج' پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کی جدید عمارتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ لیّہ اسکول میں انگریزی ذریعہ تعلیم رائج ہے۔ طالبات کے ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہیں۔ مجموعی طور پر شہر میں پچاس ساٹھ ہزار طلباء و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ گزشتہ برس لیّہ گریجویٹ کالج میں ایم اے بلاک تقریباً ۴۰ لاکھ روپے کی لاگت سے مکمل ہوا ہے۔ یہاں ایم اے انگریزی کی کلاسیں جاری اور ایم اے اردو کی کلاسوں کا جلد آغاز ہونے والا ہے۔

تشنگان علم کے لئے کتب خانہ اشرفیہ' کتب خانہ مدرسہ العلوم' علامہ اقبال میموریل لائبریری' ڈاکٹر ذوالفقار علی لائبریری' شمع لائبریری' کتب خانہ مدرسہ نعمانیہ' لیکھی لائبریری، الرائد سینٹر اور بلدیہ لائبریری چشم براہ رہتے ہیں۔

لیّہ کے مقامی اخبارات میں روزنامہ داور' نوائے حق' پاسبانِ تھل اور ہفت روزہ صبح پاکستان قابل ذکر ہیں۔ لیّہ کلب ان دنوں زیر تعمیر ہے۔ لیّہ میں طباعت کی سہولتیں بہت کم ہیں توقع ہے کہ عنقریب یہ کمی بھی دور ہو جائے گی۔

لیّہ علمی اور ادبی اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جو آج کل نہرو یونیورسٹی دہلی میں صدر شعبہ زبان اردو ہیں۔ لیّہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے لائق طالب علم رہ چکے ہیں۔ معروف ماہر تعلیم عبداللہ نیاز مرحوم اور ڈاکٹر مہر عبدالحق بھی لیّہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ الٰہی بخش سرائی لیّہ کی تاریخ پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کے پاس پانچ ہزار برس قدیم نوادرات کا عظیم

خزانہ موجود ہے۔ ایک نوجوان مؤلف نور محمد نے اولیائے لیّہ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ آج کل وہ لیّہ کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ قومی کرکٹ ٹیم کے مشہور کھلاڑی عامر ملک اور بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکارہ ریشماں کا تعلق بھی لیّہ سے ہے۔

صنعتی میدان میں بھی لیّہ اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں لیّہ شوگر ملز کے نام سے شکر سازی کا ایک بڑا قدیم کارخانہ قائم ہے۔ کپاس بیلنے کے تین کارخانے اور گتہ بنانے کی ایک فیکٹری بھی کام کر رہی ہے۔ قالین بانی' دریاں اور کھیس بنانے کے ادارے بھی سرگرم عمل ہیں۔ لیّہ ابتدا ہی سے دستکاری اور ہاتھی دانت کی صنعت کے سلسلے میں مشہور ہے۔ یہاں بننے والی کھجور کے پتوں کی مصنوعات مثلاً ٹوکریاں' بان' جائے نماز' چٹائیاں اور دستی پنکھے لیّہ کی خصوصی سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیّہ ٹیکسٹائل ملز کا منصوبہ زیر غور ہے۔

امراض کے خلاف جدوجہد میں ضلعی سطح پر ہسپتال بھرپور انداز میں حصہ لے رہا ہے۔ دیہی ہیلتھ سنٹر بھی قائم ہیں۔ ضلع بھر میں نجی ڈاکٹروں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔

لیّہ کے شہری خوش شکل' صحت مند' وجیہہ' خوش لباس اور ملنسار ہوتے ہیں۔ دھوتی یا شلوار پسند کرتے ہیں۔ تاہم بہت سے شہری پتلون قمیص کو ترجیح دیتے ہیں۔ شہر میں سرائیکی' ملتانی' پنجابی اور اردو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بروہی' سندھی اور بلوچی زبانیں بولنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ لیّہ کے شہری جدید رہن سہن کے مقابلے میں روایتی طرز زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہاں عام پاکستانی کھانوں کے علاوہ ''سجی'' اور ثوبت بہت مقبول ہیں۔ سجی دنبہ کی ران سے تیار ہوتی ہے جبکہ لذیز شوربے میں نان بھگو کر کھایا جائے تو ''ثوبت'' کہلاتا ہے۔ یہاں کے لوگ مذہبی رجحانات کے حامل ہیں شہر کی مساجد پانچوں نمازوں کے اوقات میں آباد دکھائی دیتی ہیں۔ شہر کی اہم مساجد میں مسجد کرنال والی' نوری مسجد' مسجد قادر آباد' مسجد اللہ والی' مسجد شیخاں والی' جامع مسجد مدینۃ العلوم قدیمی امامیہ مسجد شامل ہیں۔

لیّہ شہر کا طرز تعمیر قدیم و جدید عمارتوں سے عبارت ہے۔ چھوٹی اینٹوں کے قدیم انداز کے مکانات کی تعداد خاصی ہے جو قیام پاکستان کے قبل کے طرز تعمیر کے عکاس ہیں۔ تاہم جدید قسم کے مکانات بھی بنائے گئے ہیں۔ شہر کے مشہور محلوں میں بیلے والا' جکھڑ والا' بستی بھونگ' شیخاں والہ' قاضی والا' گڑیانوی والا، سرائی محلہ، محلہ کربلا، محلہ شاہ لطیف شامل ہیں۔ جدید آبادیوں میں

ہاؤسنگ کالونی (فیز نمبر ۲) ٹی ڈی اے کالونی منظور آباد' حافظ آباد' رحمٰن آباد' جناح کالونی' پانچ مرحلہ سکیم' آفیسرز کالونی قابل ذکر ہیں۔

شہروں کی رونق ان کے بازاروں کے دم سے ہوتی ہے۔لیہ شہر کو بھی رونق بخشنے میں یہاں کے بازاروں کا بڑا عمل دخل ہے۔شہر کے مرکز کو چوبارہ روڈ ملاتی ہے۔ملک کے تمام بڑے بینکوں کی شاخیں اور اہم کاروباری مراکز اسی سڑک پر واقع ہیں۔چوبارہ روڈ سے متصل ایک بازار ہے جسے صدر بازار کہا جاتا ہے۔اس میں کپڑے، برتنوں' مٹھائیوں' مشروبات' میوے' سبزیوں' اور کریانہ کی دکانیں ہیں۔صدر بازار سے کئی دوسرے چھوٹے بازاروں کے راستے نکلتے ہیں۔ان میں موتی بازار' بمبئی بازار' شمالی دروازہ بازار' صرافہ بازار شامل ہیں۔چوک قصاباں' کپڑا رنگنے والوں کی وجہ سے مشہور ہے۔صدر بازار میں دھوپ سے بچاؤ کے لئے سائبان تعمیر کیا گیا ہے۔صدر بازار مرکزی کاروبار کے لئے مخصوص ہے۔عید گاہ چوک میں آفتاب شاہ مارکیٹ' ہاؤسنگ کالونی شاپنگ سنٹر اور علی مارکیٹ شہر کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہیں۔

شہر کی قدیم عمارتوں میں سرائے گابا' سکھے والا برج' گورنمنٹ ایم سی ہائی سکول قابل ذکر ہیں جبکہ جدید عمارتوں میں گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول' گورنمنٹ پوسٹ گریجوٹ کالج' خواتین کا انٹر کالج' پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ' کمرشل کالج' ڈی سی کمپلیکس (جہاں ضلعی دفاتر واقع ہیں) جنرل پوسٹ آفس اور کنال گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس بھی اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

لیہ کے شہری عوامی کھیلوں کے شوقین ہیں۔ان میں اونٹ' ریچھ اور کتوں کی لڑائی' خرگوش اور کتوں کی دوڑ' مرغ بازی' تیتر بازی اور بٹیر بازی زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔بیلوں کے سالانہ میلے منعقد ہوتے ہیں۔کبڈی یہاں کا مقبول کھیل ہے۔تاہم ہاکی' کرکٹ' ٹینس' فٹ بال' والی بال نیز درون خانہ کھیل مثلاً بلیرڈ' کیرم وغیرہ بھی رائج ہیں۔فیصل تحسین پارک اور ویرا سٹیڈیم عوامی کھیلوں کے لئے مخصوص ہے۔ویرا سٹیڈیم مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی مرحوم نے اس وقت تعمیر کروایا تھا جب وہ یہاں ایس ڈی ایم تھے۔اس سٹیڈیم کو ان کی اہلیہ ''ویرا'' کے نام سے منسوب کیا گیا۔ویرا سٹیڈیم میں ضلع کی سطح کے سالانہ اولمپک ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں جو ہفتوں جاری رہتے ہیں۔ان کے علاوہ اگست اور ستمبر میں کرکٹ اور فٹ بال کے فلڈ لائٹ ٹورنامنٹ (رات میں کھیلے جانے والے کھیل) منعقد ہوتے ہیں جن میں ملک بھر سے آنے والی ٹیمیں

حصہ لیتی ہیں۔

موسم گرما میں لیہ کے زندہ دل شہری پکنک منانے کے لیے لیہ سے بیس کلومیٹر دور مشرق میں ٹیل انڈس جاتے ہیں۔ٹیل انڈس یعنی دریائے سندھ کی دم یا آخری حصہ' دراصل لیہ نہر کی ایک شاخ ہے جو شمال کی سمت ہیڈ تا تار سے نکلتی ہے۔بارہ فٹ چوڑی اور آٹھ یا نو فٹ گہری یہ نہر پکنک کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہے۔نوجوانوں کی بڑی تعداد آم' دیگر لوازمات اور موسیقی کے سامان کے ساتھ ٹیل انڈس جاتی ہے۔سرسبز درختوں تلے تفریح مناتی ہے اور پیرا کی سے لطف اندوز ہوتی ہے اس پورے عمل کو سرائیکی زبان میں ''سانونی'' کہتے ہیں۔شہر میں سینما گھروں کی تعداد تین ہے۔

لیہ کو پہلی بار دیکھنے کے بعد دو قسم کے تاثر ابھرتے ہیں۔پہلا تاثر تو یہ ہے کہ لیہ پنجاب اور سندھ کی سرحد پر واقع ہے اور قدیم تاریخی اعتبار سے تین سو اقوام کا سنگم ہے۔چنانچہ ان کی لسانی اور ثقافتی زندگی کا مظہر ہے۔دوسرے یہ کہ یہ شہر اردو' پنجابی' بلوچی بولنے والوں اور وزیرستانی اور سرحد کے آبادکاروں کی وجہ سے مخلوط زندگی کے بھرپور اثرات لئے ہوئے ہے۔یہاں آج بھی اونٹوں پر بیٹھ کر چلنے والی باراتیں قدیم ثقافتی ورثہ کی علامت ہیں۔ساتھ ہی چمکتی دمکتی کاریں' رکشے اور دیگر جدید وسائل لیہ میں بڑے شہروں سے دوری یا پسماندگی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔خصوصاً گرمیوں میں لیہ رات بھر برقی روشنیوں میں دمکتا دکھائی دیتا ہے۔جگہ جگہ نوجوانوں کی ہنستی بولتی ٹولیاں' خوش گپیوں اور خورد و نوش میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔گویا لیہ دن سے زیادہ رات کو پر رونق ہو جاتا ہے۔

یہاں جدید موسیقی کے مقابلے میں لوک داستانوں پر مبنی سندھی اور سرائیکی گیتوں کی تانیں زیادہ سنائی دیتی ہیں۔رات گئے جب شہر کی رونقیں ماند پڑنے لگتی ہیں تو شب کی تاریکی شہر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور پھر جب اذان سحر کے بعد صحرا کی خنک ہوا چلنے لگتی ہے تو آلودگی سے پاک یہ ہوا ذہنوں میں آسودگی اور روحوں میں سرشاری کی کیفیت پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

لیّہ۔ تاریخ کی روشنی میں

حکیم فقیر میاں الٰہی بخش سرائی لیکھی

واقعات لیہ سپرد قلم کرتے وقت نگاہ ان گھرانوں پر جا لگی جن کا ماضی درخشندہ تھا۔ تاریخ نے جن کے حالات کو سینے سے لگایا ہوا ہے اور ان کے عدل وانصاف رواداری، ایثار وقربانی اور جاہ وجلال کے گن گاتی نظر آرہی ہے لیکن افسوس کہ خود انہوں نے اپنی خاندانی روایات اور بزرگوں کے کردار واطوار چھوڑ دیے۔

انصاف نہ ہو کہ واقعات لیہ پیش کرتے ہوئے میرانی بلوچوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ۱۴۸۰ء سے اس خاندان کی تاریخ شروع ہوتی ہے جبکہ سہراب خان رئیس سلطان حسین لنگاہ حاکم ملتان کے دربار میں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے بلوچ قوت وشجاعت میں شمشیر زنی اور تیر اندازی میں یکتائے روزگار تھے۔ حاکم مذکور نے سہراب خان کے آدمیوں کو دریا کے علاقہ دین کوٹ سے حدود کروڑ تک عطا کیا۔ سہراب خان کے ساتھیوں میں سے حاجی خان نامی ایک باہمت بلوچ نے ڈیرہ جات کا زریں حصہ لیا اور ڈیرہ غازیخان کی بنیاد رکھی پھر حاجی خان کے بیٹے غازیخان نے اس کو وسیع اور فراخ کر کے اپنے نام پر موسوم کیا۔ غازی خان کے اقتدار میں سیتان کیچ، مکران اور کوہ سلیمان سے بہت سے بلوچی قبائل ڈیرہ غازیخان کے علاقہ میں آباد ہوئے اور انہوں نے پرانے باشندوں کو نکال دیا یہاں تک بس نہ کی بلکہ شمالی سندھ کے علاقے سے ناہڑ قوم کو بھی نکال دیا۔ جسے یہ علاقہ بہلول لودھی حاکم دہلی نے جاگیر میں دیا تھا۔ یہ قوم بھی پٹھانوں کی ایک شاخ تھی۔ مسٹر فرائیر صاحب کا خیال ہے کہ غازیخان اول ۱۴۹۴ء میں فوت ہوا۔ اس خاندان کے بااقتدار رکن بستیاں بسانے کے شائق رہے غازیخان ہی نے کینجھر آباد کیا۔ حاجی پور، سنگھڑ، سنجر

آباد، موضع عالم خان، کوٹ داود، موضع گدائی انہی کے آباد کردہ ہیں۔ پیر عادل شاہ کا مقبرہ غازیخان ثانی کے شوق تعمیر وعقیدت سادات کا اب تک نمایاں نشان ہے۔ جس پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا اور عرصہ چار سال میں مکمل ہوا تھا۔ چاکر خان کے زمانہ تک اس خاندان کا اقبال عروج پر رہا۔ اس کی وفات کے بعد میرانیوں کا اقتدار برابر گھٹتا گیا۔ چاکر خاں کا جانشین کمال خاں ہوا۔ اس کے تمام بیٹوں کے مقبوضات دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر رہ گئے تھے۔ نئی بستیاں آباد کرنے میں انہوں نے بھی حصہ لیا۔ کمال خان میرانی نے ۱۵۵۰ء میں لیہ آباد کیا۔ جس کے آباد ہونے کی تاریخ اس شعر سے عیاں ہے:

"اگر تو ماہی تماش"
انندک بشمرا بچہ باستی

سلطان خان نے کوٹ سلطان اور ادو خان نے کوٹ ادو شہر بسائے۔

لیہ کمال خان کے نام سے اس وجہ سے مشہور نہ ہوا کہ جہاں یہ شہر ابتدا میں بسایا گیا تھا، اس سے قبل یہ دریائے سندھ کی گزرگاہ اور اسی دریا کا بُھنگ تھا۔ شہادت کے لئے ریلوے لائن کے مشرقی جانب بستی بُھنگ موجود ہے، چونکہ لیاں کاٹ کر یہ شہر آباد کیا گیا تھا، لہٰذا اس کا نام لیہ مشہور ہوا بہر حال میرانیوں کا عہد حکومت امن اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ اس میں بہت ترقی ہوئی۔ ان لوگوں نے کئی نہریں بھی جاری کیں حملہ نادر شاہ کے زمانہ تک ان لوگوں سے کسی بادشاہ نے تعرض نہ کیا البتہ اورنگ زیب کے اخیر عہد حکومت میں یہ باغی ہو گئے تھے۔ اسی زمانہ میں سرائی شمالی سندھ میں حکومت قائم کر رہے تھے اور ان کی دلی آرزو تھی کہ کسی طرح میرانیوں کو جڑ سے اکھاڑ دیں۔ لیکن ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے اس علاقہ کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور میرانیوں کو ناظم مقرر کر دیا۔ احمد شاہ درانی بھی اس طریق پر قائم رہا۔ اس لئے میرانی بدستور برسر اقتدار رہے۔ یہاں تک کہ میرانیوں سے یہ علاقہ جسکانیوں نے چھین لیا اور وہ لیہ پر ۱۷۸۷ء تک قابض رہے۔ اس کے بعد سرائیوں کا دور آیا۔ سرائی درحقیقت مہدوی فقیر تھے۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے جب اکبر اعظم کے حکم سے سندھ پر حملہ کیا تو تعلقہ ڈگری سے اس کا گزر ہوا۔ یہاں آدم شاہ نے ہٹڑی کے مقام پر مہدی فرقہ (باطنیہ) کا دائرہ کھول رکھا تھا۔ سب سے پہلے مرزا مذکور نے فقیروں کے لنگر کے لئے چانڈکہ کا زرخیز پرگنہ میاں آدم شاہ کے سپرد کیا سرائی لوگ سلسلہ وار ترقی

کرنے لگے۔تاریخ کلہوڑا کا بیان ہے۔

التماس خاں بروہی بھی اپنی جمعیت کے ہمراہ آیا۔اُس نے قیصر پنوار سے علاقہ چھین لیا۔
پھر فتح خان بھی التماس خان سرائیوں کی جمعیت کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور واپس چلا
گیا۔کنڈیارو کینجر اس کے بعد سرائی کینجھر ' شکار پور کھاری یار در پر قابض ہو گئے بعد ازاں ملک اللہ
بخش سے لاڑکانہ چھین لیا۔جنت السندھ اور تاریخ کلہوڑا میں مرقوم ہے کہ اس سے قبل شہزادہ جو
عالمگیر اعظم کا پوتا اور لاہور و ملتان کا صوبہ دار تھا' سرائیوں نے اس کی شاہی فوج کو شکست دی
تھی۔گو شاہی فوج تعداد ساز و سامان جنگ میں بہت زیادہ تھی اور اس کے برعکس سرائی درویشوں
کے پاس مادی وسائل نہ تھے' لیکن وہ بلا کے بہادر و جانثار تھے۔میدان جنگ میں سر کٹانے کو
سب سے اعلیٰ شہادت سمجھتے تھے۔ان میں پہاڑوں کی طرح استقامت اور دریاؤں کی طغیانی کا
ساز و رتھا۔شاہی فوج کا امیر شیخ جہاں قتل ہو گیا۔اللہ یار خاں حاکم بھکر میدان سے بھاگ نکلا۔
شاہی لشکر درویشوں کے مقابلے میں ریت کے ذرے کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گیا۔تاریخ سندھ میں
مرقوم ہے میاں راجہ لکھی سرائی کی قوت اُس زمانے میں بہت زیادہ تھی۔

بہت سے علاقہ جات فتح ہوئے۔آخر کار وقت کی نزاکت سے مجبور ہو کر شہزادہ
محمد مُعِزّ الدین اور دربار دہلی نے سرائیوں کی حکومت کو تسلیم کیا۔ساتھ ہی حکومت کا شاہی فرمان
جاری کر دیا۔اس کے بعد بختاور خان کے مارے جانے کے بعد غازیخان ڈرڈری ملک اللہ بخش
اسلام خان نہر انتظام نہ کر سکے تو مجبوراً یہ علاقہ بھی سرائیوں کی حکومت میں شامل کر دینے کا حکم
دربار دہلی سے صادر ہوا۔کچھ عرصہ بعد سیستان بھی شہزادہ محمد مُعِزّ الدین نے سرائی حکومت میں
شامل کر دیا۔اس طرح سرائیوں نے بی اور گنجابہ کے دروں کی حفاظت کے لئے بڑی جمعیت نوکر
رکھی۔ان حالات کا بلوچی قبائل اور افغانوں پر بُرا اثر ہوا۔دربار قلات سے سمندر خاں بروہی نے
چڑھائی کی جو ناکام واپس ہوا۔

افغانوں نے ہنگامہ آرائی کی، یوسف خان کا بھائی گوہر اور پنجو افغانوں کے سردار مارے
گئے جنرل خان اور دولت خان نے امان مانگی۔یہاں تک کہ ۱۷۶۹ء میں سرائیوں نے ڈیرہ
غازی خان کو لے لیا۔آخر کار میاں عبدالنبی سرائی کے عہد حکومت میں سرائیوں پر زوال آیا اور ان
کا شیرازہ بکھر گیا۔تالپوروں نے سندھ میں علیحدہ حکومت قائم کر لی۔تیمور شاہ کابل نے عبدالنبی

سرائی کو لیہ کا گورنر مقرر کر دیا۔یہ علاقہ جسکانی بلوچوں کے قبضہ میں تھا۔محمد خان جسکانی سرائیوں
کے مقابلے کی تاب نہ لا کر شکست کھا کر علاقہ انورانہ کو بھاگ گیا۔

میاں عبدالنبی سرائی کی حکومت لیہ میں صرف تین سال رہی۔تیمور شاہ کابل کے فوت ہو
جانے کے بعد زمان شاہ کابل کا حاکم بنا۔اس نے قندھار کی مہم میں سرائیوں سے امداد طلب کی۔
اس جانب سے خاموشی برتی گئی تو حاکم مذکور نے محمد خاں سدوزئی کو گورنر بنا کر بھیج دیا۔یہ شخص
ملتان کے گورنر نواب مظفر خان کا بھتیجا تھا۔اسے اس علاقہ پر قبضہ کرنا تھا جو بغیر جنگ و جدل نہیں
ہو سکتا تھا۔میاں عبدالنبی سرائی کے بیٹے میاں عارف کلہوٹا و میاں راجہ لکھی نے لیہ کے قریب
شرقی جانب محمد خاں کی فوج کا مقابلہ کیا پٹھانوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ گئے۔کچھ فاصلہ تک
ان کا تعاقب کیا گیا۔واپسی پر پٹھانوں کا ڈیرہ و بنوں لوٹنے کے لئے جا رہے تھے۔مگر درمیان
میں ایک قطار قوم لبانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ان کے پاس چالیس پچاس بندوقیں تھیں۔ان لوگوں
نے اندھا دھند گولیاں چلا دیں۔

کپتان ہانگر ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۲ء تک اس کے بعد مسٹر سمن ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء تک ضلع
لیہ کا ڈپٹی کمشنر رہا۔بعد ازاں کپتان میکنل' کپتان بیکن' کپتان فنیڈل کپتان پرسن یکے بعد
دیگرے ۱۸۶۰ء تک ڈپٹی کمشنر رہے۔بعد کی تفصیل دستیاب نہ ہو سکی۔اس دور میں ضلع لیہ کی حدود
شمال میں، میانوالی اور جنوب میں موجودہ تحصیل کوٹ ادو تک تھی۔نیز ۱۸۷۳ء میں ضلع ڈیرہ غازی
خان کی تحصیل سنگھڑ بھی لیہ ضلع میں منتقل کر دی تھی۔جانب مشرق چوبارہ' نواں کوٹ نیز موج گڑھ
بھی حدود لیہ میں شامل تھے۔شہر کے جنوب مغرب میں جو شکستہ بنگلہ موجود ہے مسٹر سمن ڈپٹی کمشنر
نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔شہر کا مغربی نالہ ہزاری جس کا پل سکھوں کے زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔

ترقی میں تنزل ہے تنزل میں ترقی ہے
تماشہ دیکھ غافل ماہ نو کا، ماہ کامل کا

حالات نے ساتھ نہ دیا۔لیہ جو مدت تک کمشنری رہا' ماضی میں نمک کی بڑی منڈی تھا۔
کمشنری توڑ دی گئی۔صرف ضلع رہ گیا۔تقدیر نے پلٹا کھایا ضلع بھی نہ رہا تحصیل بنا کر ڈیرہ اسماعیل
خان کے ساتھ الحاق کر دیا۔حالات نے پھر کروٹ لی تو ڈیرہ اسماعیل خان سے الگ کر کے تحصیل
لیہ کو ضلع میانوالی میں شامل کر دیا گردش تقدیر کی تسلی نہ ہوئی میانوالی سے ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل

مقرر کردی جواب تک ہے اور انقلابی حالات کی زد سے اب بھی محفوظ نہیں۔ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ عرصہ ہوا اخبارات میں تذکرہ تھا لیہ کو ضلع بنا دیا جائے گا۔ نظر غور سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ملتان سے میانوالی تک کوئی اس قدر بارونق شہر نہیں ہے۔ کوٹ ادو اور بھکر کے درمیان واقع ہے۔

بڑی بے انصافی ہوگی کہ لیہ و مواضعات لیہ والے جناب سید مصطفیٰ صاحب زیدی سابق ایس۔ڈی۔ایم لیہ کے حق میں دستِ بہ دعا اور شکر گزار نہ رہیں جن کی سعی جمیلہ سے پل ہزاری کے غربی جانب ایک بڑا بند تیار ہوا جہاں انسانی زندگیاں کشمکش موت سے آزاد ہوئیں وہاں پل بھی گرنے سے بچ گیا۔ نیز ہزار ہا بندگان خدا کو ایک مستقل تکلیف سے نجات حاصل ہوئی۔ اب دریائے سندھ کی طغیانی کے موقعہ پر اس گزرگاہ سے معصوم بچے بھی با آسانی گذر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ویراسٹیڈیم کا بھی سنگ بنیاد رکھا۔ بڑے گوشت کا مذبح خانہ جو شہر کی پرانی تاریخی اور پر رونق تفریح گاہ یعنی پل ہزاری پر بنا ہوا تھا کو ہٹا کر شہر سے باہر منتقل کر دیا۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اب جناب کے چلے جانے کے بعد خدا جانے ان تعمیری کاموں میں کیوں رکاوٹ پیدا ہوئی کہ اب ویراسٹیڈیم کے تمام درخت اور پھول خشک ہو گئے گھاس اجڑ گیا ہے۔ ان کے بعد اس طرف کسی قسم کی توجہ نہیں دی گئی۔ بند بھی ابھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچا تھا کہ موصوف کا تبادلہ ہو گیا۔

لیہ......۳۲۷ ق م تا ۱۸۸۰ء

زبیر شفیع غوری

لیہ ضلع مظفر گڑھ کی ایک اہم تحصیل ہے۔ اگرچہ اب یہ سمٹ کر ایک سب ڈویژن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اگر ماضی کے پردے اٹھائے جائیں تو فوجی اعتبار سے ایک اہم مقام ہونے کی وجہ سے لیہ اس سے پہلے ضلع، کمشنری اور ایک زمانہ میں صوبہ رہ چکا ہے۔

لفظ ''لیہ'' کے اصل ماخذ کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن مقامی طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ ''لیاں'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جب اس شہر کی بنیاد رکھی گئی اس وقت یہ دریا کے کنارے پر تھا اور یہاں ''لیاں'' نام کی جھاڑیاں بڑی کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اُسی وجہ سے اس کا نام اس سے منسوب کیا گیا جو بگڑتے بگڑتے یا کہہ سکتے ہیں سنورتے سنورتے لیہ کی صورت اختیار کر گیا۔

ڈاکٹر راقب بلوچ نے اپنی ''تاریخ بلوچاں'' میں عجیب و غریب تحقیق اور دلائل دینے کے بعد کہا ہے کہ اس شہر کا نام حضرت نوح علیہ السلام کی زوجہ کے نام پر رکھا گیا جن کا نام لیہ تھا۔ یہ خیال بعید از قیاس ہے اور جو دلائل ڈاکٹر صاحب نے دیئے ہیں اُن پر کسی اور وقت قلم اٹھا کر ان کو آسانی کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے۔

لیہ کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز سولھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ جب ۱۵۵۰ء میں کمال خاں نے اس شہر کی بنیاد رکھی۔ اس وقت اسے غازی خان کی حکومت میں صوبہ کی حیثیت حاصل تھی اس زمانے کے متعلق تاریخ کی کڑیوں میں ربط مفقود ہے۔ سکندر اعظم کے زمانے کے مشہور سردار سائیرلیس و دریا کی دائیں جانب فوج کے ایک حصے کو ساتھ لیے دریا کے ساتھ ساتھ چلا۔

دریا اگرچہ اس جگہ سے دور بہتا تھا لیکن اس قسم کے نشانات ملتے ہیں جن سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ۳۲۷ ق م میں دریا تھل کے بالکل ساتھ بہتا تھا۔ گویا اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سکندر کی فوج اس علاقہ سے گزری۔

سکندر اعظم (۳۲۷ ق م) اور کمال خاں (۱۵۵۰ء) کے ادوار کی درمیانی کڑیاں ملانے کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ تھل میں سے درمیانی عرصہ سے متعلق آثار کو تلاش کرنا بڑا محنت طلب کام ہے۔ لیہ کی سیاسی تاریخ سے قبل میں یہاں آنے والے قبائل کے بارے میں کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ان لوگوں نے براہِ راست یہاں کی تاریخ پر اثرات مرتب کئے۔

یہ تمام علاقہ تقریباً باہر سے آنے والے قبائل کی وجہ سے آباد ہوا۔ جاٹ اور بلوچ وغیرہ جنوب کی طرف سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ تقریباً ۱۵ویں صدی کے شروع میں جاٹ قوم کے مختلف قبائل جن میں کھوکھر اور چینہ وغیرہ شامل تھے، ملتان اور بہاول پور کی طرف سے آئے اور آہستہ آہستہ میانوالی تک کی درمیانی وادی میں پھیل گئے۔ ان کے بعد یہاں بلوچ آئے۔ جنوب کی طرف سے آنے والی اس قوم کی زیادہ تر نوعیت فوجی طرز کی تھی وہ بڑے بڑے سرداروں کی قیادت میں یہاں آئے اور چھوٹی چھوٹی کئی لڑائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ تھل کلاں اور کوٹ سلطان کے تھل میں ان کی آبادی جاٹوں کی نسبت بہت کم تھی۔ لیکن کوٹ سلطان میں ان کی آبادی زیادہ تھی۔

تحصیل لیہ ۱۷۳۸ء تک، جب نادر شاہ نے یہاں حملہ کیا، مغل سلطنت کا حصہ رہی۔ اس کا زیادہ تر علاقہ غیر آباد تھا۔ ۱۷۳۹ء میں دریائے سندھ کا مغربی حصہ نادر شاہ نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ موت کے بعد یہ علاقہ احمد شاہ ابدالی کے زیرنگیں آگیا۔ احمد شاہ کی فوجوں نے ایک دفعہ پھر ۱۷۵۶ء میں پنجاب پر فوج کشی کی اور دوسرے علاقوں کے ساتھ اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی کے دورِ حکومت کے زیادہ تر دورانیہ میں اس علاقہ پر کابل کی حکومت کی طرف سے گورنر مقرر نہیں کئے گئے۔ یہ علاقہ جاٹ اور جسکانی سرداروں کے درمیان تقسیم رہا اور وہ ان علاقوں میں تقریباً خودمختار حیثیت رکھتے تھے لیکن آخری دور میں اس علاقہ میں گورنروں کا تقرر باقاعدہ طور پر کیا گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ضروری ہے کہ پندھرویں صدی عیسوی اور احمد شاہ ابدالی کے درمیانی دور کے بارے میں وضاحت کے ساتھ پڑھ لیں۔

تاریخ فرشتہ میں ابوالقاسم فرشتہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دریائے سندھ کے ساتھ بلوچ سردار آباد ہوئے اور یہ بات ایک فارسی دستاویز سے بھی ثابت ہوئی جس کا ترجمہ لیفٹیننٹ میکلگن نے کیا ہے۔ اس دستاویز کے مطابق ۸۷۴ھ بمطابق ۱۴۶۹ء میں سلطان حسین بن قطب الدین نے ملتان کی حکومت حاصل کر لی اور شور کوٹ، کوٹ کروڑ اور دین کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ملک سہراب خاں نے دودائی بلوچ کے بیٹے اسمٰعیل خان اور فتح خان کے ساتھ آکر سلطان حسین کی خدمت میں حاضری دی اور نوکری اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں پہاڑی ڈاکو سلطنت کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ سلطان نے سہراب خان کو خوش آمدید کہا اور قلعہ کروڑ سے لے کر قلعہ دین کوٹ تک اس کو عطا کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حاجی خاں اپنے بیٹے غازی خاں اور قبیلے کے لوگوں کے ساتھ ان کے پاس آیا اور شاہی نوکری اختیار کر لی۔ اس طرح سے سلطنت کا پہاڑی علاقہ محفوظ ہو گیا اور شاہی ریونیو میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اسی زمانہ میں ملک سہراب خاں نے اپنے بیٹے اسماعیل خاں کے نام پر ڈیرہ اسماعیل خاں اور ملک حاجی خاں نے اپنے بیٹے غازی خاں کے نام پر ڈیرہ غازیخان کی بنیاد رکھی۔

شیر شاہ سوری کے زمانہ میں بلوچ سرداروں کے متعلق ہم ایک بار پھر سنتے ہیں۔ جب ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری نے خوشاب اور بھیرہ کا دورہ کیا، اس وقت بلوچ سرداروں، غازی خان، اسماعیل خان اور فتح خان نے بھی حکومت ہند کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا۔ یہ لوگ اسی خاندان سے متعلق ہیں، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس وقت تک یہ لوگ خاصی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور علاقہ میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ گویا بلوچ اس علاقہ میں دو ممتاز خاندانوں کی قیادت میں آئے۔ خیال یہی کیا جاتا ہے کہ یہ اسماعیل خاں اور غازی خاں' دونوں خاندان دودائی بلوچ تھے۔ لیکن بعد میں یہ نام تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے اور مقامی تاریخ میں غازی خاں کے قبیلے کو میرانی بلوچ اور اسماعیل خان کے قبیلے کو ہوت بلوچ کہا جاتا ہے۔ ہوتوں نے ڈیرہ اسماعیل خان پر تقریباً ۱۷۷۰ء تک متواتر حکومت کی۔ ان کے آخری حکمران نصرت خاں کو احمد شاہ ابدالی نے برطرف کر دیا اور قیدی بنا کر کابل لے گیا۔

لیہ کا علاقہ غازی خاں حکومت میں شامل تھا۔ خیال ہے کہ آگے کا علاقہ اسماعیل خان کو عطا

کیا گیا تھا۔ ۱۵۵۰ء میں غازی خان کے چار بیٹوں نے کوٹ ادو' کوٹ سلطان' لیہ اور نوشہرہ کی بنیاد رکھی۔ کمال خاں جس نے لیہ کی بنیاد رکھی، سب سے بڑا تھا۔ غازی حکومت میں لیہ کو صوبہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مرکز سے دوری کی وجہ سے اس علاقہ کے دفاع پر خاطر خواہ توجہ نہ دی جاتی تھی۔ اس وجہ سے جسکانیوں کو طاقت پکڑنے کا موقع مل گیا اور داؤد خاں نے ایک ڈاکو کی حیثیت اختیار کر کے لیہ اور کروڑ کے درمیان جنگل کو مسکن بنا کر گشکوری کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا اور مصیبت کھڑی کر دی۔ یہ دور وہ تھا جب سلطنت دہلی کے تخت پر شہنشاہ اکبر رونق افروز تھا۔ اس نے ایک فوج ان کے خلاف بھیجی۔ جس نے ان لوگوں کا قلع قمع کر دیا۔ لیکن سترھویں صدی کے آغاز ہی میں یہ لوگ پھر اکٹھے ہو گئے۔ شہنشاہ کی طرف سے انہیں ایک خاص علاقہ گرانٹ کے طور پر عطا کر دیا گیا تھا اور اس طرح میرانیوں نے اپنا اثر ورسوخ اور قبضہ مکمل طور پر اس علاقہ پر کھو دیا۔ خیال ہے کہ ۱۶۲۰ء میں میرانی یہاں سے چلے گئے۔ بلوچوں کے سرکردہ خاندان مثلاً جسکانی' ملندارانی' کندرانی' سردانی اور ملیانی وغیرہ سب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بلوچ خاں کی اولاد میں سے ہیں۔ اس علاقہ پر ان کا قبضہ آخری دور تک رہا اور اس دوران میں انہیں اپنی بقاء کے لئے مختلف لڑائیاں بھی لڑنا پڑیں۔

دوسری طرف سندھ کے کلہوڑا حکمران اس علاقہ پر حکومت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اگرچہ سندھ بھی اس علاقے کا حصہ تھا جو کابل کے حکمرانوں نے دہلی کے حکمرانوں سے حاصل کیا تھا لیکن سندھ پر ان کی گرفت مضبوط نہیں تھی اور کلہوڑا خاندان تقریباً خودمختار ہی تھا۔ ریونیو بغیر لڑائی کے کابل کی حکومت کو ادا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ ڈیرہ غازی خاں کی حکومت پر اپنا حق ملکیت جتاتے اور حملے کرتے رہتے تھے۔ ۱۷۵۸ء میں نادر شاہ نے ایک فوج کوڑامل کی قیادت میں بھیجی۔ سندھی فوج نے آپس کے انتشار کے باعث شکست کھائی۔ ادھر ڈیرہ غازی خان میں میرانیوں میں بھی پھوٹ پڑ چکی تھی اور خاصی بڑی تعداد ڈیرہ غازی خان چھوڑ کر دوسری جگہوں پر آباد ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے ۱۷۶۹ء میں غلام شاہ کلہوڑا نے حملہ کیا اور میرانیوں کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ باقی ماندہ امراء کا عدم اعتماد دراصل میرانیوں کی شکست کا باعث بنا۔ غلام شاہ نے ۱۷۶۰ء میں ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن ۱۷۷۲ء میں انہیں تالپوروں سے شکست ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر وہ کابل کے حکمرانوں کے رحم وکرم پر آ پڑے اور انہیں ڈیرہ

غازیخان سے دستبردار ہونا پڑا۔ جہاں ان کی بڑی جاگیریں موجود تھیں اور اس کے بعد اسی وجہ سے انہیں کلہوڑا کی بجائے سرائی کہا جانے لگا۔ سرائی اس کے بعد ایک دفعہ پھر ایک بڑی فوج کے ہمراہ نئی ریاست کی بنیاد رکھنے کے لیے نکلے لیہ پر اس وقت جسکانیوں کی حکومت تھی جو اندرونی خلفشار کا شکار ہو چکی تھی۔ عبدالنبی سرائی جو کہ غلام شاہ کا بھائی تھا۔ اس علاقہ میں داخل ہوا اور شورش پسند سرگانیوں کے ساتھ مل کر اس نے ۱۷۸۹ء میں لیہ پر حملہ کر کے محمد خاں جسکانی کو شکست دی اور لیہ کی حکومت حاصل کر لی۔ اس طرح جسکانیوں کی حکومت اس علاقہ میں تقریباً دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ بالآخر ختم ہو گئی۔

عبدالنبی سرائی کی حکومت بھی تین سال سے زیادہ نہ چل سکی۔ اس کے خلاف شکایتیں بھیجی گئیں۔ جس میں اس کی سختی اور ظلم کے خلاف فریاد کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اس کی جگہ محمد خاں سدوزئی کو حکمران بنایا جائے جو کہ مظفر خان کا چچازاد بھائی تھا۔ نتیجتاً محمد خاں سدوزئی کو حکمران بنا دیا گیا مگر محمد خاں جانتا تھا کہ عبدالنبی سرائی سے معرکہ آرائی ہوئے بغیر قبضہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس کا مقابلہ عبدالنبی سرائی سے لیہ کے قریب ہوا۔ عبدالنبی کے حامی خوب لڑے اور محمد خاں کی فوج کو شکست کے آثار نظر آنے لگے مگر اُنہوں نے غداروں کی مدد سے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ راجہ فقیر لیکھی دوم اور اس کے ہمراہ سید بہت بے جگری سے لڑے مگر میدان جنگ میں کام آئے۔ شاہ عارف جو عبدالنبی سرائی کے بیٹے تھے' بھی اسی جنگ میں واصل بحق ہوئے وہ لڑائی کے روح رواں تھے ان کی وفات کے بعد سرائیوں نے حوصلے ہار دیئے۔ محمد خاں نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ ایک دن کے اندر اندر اپنے مال ومنال کو ساتھ لے کر اس علاقہ کو چھوڑ دیں۔

ادھر کابل میں تیمور شاہ ۱۷۹۳ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد زمان شاہ حکمران ہوا لیکن شہزادہ ہمایوں کے ساتھ تخت نشین کے مسئلہ پر جھگڑا ہوا ہمایوں کو شکست ہوئی اور وہ راہ فرار اختیار کر گیا۔ ہمایوں لیہ تک آیا۔ وہ ایک کنویں پر رکا جہاں اس نے گنوں کے عوض طلائی اشرفی عطاء کی۔ قدرتی طور پر وہاں اس امر پر ہیجان پیدا ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع نواب محمد خاں تک پہنچی جو اس وقت لیہ میں مقیم تھا۔ زمان شاہ نے ہمایوں کی گرفتاری کے لئے انعام واکرام کا اعلان کیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کے ساتھ نکلا۔ ہمایوں کا جوان لڑکا اسی لڑائی میں مارا گیا۔ ہمایوں کو قیدی بنا لیا گیا اور اس کی اطلاع زمان شاہ کو دی گئی اس کے جوابی احکامات کی تعمیل میں ہمایوں کی آنکھیں نکال

لی گئیں۔نواب محمد خاں کو ڈیرہ اسماعیل خان کی اضافی حکومت اور سر بلند کا خطاب دیا گیا۔ ہمایوں نے باقی زندگی قید میں گزاری۔

نواب محمد خاں نے ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی ۔اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر منکیرہ اور بھکر کو بنایا جس وقت تک زندہ رہا اس نے اپنی حکومت کی طرف کسی کو میلی نظروں سے نہ دیکھنے دیا۔اس زمانہ میں سکھ قوت پکڑ رہے تھے لیکن رنجیت سنگھ کو نواب کی زندگی میں اس کی سلطنت پر حملہ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

نواب محمد خاں کی وفات کے بعد معاملہ مختلف ہو گیا جب حافظ احمد خاں تخت پر بیٹھا۔ سکھوں نے پہلے تو لوٹ مار مچا کر اور کچھ قلعے قبضہ میں لے کر اسے خراج دینے پر مجبور کر دیا۔لیکن بعد میں، جیسا کہ ہوتا ہے' اس کی نیت خراب ہوگئی۔ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے ملتان پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۲۱ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب اس کا معاملہ بھی صاف کر دیا جائے۔آخری مقابلہ منکیرہ میں ہوا' نو' دس دن کے محاصرہ کے بعد سکھوں نے یہ قلعہ کچھ شرائط کے ساتھ فتح کر لیا۔نواب کو عزت کے ساتھ ڈیرہ کی طرف مال ومتاع ساتھ لے کر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

۱۸۳۷ء میں گورنر ملتان دیوان ساون مل جو ایک دور اندیش اور قابل گورنر تھا' کی زیر نگرانی زراعت کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اس کا پہلا بندوبست باقاعدہ طور پر کیا گیا۔اُدھر سکھوں کے تعلقات انگریزوں سے بھی کچھ اچھے نہ رہے تھے ہنگامے کا آغاز نواب کی موت سے ہوا اور انگریزوں نے ملتان پر حملہ کر دیا۔۲۲ جنوری ۱۸۴۹ء میں یہ قبضہ مکمل ہو گیا۔۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق ہوا اور اس طرح یہ سارا علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔لیہ میں بھی کوئی خاص لڑائی اس وقت نہ ہوئی۔جھڑپوں کے بعد انگریزوں کو اس علاقہ کا کنٹرول حاصل ہو گیا۔

لیہ کی حدود میں مختلف اوقات میں ردوبدل ہوتا رہا۔کرنل راس لیہ ڈویژن کا پہلا کمشنر تھا۔ جو کہ ۱۸۵۰ء میں یہاں متعین ہوا اور ستمبر ۱۸۵۷ء تک یہاں ہی رہا۔وہ اپنے مرنے تک یہاں رہا۔اس کی قبر مقامی انگریزوں کے قبرستان میں موجود ہے۔اگرچہ اب لوح مزار کے بھی نشانات نہیں ملتے۔میجر پولک نے بھی کچھ عرصہ قائم مقام کمشنر کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے بعد میجر براؤن اس کی جگہ آیا جو ۱۸۸۰ء تک یہاں رہا۔پرانا ضلع لیہ مندرجہ ذیل ڈپٹی کمشنر کے ماتحت رہا۔

۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۲ء Captain Hollings

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء Captain Foudal

۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۶ء Mr.Simson

۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۰ء Captain Parsons

۱۸۵۶ء Captain Mc Neile

۱۸۶۰ء لیفٹیننٹ سیموئل

۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۷ء Captain Bacon

جنگ چاہ ڈیڈو والہ

برکت اعوان

دریائے سندھ کے کنارے اور صحرائے تھل کے دہانے پر واقع لیہ صدیوں سے آباد ہے اور صحرائے تھل لیہ کے ہر ذرہ ریت کے نیچے ایک تاریخ دفن ہے۔

قرنوں سے آباد لیہ تھل طوفانِ نوحؑ کے بعد پہلے ''دریاؤں کی سرزمین'' رہا ہے پھر دلدلوں کی سرزمین اور پھر صحراؤں کی سرزمین قرار پایا ہے۔ بعض تذکرہ نویس تو اس سرزمین کو نوحؑ کے نافرمان بیٹے کی ماں ''لئی'' کا وطن مالوف قرار دیتے ہیں واللہ اعلم بالصّواب۔

چینی ترکستان کی ایک قدیم تاریخی قوم ''کشان'' جب وہاں کی ایک طاقتور قوم سے مغلوب ہو کر اور خوفزدہ ہو کر بھاگی تو اس کا ٹکراؤ ''ساکا'' قوم سے ہوا ہے اور یہ ساکا قوم صحرائے تھل کی حکمران قوم تھی۔ ''کشانوں'' نے ''ساکا قوم'' کو کوہ ہندوکش کے شمال کوہستانوں کی طرف دھکیل دیا اور خود ان علاقوں پر قابض ہو کر حکمران ہو گئی۔ یہ ۷۰ اق۔م کی بات ہے۔ پھر اس قوم میں کئی حکمران پیدا ہوئے۔ جن میں سے ۷۸ عیسوی میں راجہ ''اشوک'' اور ''کنشک'' کو بڑی شہرت ملی۔ یہ بدھ مت سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی راجہ ''اشوک'' اور ''کنشک'' کے سکے صحرائے تھل لیہ میں جگہ جگہ دفینوں کی شکل میں ملتے ہیں اور گوتم بدھ کی پتھر کی مورتیاں اور عام کچے گھڑوں کی ٹھیکریوں پر گوتم بدھ کی شباہتیں کندہ کی ہوئی ملی ہیں۔ بلکہ لیہ تھل کو اس وقت کے سنگتراشوں کی بستی کہا جاتا ہے جو گوتم بدھ کی تصویریں اور مورتیاں بنانے کے لئے مخصوص تھے۔ صحرائے تھل لیہ میں متعدد ایسی بستیاں برآمد ہوئی ہیں جو صرف سنگتراشی کے لئے مخصوص تھیں اور یہاں کے لوگ حضرت گوتم بدھ کی تصویریں بنانے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

۵۰۰ عیسوی میں صحرائے تھل پر رائے خاندان کی حکومت تھی اور یہ بھی بدھ مت کے پیروکار تھے۔ رائے خاندان کے ایک سو تیس سالہ دورِ حکمرانی میں صحرائے تھل میں بدھ مت زوال پذیر ہو گیا اور ہندو مت کو عروج ملتا رہا۔ آج بھی ہندو حکمرانوں کے قدیم سکے صحرائے تھل میں پھیلے ہوئے قدیم شہروں کے کھنڈرات سے بکثرت ملتے ہیں۔

صحرائے تھل کے جاٹ برہمنوں سے انتہائی تنگ چنانچہ ۶۲۲ عیسوی میں جب اسلام کی آواز ایران تک پہنچی تو صحرائے تھل کے جاٹ بھی نبی ﷺ آخرالزماں کی قدم بوسی کے لئے صحراؤں، دریاؤں اور پہاڑوں کو عبور کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدم بوسی کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے اور پھر ہمیشہ کے لئے وہاں کے ہو رہے اور پھر اسلام کے غازیوں، مجاہدوں اور فاتحین کے ساتھ صحرائے تھل کے ان جاٹوں کی نسلیں اپنے وطن مالوف کو لوٹ آئیں جو کبھی اسلام کی روشنی لینے کے لئے عرب کے صحراؤں کی طرف گئی تھیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ صحرائے تھل میں رہنے والی قوم مکسی بلوچ دراصل میوی کینس کی نسل ہیں۔ غرض تاریخ صحرائے تھل لیہ کو جب ہم صدیوں کی دھول ہٹا کر دیکھتے ہیں تو تاریخ کا طالب علم ورطہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ کہیں سکندر مقدونی یہاں تلوار لہراتا نظر آتا ہے تو کہیں مسلمان سلاطین کے گھوڑوں کی دھول اڑتی نظر آتی ہے۔ کہیں اور جابر حکمران اپنے قاہر لشکریوں کے ساتھ مخلوق خدا کو تہ تیغ کر رہے ہیں تو کہیں عادل اور رحم دل حکمران مخلوق خدا کی دل بستگی اور اصلاح احوال میں مصروف ہیں۔ غرضیکہ لیہ تھل اب بھی زمانے کی دست و برد میں ہے اور شکست و ریخت کا سلسلہ جاری ہے۔ صحرائے تھل لیہ اب بھی دلدلوں، صحراؤں اور دریاؤں کی سرزمین ہے۔ جس کے مشرق میں دریائے چناب اور مغرب میں عظیم دریائے سندھ بہتا ہے۔ صحرائے تھل لیہ اپنی روایات اور تہذیب و تمدن کا امین ہے۔ اسی عظیم صحرائے تھل میں نہ جانے کتنی تہذیبوں نے جنم لیا اور پھر فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ صحرائے تھل پر سرائیوں کی حکومت کے خاتمے اور سدوزئیوں کے سربراہ حکومت ہونے کا تاریخی واقعہ پیش خدمت ہے اور ''چاہ ڈیڈو والا'' اس تاریخی فیصلے کا میدان جنگ ہے۔ ملتان سے لیہ کی طرف بذریعہ ٹرین آئیں تو لیہ کے آؤٹر سگنل سے ذرا آگے مشرق کی طرف دیکھیں تو بالکل لائن کے قریب ''گھنی'' اور گنجان آبادی کے درمیان ایک بہت

بڑا (ڈھورا) گڑھا موجود ہے جو گندے پانی، سبز کائی اور سبز گھاس سے اٹا ہوا ہے اور اسی گڑھے
کے کنارے ایک سفید رنگ کی قبر موجود ہے۔ جو اس تاریخی جنگ کے ایک گمنام سید جرنیل کی قبر
ہے اور یہی "چاہ ڈیڈووالا" کا نواحی علاقہ ہے جو سرائیوں اور سدوزئیوں کا میدان جنگ ہے۔

لیہ پر میرانی بلوچوں نے مجموعی طور دو سو سینتیس برس مگر حسب ضابطہ قلعہ اور شہر لیہ کی تعمیر
کر کے ایک سو ساٹھ برس حکومت کی ہے۔ تا آنکہ ان سے جسکانیوں نے حکومت بالجبر چھین کر
دین کوٹ، منکیرہ، لیہ، پتل منڈا اور محمود کوٹ پر قبضہ کر لیا اور تریسٹھ برس تک لیہ پر حکمرانی کرتے
رہے۔ جسکانیوں سے سرائیوں نے حکومت چھین لی مگر یہ صرف تین سال تک لیہ پر حکمرانی
کر سکے۔

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ سدوزئی پٹھانوں کے دو قبیلے "بہادر خیل" اور "مندو خیل"
حالات زمانہ کا شکار ہو کر مختلف سمتوں میں بٹ گئے۔ "مندو خیل" غزنی کی طرف چلے گئے جبکہ
"بہادر خیل" رنگ پور کھیڑیاں" میں آ کر محنت مزدوری اور ملازمت کرنے لگ گئے۔ رنگ پور
کھیڑیاں تھل کے عظیم صحرا اور دریائے چناب کے سنگم پر واقع ہے۔ غزنی میں رہنے والے
مندو خیل پٹھانوں کو کسی خاص خدمت کے صلہ میں ملتان کی حکومت غزنی کی طرف سے عطا
ہوئی۔ بہادر خیل پٹھان جو رنگ پور کھیڑیاں میں محنت مزدوری اور نوکری چاکری کرتے تھے کو
جب پتہ چلا کہ ان کے ہم قوم ملتان حکومت کی قسمت کے مالک بن گئے ہیں تو وہ رنگ پور
کھیڑیاں سے نقل مکانی کر کے ملتان پہنچ گئے۔ کچھ لوگ اپنے ہم قوم سدوزئی مندو خیل
پٹھانوں کے ملازم ہو گئے اور کچھ لوگ محنت مزدوری اور چھوٹا موٹا کام کرنے لگ گئے۔ رنگ
پور کھیڑیاں سے آنے والے بہادر خیل سدوزئی پٹھانوں میں "یارا خان" نامی ایک شخص کا
صرف ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام محمد خان تھا۔ یہ گھرانہ انتہائی غریب اور مفلس تھا۔ اچانک یارا
خان بیمار ہو کر ملتان میں فوت ہو گیا تو اس کے گھرانے کا تمام بوجھ اس کے نوجوان بیٹے محمد
خان بہادر خیل سدوزئی کے کاندھوں پر آ پڑا۔ گھر میں کوئی معقول اثاثہ نہ تھا۔ محمد خان سدوزئی
نے گھر کے تھوڑے بہت اثاثے بیچ کر پہلے تو بازار کے تھڑوں پر بیٹھ کر چھوٹی موٹی تجارت کی
مگر اس سے اسکے گھر کی گزر بسر نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس نے مجبور ہو کر بہاولپور کے نواب بہاول
خان کی فوج میں دس روپے ماہوار پر نوکری کر لی۔ مگر اتنی قلیل تنخواہ میں اس کو اور اس کے

خاندان کو پیٹ بھر کر روٹی مہیا نہ ہو سکی۔

چنانچہ وہ نواب بہاول خان کی فوج سے استعفیٰ دے کر نواب مظفر خان والی ملتان کی فوج
میں ایک سدوزئی کی سفارش پر بیس روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ سدوزئی پٹھان محمد خان سدوزئی
کی کامرانیوں کا یہ پہلا زینہ تھا۔ اس کے بعد محمد خان سدوزئی کے کلفت ایام چھٹنے لگے اور اس کی
بخت بیداریوں کا دور شروع ہو گیا۔ اس نوجوان پٹھان سے ایسے ایسے کام سرزد ہونے لگے کہ
والئی ملتان نواب مظفر خان سدوزئی نے بہت جلد اسے منصب دار کے عہدے پر ترقی دے کر اس
کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار کر دی۔ ان دنوں غزنی حکومت پر درانی شاہوں کا طنطنہ تھا۔ نواب مظفر
خان والئی ملتان ہر سال درانی شاہوں کو سلام کرنے کے لئے غزنی جاتا تھا۔ نواب مظفر خان شکل و
صورت اور قد و قامت کے لحاظ سے نہ تو خوش رو تھا اور نہ ہی پرکشش قامت کا مالک تھا جبکہ محمد
خان سدوزئی اس کا منصب دار انتہائی خوبرو دراز قامت وضع دار اور خوش گفتار تھا۔ ایک دفعہ
نواب مظفر خان جب ملتان سے غزنی کے حاکمان کو حسب دستور سلام کرنے گیا تو وہ اپنے ہمراہ
اپنے منصب دار ملازم محمد خان سدوزئی کو بھی لے گیا۔ غزنی کے دربار میں جب وہ داخل ہوا تو
تمام درباریوں نے خوش وضع اور خوش شکل محمد خان سدوزئی کو نواب مظفر خان والئی ملتان سمجھ کر
اس سے ہاتھ ملایا اور تعظیم دی۔ محمد خان سدوزئی خوش گفتار بھی تھا چنانچہ شہنشاہ درانی والئی غزنی
ملتان کے اس منصب دار محمد خان سدوزئی کی گفتگو سے نہ صرف محظوظ ہوا بلکہ اسے پسند کیا۔ نواب
مظفر خان والئی ملتان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک خوف اور وسوسہ پیدا ہوا کہ
کہیں شاہان افغان ملتان کی حکومت کی باگ دوڑ اپنے اس پسند کئے گئے نوجوان محمد خان سدوزئی
کے ہاتھ میں نہ دیں۔ چنانچہ اس سے اگلے سال جب نواب مظفر خان حسب دستور افغانستان
کے شاہ کو سلام کرنے گیا تو وہ اپنے منصب دار خوبرو نوجوان محمد خان سدوزئی کو ہمراہ نہ لے کر گیا۔

شاہ زمان والئی افغانستان نے نواب مظفر خان سے ان کے نوجوان منصب دار محمد خان کو
اپنے ہمراہ نہ لانے کا سبب پوچھا تو نواب مظفر خان نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ چنانچہ اسی وقت
کابل سے ایک آدمی بھیج کر محمد خان سدوزئی منصب دار کو بلوایا گیا۔ شاہ زمان محمد خان سدوزئی
سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ ان دنوں لیہ پر سرائیوں کی حکومت تھی اور ان کی یہ حکومت دین کوٹ
سے لے کر منکیرہ، بھکر، محمود کوٹ اور پتل منڈا تھل تک پھیلی ہوئی تھی مگر جسکانیوں سے مسلسل جنگ

وجدل اور میرانیوں کی بغاوتوں کی وجہ سے سرائیوں کی گرفت لیہ پر کمزور ہو رہی تھی۔ میاں عبدالنبی
سرائی کلہوڑہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا فضل علی خان شوقین مزاج ثابت ہوا تھا ان کا چھوٹا بیٹا
میاں محمد عارف بجائے حکمرانی کرنے کے، سرائی مسلک کی پیشوائی کر رہا تھا اور پورے صحرائے
تھل میں ان کے مسلک کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ سندھ میں کلہوڑا حکمرانوں کا ایک سلسلہ یا ایک
محکمہ ''فقراء'' کا تھا اور انھیں وہ اختیار حاصل تھا جو آج کے علاقہ مجسٹریٹ کو اختیار حاصل ہوتا ہے
اور ان فقراء میں معروف کردار فقیر تاجا لیکھی فقیر کا ہے۔ یہی لیکھی فقیر تاریخ میں سرائی کلہوڑوں
کے جرنیل اور ان کے مددگار بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ لیہ میں عبدالنبی کلہوڑہ کے فرزند میاں محمد
عارف شہید ﷫ کے ہمرکاب بھی ایک فقیر میاں راجہ لیکھی کا کردار بھی نمایاں نظر آتا ہے جو
جنگ چاہ ڈیڈو والا میں اپنے تین سو سرائیوں کے ہمراہ افغانوں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا نظر آتا
ہے اور چاہ ڈیڈو والا میں کام آیا۔ میاں عارف شہید کی نسل اور فقیر میاں راجہ لیکھی کی نسل اب
بھی محلہ عارف شہید ﷫ اور بڑے ڈاکخانہ کے بالمقابل میاں صاحبان کے کنبہ کے نام سے
مشہور ہے اور قیام پذیر ہے۔

لیہ میں میرانیوں کے دورِ حکومت میں ایک جاٹ قبیلہ ''جُونی'' وارد ہوا تھا جنھوں نے حاکم
شہر سے فصیل شہر سے باہر چاہ احداث کر کے کھیتی باڑی کی اجازت مانگی۔ یوں تو یہ ایک جاٹ قبیلہ
تھا مگر اس قبیلہ کے بڑے بوڑھے ''ملاں گیری'' یعنی مسجدوں میں نماز پڑھانے اور بچوں کو قرآن
پاک کی تعلیم دینے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ چنانچہ میرانی حاکم نے انھیں چاہ احداث کرنے
کی اجازت دے دی تھی اور یہ زمین اس نے انھیں بطور وظیفہ بخش دی۔ چنانچہ اب بھی لیہ شہر کے
مغرب میں چاہ وظیفی والہ اور شہر کے مشرقی سمت میں جُونیاں والہ جو بعد میں چاہ ڈیڈو والا کے نام
سے مشہور ہوا موجود ہیں۔ چاہ وظیفی والہ اور چاہ ڈیڈو والا میں اب بھی جونی قوم آباد ہے اور
دونوں چاہات پر اب گھنی آبادیاں ہو گئی ہیں۔ لیہ کی فصیل شہر سے کافی دور چاہ جُونیاں والہ پر کہیں
سے ایک درویش نے آ کر مستقل ڈیرہ لگا لیا تھا اور یہ درویش فقیر ''فقیر ڈیڈو'' کے نام سے مشہور
تھا۔ چنانچہ یہ کنواں بجائے ''جُونیاں والا'' کے چاہ ڈیڈو والا مشہور ہو گیا۔ ڈیڈو فقیر یہیں وفات پا
گیا۔ اس فقیر کی قبر مسجد جونیاں والا میں اب تک موجود ہے۔ چاہ ڈیڈو والا کے قریب سدوزئیوں
اور سرائیوں کی جنگ میں ایک گمنام سید جرنیل شہید ہو گئے تھے جنھیں وہیں دفن کر دیا گیا۔ اکثر

لوگ اس سید جرنیل کی قبر کو فقیر ڈیڈو کی قبر سمجھتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔
شاہ زمان والئی کابل لیہ کے حاکم میاں عبدالنبی سرائی سے رنجش رکھتا تھا۔ بعض تذکرہ
نگاروں نے لکھا ہے کہ میاں عبدالنبی کلہوڑہ کا بڑا بیٹا فضل علی خان بڑا فضول خرچ ہو گیا تھا اور
اپنے تمام علاقہ کی آمدنی جو تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپیہ سالانہ کی تھی اپنی فضول خرچیوں پر خرچ
کر دیتا تھا۔ اس کی شادی پر میاں عبدالنبی سرائی نے بہت زیادہ خرچ کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ
حکومت غزنی کو بروقت زرلگان نہیں دے سکا تھا۔ جبکہ بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ ہرات پر
حملہ کرنے کے لئے حکومت غزنی نے میاں عبدالنبی سے کمک مانگی تھی لیکن میاں عبدالنبی نے یہ
کمک نہ دی۔ جس کی وجہ سے شاہ زمان میاں عبدالنبی سے دل میں رنجش رکھتا تھا۔ چنانچہ شاہ
زمان والئی کابل نے متاثر ہو کر بطور عنایت اور بخشش کے لیہ اور منکیرہ کی حکومت کا پروانہ ملتان
کے خوبرو منصب دار محمد خان سدوزئی کے حوالے کیا اور نواب مظفر خان والئی ملتان کو اس کی امداد
کرنے اور قصبہ لیہ و بھکر دلانے کی تاکید کی۔ نواب مظفر خان کے دل سے ایک بڑا خدشہ دور ہو
گیا۔ چنانچہ نواب مظفر خان نے اپنی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ محمد خان سدوزئی کے حوالے کیا۔
چنانچہ افغانوں اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ محمد خان سدوزئی نے پہلے
لیہ کی حکومت کے قلعہ پتل منڈا پر حملہ کیا جو لیہ تھل کے صحراء میں واقع تھا اور یہ قلعہ اس نے پہلے ہی
حملے میں فتح کر لیا بعد ازاں قلعہ محمود کوٹ کو فتح کیا اور پھر اس کے لشکر نے کچھ دنوں کے بعد لیہ شہر
کی فصیل کے باہر چاہ ڈیڈو والہ کے ملحق ڈیرے ڈال دیئے۔ چنانچہ پہلے لیہ خالی کر دینے کا نام و
پیام ہوتا رہا لیکن میاں عبدالنبی سرائی نے بغیر جنگ کئے قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس
سے اگلے دن چاہ ''ڈیڈو والہ'' کے قریب گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں میاں عبدالنبی کی طرف
سے سندھیوں کی فوج اور مقامی لوگوں پر مشتمل فوج نے حصہ لیا جبکہ محمد خان کی فوج میں افغانیوں
کی فوج اور ملتان کی فوج نے حصہ لیا۔ صبح سورج نکلتے ہی گھمسان کی جنگ شروع ہوئی اور عصر تک
کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تیرہ سو آدمی محمد خان سدوزئی کے مارے گئے۔ جبکہ ساڑھے سات سو
آدمی میاں عبدالنبی کے کھیت رہے۔ عصر کے بعد محمد خان سدوزئی کی حملہ آور فوج میں پسپائی
شروع ہو گئی اور مغرب سے پہلے محمد خان سدوزئی کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ میاں عبدالنبی سرائی
جو کہ خود اس جنگ کے وقت ایک ساٹھ سالہ بوڑھا حکمران تھا۔ اس کے ہونہار نوجوان جنگجو

فقیر بیٹے میاں محمد عارف شہید نے محمد خان سدوزئی کی بھگوڑی فوج کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ رات ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیل گیا تھا۔ دُور صحرائی جنگل میں چند خانہ بدوش لبانہ قوم کے کچھ لوگ آگ جلائے بیٹھے تھے۔ میاں محمد عارف سرائی اور ان کے ساتھی ان لبانہ خانہ بدوشوں کو محمد خان سدوزئی کی بھگوڑی فوج کے افغان سپاہی سمجھے اور انھوں نے اپنے گھوڑے اس طرف سرپٹ دوڑا دیئے جبکہ لبانہ قوم کے خانہ بدوشوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی ڈاکو لوگ ہیں۔ جو انھیں لوٹنے کے لئے ان کی طرف آ رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کئی توڑے دار بندوقیں تان کر میاں محمد عارف سرائی اور ان کے ساتھیوں کی طرف داغ دیں۔ جس سے میاں محمد عارف اور ان کے ہمرکاب جرنیل راجہ لیکھی فقیر موقع پر شہید ہو گئے۔ دونوں سرائی مسلک کے پیشوا بھی تھے۔ میاں محمد عارف کے شہید ہونے کی خبر محمد خان سدوزئی اور ان کی بھگوڑی فوج کو بھی ہو گئی۔ چنانچہ موضع جال والہ کے قریب محمد خان سدوزئی کی فوج پھر یکجا ہوئی اور انھوں نے دوبارہ لیّہ شہر پر حملہ کر دیا اور چند گھنٹوں میں شہر کو فتح کر لیا۔ محمد خان سدوزئی کے افغان فوجیوں نے محمد عارف شہید کا سر اتارنے کی فرمائش کی مگر محمد خان سدوزئی نے سختی کے ساتھ اس بات سے منع کر دیا۔ میاں عبدالنبی سرائی اپنے نیک اطوار نوجوان بیٹے محمد عارف شہید رحمۃ اللہ علیہ کو دفن کر کے دوسرے دن بمعہ اہل و عیال اور مال و اسباب کشتیوں کے ذریعے سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں سے وہ بعد ازاں جودھپور کے راجہ بھیم سنگھ کے پاس چلا گیا۔ راجہ بھیم سنگھ نے انھیں زندگی گزارنے کے لئے جاگیر عطا کر دی۔ تاہم میاں عبدالنبی سرائی نے والئ کابل کو مسلسل عرضداشتیں بھیجیں کہ وہ انھیں لیّہ‘ بھکر اور منکیرہ کی مملکت دوبارہ دیں مگر والئ کابل نے ایسا نہ کیا بلکہ ان عرضداشتوں کے عوض انھیں علاقہ راجن پور میں ایک معقول جاگیر عطا کر دی جبکہ میاں عبدالنبی کا بڑا بیٹا فضل علی خان میر نصیر خان بلوچ والئ قلات کے پاس پہنچا کہ وہ ان کی امداد کریں تا کہ وہ لیّہ پر دوبارہ قبضہ کر سکیں۔ مگر میر نصیر خان والئ قلات نے معذوری کا اظہار کر کے فضل علی خان کو حاجی پور میں ایک جاگیر عطا کر دی جواب تک فضل علی خان کی اولاد کے پاس ہے اور وہ لوگ حاجی پور اور لیّہ میں رہتے ہیں۔ میاں عبدالنبی سرائی کی دوسری اولاد جودھپور میں رہتی تھی جو پاکستان بننے کے بعد پاکستان آ گئی اور وہ اس وقت میر پور سندھ کے علاقہ میں رہتی ہے۔ سندھ کے کلہوڑا سرائی لیّہ پر صرف تین سال حکومت کر سکے اور ان کے اقتدار کا سورج ڈوب گیا۔ چاہ ڈیڈو والہ کا میدان ان

کا آخری معرکہ جنگ تھا البتہ سرائی مسلک پورے صحرائے تھل کی پٹی میں پھیلا ہوا ہے اور لاکھوں عقیدت مند سرائی لوگ اب بھی میاں عارف شہید کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور مزار کے متولیوں کو نذر نیاز دیتے ہیں۔ محمد خان سدوزئی نے لیّہ کو فتح کرنے کے بعد کچھ سالوں تک لیّہ میں قیام کرنے کے بعد اس نے اپنی حکومت کا مرکز منکیرہ کو بنایا جہاں سے اس نے ڈیرہ اسماعیل خان اور گردونواح کا علاقہ فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تاہم چاہ ڈیڈو والا لیّہ کے آثار اب بھی موجود ہیں جو لیّہ میں ہوس و حکمرانی اور اقتدار کی ایک خوفناک جنگ کی یاد دلاتا رہے گا۔ جس میں نہ جانے کتنے خاندانوں کی زندگیوں کے چراغ گل ہو گئے اور کتنی صورتیں خاک میں پنہاں ہو کر ہمیشہ کے لئے سکوت ابدی میں گم ہو گئیں۔

جنگ واڑہ گشکوری

برکت اعوان

تاریخ لیہ سے ایک ورق کے حوالے سے آج وطن پرستی اور اسلام کے حوالے سے تھل کے مسلمان حریت پرستوں اور وفا سرشتوں کی ایک ایمان افروز جنگ' جنگ واڑہ گشکوری کے نام سے پیش خدمت ہے۔ جس میں صحرائے تھل کے چند غیور اور بہادر لوگوں کی داستان حریت قلمبند ہے جنھوں نے تعداد میں کم ہونے اور سامان حرب کی کمی کے باوجود انگریز جرنیل ایڈورڈ کی دو پلٹن فوج کے چھکے چھڑا دیئے، ان کا دلیرانہ انداز میں مقابلہ کیا اور انھیں دریائے سندھ کے اس پار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ایڈورڈ کی فوج کے ہزاروں سپاہی مر گئے اور سینکڑوں زخمی ہو کر دریائے سندھ کی لہروں کی نذر ہو گئے۔

صحرائے تھل لیہ میں واڑہ جہاں پیوند زدہ کپڑوں والے پاؤں سے ننگے سانولی صورتوں والے فرزندان اسلام رہائش رکھتے تھے۔ واڑہ گشکوری زمانہ قدیم میں جسکانی حکمرانوں کا پایہ تخت تھا۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ واڑہ گشکوری انتہائی بارونق اور آباد شہر تھا۔ یہاں کے لوگ انتہائی خوشحال لوگ تھے۔ امتداد زمانہ اور دریائے سندھ کی طغیانیوں نے اس شہر کو تو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا ہے جس کے اب کوئی بھی آثار و باقیات نہیں ہیں۔ تاہم یہ علاقہ اب بھی موضع واڑہ گشکوری کے نام سے موسوم ہے اور تاریخ میں یہی نام جسکانی حکمرانوں کی راجدھانی کا ہے۔ صحرائے تھل پر بہادر جنگجو جسکانیوں نے ایک سو ستر سال تک حکومت کی ہے اور انھوں نے اپنی بقاء کے لئے پنجاب اور دہلی کی فوجوں کے ساتھ ان ہی صحراؤں میں انتہائی خوفناک جنگیں لڑی ہیں۔ مڑھانوالی اور ہڈانوالی ان بہادر جنگجو جسکانیوں کی خون ریز جنگوں کی نشانیوں کے طور پر اب بھی

صحرائے تھل میں موجود ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ بالوچ (بلوچ) چاکر اعظم کی اولاد کی تیسری پشت میں سے ایک بلوچ سردار رند خان صحرائے تھل میں آ کر رہائش پذیر ہوا اور اس سردار کے ایک بہادر بیٹے داؤد خان نے واڑہ گشکوری شہر کی بنیاد رکھی اور اسے پایہ تخت بنایا۔ جسکت خان بلوچ کی اولاد ہونے کے ناطے سے یہ جسکانی بلوچ کہلاتے تھے۔ جسکانی حکمرانوں کا آخری فرمانروا محمد خان جسکانی تھا جو جلاوطنی کے عالم میں محمد اسد خان جسکانی کے ہاں پناہ گزیں ہوا، کسمپرسی کے عالم میں وہیں فوت ہو گیا اور ''منکروٹھہ'' میں دفن ہوا۔

۱۸۴۸ء میں انگریزوں کے خلاف جب یہ جنگ واڑہ گشکوری لڑی گئی، اس وقت اس علاقہ کو برباد ہوئے مدت ہو گئی تھی۔ اب اس علاقہ میں پیوند زدہ کپڑوں والے بھوک و افلاس کے مارے ہوئے فرزندانِ اسلام رہائش رکھتے تھے۔ ۱۸ اپریل ۱۸۴۸ء کو جب دیوان مولراج گورنر ملتان نے انگریزوں کو ملتان کی نظامت کا چارج دیا تو اس علاقے کے عوام کو انگریزوں کا حکومت لینے کا یہ انداز پسند نہ آیا چنانچہ انگریزوں کو پروٹوکول دینے کے لئے جو دستہ مقرر کیا گیا تھا اس کی قیادت صوبیدار الٰہی بخش کر رہے تھے کہ ایک حفاظتی کھائی کے قریب اس دستے کے ایک مسلمان سپاہی نے اچانک انگریز حاکم ایگنیو پر برچھی سے حملہ کر دیا مگر عجلت میں برچھی کا یہ وار اوچھا پڑا۔ اتنی دیر میں امیر چند نامی ایک گھڑ سوار دستے کے سپاہی نے اچانک انگریز ایگنیو کے شانے پر تلوار کا وار کیا مگر یہ وار بھی خالی گیا۔ اب گھڑ سوار دستے کے سپاہی نسیم خان اور کرم الٰہی نے بڑھ کر ایگنیو پر تلوار سے وار کرنا شروع کر دیئے چنانچہ ان ہی مسلمان سپاہیوں کی کسی ایک کی تلوار کا ایک وار انگریز ایگنیو کی آنکھ سے نیچے ناک کے قریب سے گوشت کو کاٹتا ہوا تھوڑی تک چلا گیا اور اس کا ٹھوڑی تک گوشت لٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ مسلمان سپاہی نسیم خان اور کرم الٰہی انگریز ایگنیو کا کام تمام کر دیتے انگریز ایگنیو نے اپنی جان بچانے کے لئے حفاظتی کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ اس طرح گھڑ سوار دستے کے یہ سپاہی دوسرے انگریز افسر اینڈرسن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اینڈرسن نے اس جگہ سے بھاگنے کی بڑی کوشش کی مگر اسے بھی سخت زخمی کر دیا گیا سکھ ''کاہنا سنگھ'' اور رام رنگ نامی ایک ہندو سپاہی زخمی اینڈرسن اور ایگنیو کو بچا کر ہاتھی پر اٹھا کر لے گئے۔

انگریز ایگنیو کو یقین ہو گیا کہ ملتان کی حکومت اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی بلکہ یہ ہاتھ سے گئی۔ چنانچہ اس نے لاہور کے انگریز سربراہ فریڈرک کو ایک خط لکھا کہ ''مائی ڈیئر سر فریڈرک! یہ

وہ کشتی کے فوجیوں کو ختم کر چکے ہوتے تھے اور خالی کشتیوں کو کنارے پر لا کر آگ لگا دیتے تھے۔
اسی طرح ایڈورڈ کے جو فوجی دریا کے کنارے پر پہنچ کر ابھی دریائے کوندر کے جنگل میں پاؤں رکھتے ہی تھے کہ اچانک سیاہ جسموں والے جانگیہ پہنے ہوئے پگڑ پوش تلواروں اور کلہاڑیوں سے ایڈورڈ کے فوجیوں کو قتل کرتے اور پھر ان ہی کوندر کے جنگلوں میں گم ہو جاتے۔ پورے تین دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایڈورڈ کے سینکڑوں فوجی کام آئے اور سینکڑوں زخمی ہو کر دریائے سندھ کی لہروں کی نذر ہو گئے اور کشتیاں واپس نہ جا سکیں۔ تیسرے دن ایڈورڈ نے فوج کو دریا کے اس پار اترنے کی بجائے دریا کے ساتھ چلتے ہوئے ڈیرہ غازی خان پر حملہ کرنے اور غازی گھاٹ کے مقام سے دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان پہنچنے کا حکم دیا۔ اس وقت لیہ شہر پر دیوان مولراج کی طرف سے تیجامل نامی اروڑہ خاندان کا ایک ہندو حاکم مقرر تھا۔ مگر اس وقت تک واڑہ گشکوری کے مسلمان جنگ جیت چکے تھے اور انگریز جرنیل ایڈورڈ کی فوج نے غازی گھاٹ کے مقام سے دریائے سندھ عبور کر کے انگریز جرنیل وارن کارٹ لینڈ کی تازہ دم فوج کے ساتھ ملتان پر حملہ کیا اور پوری ایک صدی کی غلامی مسلط کر دی۔ میں نے جنگ واڑہ گشکوری کو اس لئے اُجاگر کیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ کتنے غیرت مند تھے اُن کے آباؤ اجداد، جن کی غربت و افلاس سے گری اور جلی ہوئی عمارت کی راکھ میں سے بہادری، غیرت و حمیت کی ایسی چنگاریاں سلگ رہی ہیں کہ اس آگ کا دھواں اب بھی نظر آتا ہے۔ انگریزوں نے اپنی اس شکست کا بدلہ ان صحرا نشینوں سے کس طرح لیا وہ ایک طویل المناک داستان ہے۔

غازی خان کی جرات مندانہ داستان

برکت اعوان

تاریخ تہذیب و تمدن کا آئینہ بھی ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان بھی۔ فطرتاً انسان کو اپنے ماضی سے لگاؤ رہا ہے اور ماضی ایک ایسا منظر ہے کہ انسان ارتقائی منزلوں کی طرف چلتے چلتے بھی ان گزرے ہوئے ماضی کے راستوں کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنا پسند کرتا ہے، جو وہ چھوڑ آیا ہے۔ گویا انسان کا ہر گزرا لمحہ اس کی متاعِ عزیز ہے۔

صحرائے تھل تاریخی ورثہ سے مالا مال ہے۔ صحرائے تھل کے ہر ذرہ ریت کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ ایک داستان ہے۔ صحرائے تھل کی تاریخ میں رواداری کا ایک واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

غازی خان کو تخت کابل سے ایک حکم نامہ ملا کہ انھیں شکایت موصول ہوئی ہے کہ لیہ کے صحراؤں میں ایک بلوچ قبیلہ جسکانی نے پیشہ رہزنی و قزاقی اختیار کر رکھا ہے۔ داؤد خان جسکانی اس قبیلہ کا سردار ہے اور وہ کوہ سلیمان کی طرف سے آنے والے تاجروں اور قافلوں کو لوٹ لیتا ہے۔ اس وقت کوہ سلیمان کے راستے بلخ، بخارا، غزنی اور متعدد ملکوں کی طرف سے سامان تجارت لانے والے تاجر یا ہندوستان آنے والے لوگوں کے قافلے سفر کی مسافت کم کرنے کے لئے معروف راستوں کی بجائے درہ سنگ سوراخ یا کوہ سلیمان کے متعدد دوسرے گم نام دروں کے راستے کوہ سلیمان کو عبور کرتے پھر دریائے اباسین یعنی دریائے سندھ کو بھکر، بہل اور دائرہ دین پناہ کے مقام سے عبور کرتے۔ کیونکہ ہر سہ مقامات پر دریائے سندھ کا پاٹ کم ہو جاتا تھا اور پھر وہ صحرائے تھل کے مخصوص راستوں سے ہوتے ہوئے دریائے چناب پر پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح

وہ اصل مسافت کی بجائے کم مسافت طے کرکے ہندوستان میں داخل ہو جاتے تھے۔ لیہ تھل کے لق و دق اور بے آب و گیاہ صحرا کے وسط میں داؤد خان جسکانی نے اپنے قبیلے کے ہمراہ قلعہ موج گڑھ میں رہائش اختیار کر رکھی تھی اور وہ صحرا سے گزرنے والے قافلوں اور چھوٹی آبادیوں کو لوٹ رہا تھا اور خلق خدا کو آزار پہنچا رہا تھا۔ اس کی اطلاع جب حاکم کابل کو پہنچی تو حاکم کابل نے ڈیرہ غازی خان کے حاکم غازی خان کو صحرا کے قزاق داؤد خان جسکانی کا سر قلم کرنے اور اس کے قبیلہ کو تہ تیغ کرنے کا حکم بھجوایا۔ چنانچہ غازیخان بلوچ ایک لشکر جرار کے ساتھ صحرائی قزاق کا سر قلم کرنے اور اس کے قبیلہ کو تہ تیغ کرنے دریائے سندھ کے کنارے اس پار کوہ سلیمان کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تھل کے صحراؤں کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر صحرائی قزاق داؤد خان جسکانی کو بھی اطلاع مل گئی کہ غازی خان بلوچ اس کا سر قلم کرنے اور اس کے قبیلہ کو تہ تیغ کرنے کے لئے ایک بھاری لشکر کے ساتھ ڈیرہ غازی خان سے صحرا کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ داؤد خان جسکانی نے بھی اپنے قزاقوں کو تیار ہونے کا حکم دیا کہ وہ صحرائی قزاقانہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ صحرائی قزاقانہ جنگ یہ تھی کہ مخالف پر رات کو شب خون مارو' اسے نقصان پہنچاؤ اور پھر ٹیلوں میں گم ہو جاؤ' دن میں بھی دھوکے سے دشمن پر حملہ کروا سے نقصان پہنچاؤ۔

غازی خان بلوچ والئی ڈیرہ غازی خان اپنے لشکر کے ہمراہ منزلیں طے کرتا ہوا ''راجن شاہ'' کے بالمقابل دریائے سندھ کے اس پار آکر ٹھہر گیا۔ اگلے روز اس نے دریائے سندھ کو پار کرکے صحرائی قزاقوں پر حملہ کرنا تھا۔ جبکہ ادھر سے صحرائی قزاق داؤد خان جسکانی بھی اپنے قزاقوں کو لے کر غازی خان کے لشکر سے پانچ کوس دور ادھر صحرا کے ٹیلوں میں آکر ٹھہر گیا اور پھر رات کے وقت غازی خان کے لشکر کا اندازہ کرنے کے لئے داؤد خان جسکانی تن تنہا اپنے سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار ہو کر دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا اور دور سے غازی خان کے لشکر کو دیکھنے لگا۔ چاندنی رات کھلی ہوئی تھی۔ غازی خان کا لشکر تاحدِ نگاہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ غازیخان کے لشکر کو دیکھنے کے بعد قزاق داؤد خان جسکانی نے اچانک ایک ارادے اور عزم کے ساتھ اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور غازی خان کے لشکر سے دور دریا کے اس پار جا اترا۔ گھوڑے کو ایک پوشیدہ جگہ باندھ کر وہ چھپتا چھپاتا غازی خان کے خیمے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ موی شمع

جل رہی تھی اور مردانہ وجاہت کا پیکر غازی خان باریک چادر اوڑھے مسہری پر محوِ استراحت تھا۔ داؤد خان جسکانی بڑی دیر تک غازی خان کی وجاہت سے متاثر ہو کر اسے دیکھتا رہا اور پھر اس نے ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے غازی خان کی چادر کو اس کے پاؤں کی طرف سے پکڑ کر آہستہ سے سرکایا تو غازی خان کی آنکھ کھل گئی اور اس نے حیران کن نظروں سے داؤد خان جسکانی کو دیکھا شجاعت اور تہوّر سے پر ایک خوبصورت بلوچ چہرہ اس کے سامنے تھا۔ داؤد خان جسکانی نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا' غازی خان! جس داؤد خان جسکانی کا سر قلم کرنے کے لئے آئے ہو میں وہی داؤد خان جسکانی ہوں میں خود تمہارے پاس آ گیا ہوں کہ کل کو جب تم نے حملہ کرکے میرا سر قلم کرنا ہے تو میں خود کیوں نہ پیش ہو جاؤں لیکن میں بلوچ ہوں اور بلوچوں کی طرح اپنا سر دینا چاہتا ہوں اس لئے تم اٹھو وہ آبخورہ پڑا ہے اس سے پانی پیو اور پھر اپنی تلوار اٹھاؤ لیکن داؤد خان جسکانی کی اس جرات نے اسے حیران کر دیا تھا۔ غازی خان نے اپنی تلوار کی دھار کو جانچا اور پھر وہ اپنی مسہری پر بیٹھ گیا اور داؤد خان جسکانی سے مخاطب ہوا کہ تمہیں جب معلوم ہو چکا تھا کہ میں تمہارا سر قلم کرنے کے لئے لشکر کے ساتھ پہنچ گیا ہوں اور میں تمہارا سر قلم کرکے لے جاؤں گا اور تمہارے سر کا دشمن ہوں تم خود یہاں تک کیوں چلے آئے اور پھر جب میں سو رہا تھا تو تم نے اپنا دشمن جانتے ہوئے بھی کوئی گزند کیوں نہ پہنچایا؟ داؤد خان جسکانی نے کہا بلوچ سردار! میں یہ سوچ کر آیا ہوں کہ کل بھی آپ نے میرا سر قلم کرنا ہے میں آپ کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لئے خود آ گیا ہوں اور آپ پر وار اس لئے نہیں کیا کہ بلوچ ہوں' بیمار' ضعیف' بچہ' عورت اور سوئے ہوئے دشمن پر وار کرنا ہماری بہادرانہ روایات کے خلاف ہے۔ بڑی گہری سوچ سے نکل کر غازی خان نے داؤد خان جسکانی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا کہ میں بھی بلوچ ہوں' بہادر قوم کا فرد ہوں اور بہادروں کی قدر کرنا میری روایات میں شامل ہے اور اپنے گھر آئے ہوئے دشمن پر حملہ کرنا اور تمہارے جیسے بہادر دشمن پر حملہ کرنا میری بہادرانہ روایات کے برخلاف ہے جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا اور تمہارا سر قلم کرنا موقوف کیا۔ داؤد خان جسکانی نے اپنی تلوار غازی خان کے قدموں میں ڈال دی اور کہا سردار آج کے بعد قزاقی ہم بھی نہیں کریں گے کھیتی باڑی کرکے اپنا پیٹ پال لیں گے آپ تک کبھی کوئی شکایت نہ پہنچے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کروڑ لعل عیسن سے لے کر لیہ تک دریائے سندھ کے کنارے جسکانی قبائل آباد ہیں اور ان کا پیشہ زراعت ہے۔

جنگ چاہ نڑکی پڑوپی ۱۸۵۷ء

برکت اعوان

تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ لڑتی فوج ہے لیکن نام جرنیل یا بادشاہ کا ہوتا ہے اور تاریخ اس لحاظ سے تو بالکل بے لحاظ اور بے اصول ہے کہ اس نے کبھی گمنام لوگوں کا نام نہیں لیا جنہوں نے جرات وتہور کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور وہ گمنام مر گئے ہیں۔ میرے مضمون کا محور صحرائے تھل کے وہ غریب لوگ ہیں، اسلام کے وہ شیدائی ہیں جنہوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء صرف اور صرف اسلام کے نام پر لڑی اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے۔ یہ جنگ ''نڑکی پڑوپی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

پایہ تخت دہلی جب اپنی مرکز گریزیت کی بنا پر اپنی افادیت کھو چکا تھا اور مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوگئی تو بدعہد، بدخو، خصلت حرص کا پجاری، برچھا گرد لشکری، راجہ رنجیت سنگھ، پنجاب بھر کے چوروں، ڈاکوؤں، اچکوں اور اٹھائی گیروں کا ایک غول بیابانی لے کر اٹھا اور اس نے سب سے پہلے اس طرف کے پنجاب کی چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کو اپنی غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پنجاب کی تاریخ میں راجہ رنجیت سنگھ کے ظلموں کی لامتناہی داستانیں رقم ہیں۔ اپنے ظلم وستم کی وجہ سے وہ ہمیں تاریخ میں چنگیز خان اور ہلاکو کی اولاد معنوی نظر آتا ہے بلکہ قلعہ قصور کے مسلمانوں پر اس کے ظلم واستبداد نے چنگیز خان کے ظلموں کو بھی شرما کے رکھ دیا۔ رنجیت سنگھ وسطی پنجاب کے مسلمانوں کو، ان کے مذہب، ان کی انا اور ان کی حشمت سمیت زمین میں دفن کر چکا تو اس نے اٹک پشاور اور ڈیرہ جات کی طرف توجہ کی۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں مسلم اکثریت میں تھے۔ پہلے اس نے اٹک اور پشاور کو اپنے قبضہ میں کیا اور پھر اس نے ڈیرہ جات کو

اپنے زیر قبضہ لانے کے لئے ان کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کی۔ صحرائے تھل لیہ میں مسلمانوں کے مٹ جانے والے چھوٹے چھوٹے مٹی کے قلعوں کی ریت میں منہدم ہونے والی دیواریں آج بھی زبان حال سے سکھوں کے ظلم وستم کی داستانیں بیان کر رہی ہیں کہ ہم کبھی مسلمانوں کے بھرے پرے اور آباد شہر تھے۔ جنہیں سکھ ستم گروں نے برباد کر دیا ہے۔ سکھ برچھا گرد اپنے ٹڈی دل لشکروں کے ساتھ جب صحراؤں میں پہنچ کر مختلف آبادیوں پر شب خون مارتے تھے تو وہ مردوں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو بلا دریغ تہ تیغ کر دیتے تھے اور ان کی ''جھونپڑیوں'' کو آگ لگا دیتے تھے۔ ان کا مال واسباب، نقد وجنس لوٹ کر لے جاتے تھے۔ تاریخ صحرائے تھل کا ہم عمیق نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو تھل کے غریب اور غیور مسلمان ہمیں جگہ جگہ سکھوں سے برسر پیکار نظر آتے ہیں اور کہیں اپنے معصوم بچوں کو سینوں سے چمٹائے ادھر سے ادھر جنگلوں اور صحراؤں میں بے بسی سے بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی دور صحرائے تھل کی زبان میں بگیاں بھاجڑاں اور دھاڑاں کا دور کہلاتا ہے۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سکھ حکومت کا خاتمہ سفید فام انگریزوں کے ہاتھوں ہو گیا۔ سکھ حکومت کا خاتمہ ہونے کے بعد سکھوں نے صحرائے تھل کا علاقہ بھی اپنے باپ کی جاگیر سمجھتے ہوئے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اس طرح ۱۸۴۰ء میں پنجاب کے برٹش گورنمنٹ میں شامل کر دیئے جانے پر صحرائے تھل لیہ بھی برٹش گورنمنٹ کی جاگیر ٹھہرایا گیا۔ انگریزوں نے لیہ کو جو صحرائے تھل کے صوبے کی حیثیت رکھتا تھا پر قبضہ کرنے کے بعد لیہ کو کمشنری کا درجہ دے دیا۔ لیہ میں زمانہ قدیم میں لنگر سرائے والہ تھا جہاں مسلمان حکمرانوں کے دور دراز کے مسافر قافلے اور تاجر قافلے آ کر پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ (یوں تو مسلمان حکمرانوں کے دور میں پورے ہندوستان میں کاروان سرائے موجود تھے مگر کاروان سرائے اور لنگر سرائے میں فرق یہ تھا کہ ہندوستان کے دیگر کاروان سرائے میں مسافروں کو ٹھہرنے کے لئے صرف جگہ مہیا کی جاتی تھی۔ مگر لیہ تھل کے لنگر سرائے میں مسلمان حاکمان وقت مسافروں کو ٹھہرنے کی جگہ کے علاوہ کھانا بھی مفت دیا کرتے تھے اس لئے اسے لنگر سرائے کہا جاتا تھا اور یہیں سے یہ قافلے ہندوستان کی ٹیکسال تبدیل کرتے تھے۔ اسی لنگر سرائے کے پاس ٹیکسال قائم تھی جہاں ہندوستان کے سکوں کی ڈھلائی ہوتی تھی جس پر معمولی سا ٹیکس لگا کر ہندوستان کے سکے ڈھال دیئے جاتے تھے اور پھر

مسافر آگے ہندوستان کے لئے دہلی اور کانگڑھ کو روانہ ہو جاتے تھے۔ انگریزوں نے لنگر سرائے والہ پر اپنی فوجی چھاؤنی قائم کر دی اور سابق ہندو گورنر کی بنوائی ہوئی نہر لالہ ہزاری کے کنارے پر کمشنر کے بنگلے اور دفتر بنوا دیئے اور صوبہ لیّہ کا پہلا انگریز کمشنر کرنل راس ۱۸۵۰ میں مقرر ہوا۔ یہ کمشنر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے چند ماہ پیشتر طبعی موت مر گیا اور لیّہ شہر کے مغرب میں دریا کے کنارے دفن ہے۔ اب تو لوگوں نے اس کی قبر کے نشان بھی مٹا دیئے ہیں۔ اب سے تیس برس پہلے تک اس انگریز کمشنر کی قبر کے نشانات صحیح حالت میں موجود تھے۔ صحرائے تھل جو مسلم اکثریت پر مشتمل علاقہ تھا سچے رسولِ عربی کے شیدائی مسلمان تھے اور مسلمانوں کی سرشت کے مطابق اس علاقے کے مسلمانوں کے سینوں میں آزادی کا ولولہ ایک شعلے کی صورت میں دمکتا رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ چند ابوالہوس غدار ابن غدار جاگیردار خاندانوں کو چھوڑ کر صحرا کے غریب مسلمان ہمیں ریشمی رومال تحریک میں بھی شامل نظر آتے ہیں۔ سید احمد شہید اور اسماعیل شہید کے شانہ بشانہ بالاکوٹ میں سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور مجاہدین آزادی کو رسد اور خوراک بھی پہنچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

صحرائے تھل لیّہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

انگریزوں کے وقت میں انگریزوں کی نگرانی میں لکھی جانے والی تاریخوں میں اور انگریزوں کے لکھے ہوئے گزیٹیرز میں ہندوستان کی جنگ آزادی کو ''غدر'' ۱۸۵۷ء لکھا گیا ہے یعنی غداری کی جنگ اور ان تاریخوں میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا گیا۔ اس جنگ آزادی میں انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو محرک آزادی اور موردِ الزام ٹھہرایا ہے اور ان پر کوہِ ستم توڑے۔ خدا مسلمانوں کا یہ جنون، یہ جذبہ سلامت رکھے۔ ہندوستان میں جنگِ آزادی کی تمام قیمت مسلمانوں کو ہی چکانا پڑی ہے۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب جنگِ آزادی کا پہلا شعلہ ہندوستان سے بلند ہوا تو اس کی تپش ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ یہی چمک روشنی جب صحرائے تھل کے مسلمانوں کے سانولے چہروں پر پڑی تو ان کے چہرے چمک اُٹھے۔ انہیں پل پل کی خبریں مل رہی تھیں اور جنگ آزادی کے یہ صحرائی پروانے مصروف عمل ہو گئے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر صحرا میں پھیلے ہوئے

''کنوؤں'' (چاہات) پر جاتے، لوگوں کو جذبہ جہاد اور جذبہ آزادی سے سرشار کرتے اور اس سے اگلے روز وہ رات کی تاریکی میں صحرا کے کسی اور چاہ پر یہ لوگ اکٹھے ہوتے اور جہاد کا تذکرہ ہوتا، آزادی کے فسانے ہوتے۔ اس تحریک کی سرپرستی صحرا کے اعوان' سیال اور سواگ قوم کے بزرگ لوگ کر رہے تھے۔ جنگِ آزادیِ ہندوستان کے شعلے وسطی ہندوستان سے چلتے ہوئے پنجاب اور ڈیرہ جات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ادھر انگریز اپنے زرخرید کالے غداروں سے مل کر جہاں بھی بغاوت ہوتی وہاں پر قابو پا لیتے تھے۔ مسلمانوں کو توپوں پر اڑا رہے تھے۔ ان کو سولیوں پر لٹکا رہے تھے۔ ان کے بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کے چراغ زندگی گل کر رہے تھے اور مولی گاجر کی طرح کاٹ رہے تھے۔ ان کی بستیوں اور آبادیوں کو جلا رہے تھے۔ انگریزوں کی مسلمانوں پر اس ظلم و بربریت کا تاریخ عالم میں جب بھی ذکر ہوتا ہے، تاریخ عالم کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ ان سزاوں سے مسلمان سہمے ہوئے اور خوفزدہ تھے۔ خصوصاً اپنے ہم منصب اور اپنے ہی لوگوں کی مخبری سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ ادھر جنگِ آزادیِ کے متوالوں پر ظلم و بربریت کی داستانیں زور پکڑ رہی تھیں، ادھر صحرا میں جنگِ آزادی کے صحرائی پروانے ''شعلہ بجاں'' ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ادھر صحرا ہی کے تمندار' جاگیردار اور سردار انگریزوں کے قریب ہو کر اور انہیں تیاریوں کی خبریں پہنچا کر ان سے سر کے خطاب اور جاگیروں لوٹنے میں مصروف تھے۔ ان دنوں میں وہ ۱۱ستمبر ۱۸۵۷ء کا دن تھا جس دن سانولی سلونی صورتوں والے مفلوک الحال، مفلس اور غریب صحرائے تھل کے صحرائی مسلمان چاہ نڑکی پڑوپی کے میدان میں لیّہ شہر سے تین کوس کے فاصلے پر انگریز جابر حکمرانوں کو گھیرے میں لینے اور ان سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ ادھر انگریز حاکم کرنل ٹامسن کو مخبروں نے خبردار کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی فوج کو لے کر چاہ سکھے والہ پر مورچہ بند ہو گیا۔ کرنل ٹامسن کی فوج تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس تھی۔ جس میں چھوٹے دہانے کی توپیں بھی شامل تھیں۔ ادھر پیوند لگے کپڑے، پاؤں سے ننگے، ٹوٹی پھوٹی تلواریں' کلہاڑیوں' بلم اور چند توڑے دار بندوقیں اور سونٹے۔ یہ ان بے سروسامان صحرائی مسلمانوں کا سامان حرب تھا۔ ۲ بجے دن کے قریب نڑکی پڑوپی سے مسلمان غازیوں کا جیش روانہ ہونے کو تھا کہ ادھر کرنل ٹامس کو غدار لوگوں نے اطلاع دی کہ مسلمان فوج لیّہ شہر کی طرف روانہ ہونے کو ہے تاکہ وہ انگریز چھاؤنی اور انگریزوں کے گھروں پر قبضہ کر لیں۔

چنانچہ کرنل ٹامسن اپنی فوج لے کر ایک سیلاب کی صورت میں چاہ نڑ کی پڑوپی کے میدان میں پہنچ گیا تاکہ مسلمان حریت پسندوں کا راستہ روک سکے۔ اچانک کرنل ٹامسن کی فوج کے سامنے آجانے سے اب حریت پسند صحرائی مسلمانوں کے لئے دست بدست جنگ کرنے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ رہا چنانچہ نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور علیؑ مدد کے نعروں کے ساتھ یہ صحرا نشین انگریزوں کی فوج کی طرف تلواریں اور کلہاڑیاں سونت کر بھاگ پڑے۔ ادھر کرنل ٹامسن نے ایمان کے ان متوالوں پر آتش و آہن کی باڑ مارنے کا حکم دیا اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ صحرا کے سانولی صورت اور پیوند لگے کپڑوں والے پچاس دیوانے خاک و خون میں لتھڑ کر سرفراز ہو گئے اور شہادت کی معراج کو پہنچ گئے اور ان میں سے کچھ لوگ بندوقوں سے مسلح انگریزوں کے سپاہیوں کے سروں پر پہنچ گئے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انگریز آفیسر تھارو بریڈ گھوڑوں پر سوار ہو کر بندوقوں سے مسلمان مجاہدین کو نشانہ بنا رہے تھے اور گھوڑوں کو ادھر سے ادھر بھگا رہے تھے۔

جب بھی کوئی مجاہد گرتا تو سب مجاہد بیک آواز انا للہ و انا الیہ راجعون بڑی بلند آواز سے پڑھتے اور پھر نئے ولولے سے لڑائی میں مصروف ہو جاتے۔ گھمسان کی لڑائی بڑی شدت سے جاری تھی۔ اسلام کے شیدائی صحرائی (تھلوچی) پسینے، خون اور خاک سے لت پت زمین پر گر رہے تھے۔ اللہ اکبر، یا نبیؐ یا رسولؐ انا للہ و انا الیہ راجعون کے نعرے گونج رہے تھے۔ ان حریت پسند مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کی طرف سے لڑنے والے مسلمان سپاہیوں کے تیور بدلنے لگے تھے اور اسے کرنل ٹامسن نے محسوس کر لیا تھا چنانچہ وہ اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک صحرائی جاٹ نے نکل کر آناً فاناً ایک بہت بڑا سونٹا کرنل ٹامسن کے کندھے پر اس انداز سے مارا کہ کرنل ٹامسن گھوڑے سے نیچے گر گیا اس کے سپاہی فوراً اس کی مدد کو لپکے اور اسے سہارا دے کر دوبارہ گھوڑے پر سوار کر دیا اور پھر وہ گھوڑا بھگاتا ہوا اپنے بنگلے کی طرف چلا گیا۔ انگریزوں کی فوج چھاؤنی کی طرف آ گئی۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا اسلام کے سچے شیدائی سانولی صورتوں اور ایمان سے روشن چہروں والے صحرا نشین بارود اور سیسہ کے آگے خون سے لت پت ہو کر اسلام کے تین سو پروانے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر چکے تھے۔ جبکہ ایک سو ستر سپاہی انگریزوں کے کھیت رہے جن میں آدھے انگریز شامل تھے۔ مسلمان اپنے شہداء کی لاشیں لے کر صحراؤں میں گم ہو گئے۔ انگریزوں نے دریائے سندھ کے کنارے اپنا قبرستان بنا لیا اور اپنے

انگریزوں کو اس قبرستان میں دفن کر دیا۔ جس کے آثار و باقیات اب تک موجود ہیں۔ کرنل ٹامسن اس چوٹ کے اثر سے کئی ماہ بعد مر گیا اور لیہ میں دفن ہوا۔

انگریزوں نے جنگ نڑ کی پڑوپی کے بعد صحرائے تھل کے مسلمانوں پر کوہ ستم توڑ ڈالے۔ مسلمانوں کی زبانوں کو تالے لگ گئے۔ انگریزوں کے مراعات یافتہ غدار، ان مجاہدوں کو اور ان کے قبیلوں کو شکاری کتوں کی طرح تلاش کرنے لگ گئے۔ تو یہ خدا کے سپاہی صحراؤں کی وسعتوں میں گم ہو گئے انہوں نے اپنے نام بدل لئے۔ انہوں نے اپنی قومیں بدل لیں۔ انہوں نے خود کو مزدور پیشوں میں گم کر لیا اور اب تک ان مجاہدوں کی نسلیں موچی، ترکھان اور لوہار بن کر تھل کے صحراؤں کی وسعتوں میں گم ہیں اور زندگی کے دن گزار رہی ہیں۔ میرے صحرائے تھل کی عظمت کے امین عظیم لوگوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ صحرائے تھل کے اکثر قدیم قبرستان گمنام شہیدوں سے بھرے ہوئے ہیں اور یہ وہ گمنام شہید ہیں جنہوں نے اسلام کی عظمت کے لئے اپنی مادر وطن کے لئے اپنی آزادی کے لئے جنگ نڑ کی پڑوپی ۱۸۵۷ء میں جسم و جان کے نذرانے پیش کئے تھے اور گمنام اس لئے ہوئے تھے کہ ان کی آنے والی نسلوں کو انگریز ختم کرنا چاہتے تھے۔ اسلام اور وطن کے شیدائی ان صحرائی دیوانوں کی نسلیں صحراؤں میں گم ہو گئی ہیں۔ انہوں نے اپنے نام اور قومیں تک تبدیل کر لی ہیں۔ لیہ تھل کے صحراؤں میں جنگ نڑ کی پڑوپی کے نام سے موسوم لڑی جانے والی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق انگریز اور اس کے خوشامدی صرف اتنا لکھ سکے ہیں کہ لیہ میں جنگ آزادی رائے احمد خان کھرل کے چند بھگوڑے ساتھیوں نے آ کر لڑی تھی جس میں وہ سب لوگ مارے گئے تھے اور کرنل ٹامسن معمولی زخمی ہوا تھا اور پھر لکھا ہے کہ کوئی خاص بغاوت نہیں ہوئی ہے۔ میری عقیدتیں، میری صبحیں میری شامیں میرے لیہ کے ان گمنام شہیدوں کے نام ہیں۔ میرے جذبے میرے الفاظ صحرا کے اُن غازیوں سلام ''شہیدوں کے صدقے'' ہیں ان کی اولادوں کو سلام ہے میرے سلام اعوانوں، سیالوں، سواگوں اور تھل کے صحرائی جاٹوں کے نام ہیں جو خدا کی راہ میں شہید ہوئے اور غازی کہلائے اور گمنام ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے راہ وفا کے ان شہیدوں کو میرا سلام ہے۔ جو جنگ نڑ کی پڑوپی میں شہید ہوئے۔

تاریخ کروڑ

مہر نور محمد تھند

کروڑ لعل عیسن کا نام پہلے دیو پال گڑھ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ بگڑ کر دیپال گڑھ بن گیا اور جب مسلمانوں نے یہاں قبضہ کیا تو اس کا نام کوٹ کروڑ رکھ دیا جو کہ حضرت محمد یوسف المعروف حضرت لعل عیسن کے نام نامی کے بعد ازاں کروڑ لعل عیسن مشہور ہوا۔

تاریخ ملتان تذکرہ حضرت بہاؤ الدین زکریا، تواریخ ڈیرہ اسماعیل خان کے علاوہ دوسری بہت سی کتابوں اور مسودات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے کابل پر حملہ کرکے قبضہ کر لیا تو کابل ہندو برہمن حکمران علیہ شاہ وہاں سے بھاگ کر ہند چلا آیا اور یہاں کے علاقے پر قبضہ کر کے حکومت کرنے لگا۔ اسی خاندان سے راجہ بل اور راجہ تل تھے۔ جنہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقہ میں بل کوٹ تعمیر کر دیا یہ قلعہ بعد ازاں بلوٹ مشہور ہوا۔

راجہ بل نے دریائے سندھ کے مشرقی علاقہ پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر ایک قلعہ تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ علاقہ تھل کا گورنر اپنے ہی خاندان کے ایک فرد راجہ دیو پال کو مقرر کیا۔ راجہ دیو پال نے تھل کے مرکز میں دریائے سندھ کے کنارے پر ایک قلعہ بنوایا اور اس کا نام اپنے نام پر دیو پال گڑھ رکھا۔ اسی دوران ۱۰۰۵-۶ء میں محمود غزنوی نے قلعہ دیپال گڑھ پر حملہ کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا۔ محمود غزنوی کو سترھویں دن فتح حاصل ہوئی۔ محمود غزنوی نے یہ قلعہ اپنی فوج کے ایک بزرگ شخص کو بطور جاگیر دے دیا۔

بزرگ شخصیت حضرت سلطان حسین قریشی کی تھی جن سے محمود غزنوی عقیدت رکھتے تھے۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ سلطان حسین اپنے سابقہ علاقہ کی طرف سے مقررہ لگان وصول کرتا تھا۔ اُسے بھی کروڑی کہا جاتا تھا۔ ایک اور روایت جو کہ تاریخ ملتان کے مصنف نے لکھی ہے کہ حضرت سلطان حسین خوارزمی نے ایک کروڑ مرتبہ سورۃ مزمل کا ورد کیا جس کی وجہ سے دیپال گڑھ کا نام کوٹ کروڑ رکھا۔ انہوں نے یہاں ایک مسجد بنوائی اور علاقہ میں دین اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

اسی خاندان سے کروڑ میں حضرت بہاؤ الحق زکریا ملتانی اور حضرت مخدوم رشید پیدا ہوئے۔ کروڑ میں ایک عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی قائم تھی۔ یہیں سے حضرت بہاؤ الحق زکریا نے سات قرآت میں قرآن حفظ کیا۔

۱۱۹۰ء کے قریب شہاب الدین غوری نے حملہ کرکے اپنا گورنر علی کو مقرر کر دیا یہاں چنگیزوں اور مغلوں کے حملے ہوئے۔ سلطان جلال الدین خوارزمی جب علاقہ تھل میں پناہ گزیں ہوا تو یہ علاقہ اس کے قبضے میں چلا گیا۔

۱۳۹۸ء میں تیمور نے سید خضر خان کو ملتان کا گورنر مقرر کر کے یہ علاقہ اس کی نگرانی میں دے دیا ۱۴۵۰-۶۰ء کے قریب ملتان کے حکمران سلطان حسین لنگاہ نے کروڑ پر حملہ کر کے اپنے بھائی کو گورنر مقرر کر دیا اور کروڑ کو ملتان حکومت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ علاقہ سنگھڑ اور ضلع جھنگ کا کچھ حصہ اس صوبے میں شامل تھا لیکن بھائی نے بغاوت کر دی۔ مجبوراً سلطان حسین لنگاہ کو حملہ کر کے بھائی کو گرفتار کرنا پڑا۔ بعد ازاں ۱۴۶۹ء میں یہ علاقہ میرانی بلوچ حکمران کو بطور جاگیر مل گیا۔ میرانی بلوچوں نے اس علاقے پر پونے تین سو سال تک حکومت کی۔ ۱۵۴۶ء میں حضرت مخدوم محمد یوسف احمد عرف لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ ملتان سے کروڑ تشریف لائے تو آپ کی آمد کے باعث کوٹ کروڑ کا نام کروڑ لعل عیسن مشہور ہوا۔

حضرت لعل عیسن کا مزار مبارک بلوچ نوابوں نے بنوایا جن کی قبریں مزار کے اندر بھی موجود ہیں۔ مزار کے سامنے کی مسجد بھی ان بلوچ میرانی سرداروں نے بنوائی تھی۔ اس مسجد میں سونے کے چاند ستارے لگوائے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے حملہ کر کے چھت اُکھاڑ کر سونا اُتار لیا۔ بہر حال کروڑ ایک اہم تاریخی و قدیمی شہر ہے۔ سلطان حسین کی تعمیر کردہ مسجد لالہ کے کٹاؤ کا

شکار ہو گئی ہے جبکہ قلعہ کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سلطان شاہ قریشی سابق چیئرمین بلدیہ کروڑ کے مکانات اور دوسرے بہت سے گھر قلعہ کی ڈھیری پر بنے ہوئے ہیں۔ یہاں بارشوں کے بعد آج بھی صدیوں پرانے سکے ملتے ہیں۔

حضرت للّی لال رحمۃ اللہ علیہ اور مائی میراں کی کہانی

برکت اعوان

اے مہربانوں کے مہربان دریا!
اے بادشاہوں کے بادشاہ دریا!
میری زیادتیوں کو معاف کر دے
ہزاروں روتے ہوئے تیرے در پر آئے ہیں
تیرا مرتبہ بلند اور تو با اختیار ہے
اے دریا میرے دل کو سچائی دے
اور مجھے روزی دے
تمہاری بدولت بھوکوں کو روزی نصیب ہے
غمزدوں کو خوشی نصیب ہے
تم ہمارے حصار ہو
تم دریاؤں کی رتھ پر سوار ہو
تم ہر ضرورت میں ساتھ دینے والے دوست ہو
تم کمزوروں کے لئے باعث قوت ہو
تم عظیم ہو کسی سے شکست تسلیم کرنے والے نہیں ہو
اے میرے دریاؤں کے دریا!
میرے دل کو خوشی دلا دے

یہ وہ گیت ہے جو اٹھارہ سو سال قبل مسیح عظیم دریا' دریائے سندھ کے کنارے رہنے والے
آریائی لوگ دریائے سندھ کے کناروں پر کھڑے ہو کر عبادت کے انداز میں گاتے تھے اور اپنی
صبح کا آغاز کرتے ہوئے۔ عظیم سندھ ساگر سے مدد طلب کرتے اور مرادیں مانگتے تھے دریائے
سندھ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس عظیم دریا کی عظمت و ہیبت کے قصیدے ''رگ وید'' نے بھی
گائے ہیں۔ پانچ ہزار سال قبل از تاریخ اس عظیم دریا کو' ورنا دیوتا کی عظمت اور طاقت'' کا مظہر
کہا گیا ہے اور ''رگ وید'' نے اس کیلئے ڈکراتا ہوا بیل، دودھیل گائے' تیز رفتار گھوڑا اور
خوبصورت گبھرو جوان کی تشبیہات استعمال کی ہیں۔

اسی دریائے سندھ کے کنارے ایک عظیم صحرا بھی واقع ہے جسے تھل کہا جاتا ہے۔ اب سے
پانچ سو برس پہلے دریائے سندھ کے کنارے اور عظیم تھل کے ماتھے پر سندھ کی طرف سے آنے
والے ایک جنگجو قبیلہ میرانی کی بسائی ہوئی بلوچوں کی بستی لیہ کے نام سے اُبھری اور یہ بستی پھیلتے
پھیلتے ایک پر رونق شہر بن گئی۔ اس شہر کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ دریا کے کنارے واقع ہونے
کی وجہ سے اس شہر کی تجارت کشتیوں کے ذریعے کالا باغ، بھکر سے لے کر دیبل تک ہوتی تھی۔
ادھر اونٹوں کے ذریعے دہلی اور آگرہ تک اس شہر کا سامان تجارت جاتا تھا۔ اس شہر کی تجارت پر
ہندو دھرم سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا قبضہ تھا جب کہ مسلمان صرف جنگوں اور زراعت کے
لئے وقف تھے۔ اس شہر لیہ کی خوشحالی اور تونگری کے قصے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہی وجہ
ہے کہ اس وقت کے قزاق طالع آزماؤں نے اس شہر کو لوٹنے کی کوششیں کیں مگر اس شہر کے جنگجو
اور بہادر لوگوں نے انہیں مار بھگایا۔ اس شہر کے حاکم میرانی تھے مگر طوائف الملوکی کے اس زمانے
میں متعدد اقوام کے لٹے پٹے لوگوں اور قبیلوں نے اس شہر میں پناہ لے رکھی تھی اور خوشحالی کی زندگی
بسر کر رہے تھے۔ ایک دفعہ سندھ ساگر کو جوش آیا تو اس نے ڈیرہ جات کی دو بہت بڑی آبادیوں
ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ فتح خان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ سیلاب سے تباہ و برباد ہونے کے
بعد ان آبادیوں کے ہزاروں انسان نقل مکانی کر کے مختلف شہروں میں آباد ہو گئے۔ سیلاب سے
تباہ و برباد ہونے والے اور نقل مکانی کرنے والے تباہ حال لوگوں میں ڈیرہ اسماعیل خان کی
ڈھینگرہ قوم سے تعلق رکھنے والا ہندو ڈھولن رام سُنارا بھی اپنے خاندان سمیت لیہ شہر میں آبسا۔
ایک بہت بڑا خاندان تھا اور سب افراد جوہری اور زرگر تھے۔ اس خاندان کا بڑا اور سرپنچ ڈھولن

رام سنارا ہی تھا۔ ان لوگوں نے لیہ کے حاکم سے اجازت لے کر لیہ شہر کے بالکل درمیان ایک
اونچی جگہ پر اپنی بستی آباد کی جو اب تک محلہ بلیلے والا کے نام سے موجود ہے۔ آئے دن رہزنوں کی
لوٹ مار سے بچنے کے لئے لیہ شہر کی فصیل بن چکی تھی اور دو دروازے شمالی گیٹ اور جنوبی گیٹ بن
چکے تھے۔ یہ فصیل برطانیہ کے زمانے میں شہر کے رئیس اور بااثر ہندو رائے بہادر تلوک چند نے
گروادی تھی لیکن دونوں دروازے بڑے عرصے تک موجود رہے تھے۔ اب سے بیس بائیس برس
بیشتر میونسپل کمیٹی نے مسمار کر کے بازار کی سڑک کو کشادہ کر دیا تھا۔

ڈھینگرہ خاندان کے ان ہندوؤں کا لیہ شہر میں کاروبار خوب چمکا۔ ڈھولن رام سُنارا کے
جہاں سات نوجوان بیٹے تھے وہاں قدرت نے اسے ایک حسین و جمیل بیٹی بھی دی تھی۔ اس زمانہ
میں اشوک کی درویش بیٹی میراں مائی کے بھجنوں کی پورے ہند میں ایک آتش بھڑکی ہوئی تھی جو
بے چین روحوں کو سکون دیتی تھی۔ ڈھولن رام سنارا نے بھی میراں مائی سے عقیدت کی بنا پر اپنی
اکلوتی بیٹی کا نام میراں رکھ دیا۔ گھر میں پیار کی وجہ سے بعض بزرگ میراں کے ساتھ بھائیوں کی
نسبت سے اسے ویراں یعنی بھائیوں والی بھی کہہ کر پکارتے تھے۔

۱۵۱۵ء میں کوہ سلیمان کی طرف سے غزنی کے طالع آزما آئے دن ہندوستان پر حملہ آور
رہتے تھے۔ ان ہی دنوں میں کوہ سلیمان کے ساتھ ساتھ بہنے والے عظیم دریائے سندھ کے
کنارے بلوچ سرداروں کا بھی آپس میں کشت و خون جاری تھا اور آئے دن لوگوں کی نقل مکانی کا
سلسلہ جاری تھا۔ ان ہی ایام میں کسی ریلے کے ساتھ ایک درویش صفت انسان للی لال کے نام
سے لیہ میں آ وارد ہوئے۔

ایک دن لیہ شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ فصیل شہر کے شمالی دروازے کے عین سامنے ریت
کے ٹیلوں کے ساتھ پیلو کے ایک جُھنڈ کے نیچے سرخ و سفید چہرے سیاہ داڑھی سیاہ عمامہ اور سبز
کپڑوں والا ایک خدا مست آرام فرما ہے۔ اس درویش منش سے کوئی واقف نہیں تھا کہ وہ کون
ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ سرائیکی بولنے والا یہ درویش منش بہت کم گفتگو کرتا اور اپنا نام صرف للی
لال بتاتا تھا۔ اس کی وجاہت نے لوگوں کے قلوب تسخیر کر لئے اور لوگوں نے آہستہ آہستہ اس
درویش کے پاس آنا شروع کر دیا۔ لوگ گھنٹوں اس درویش منش کی صحبت میں بیٹھتے اور روحانی
سکون حاصل کرتے تھے۔ دریائے سندھ کے کنارے اور کوہ سلیمان کے ساتھ ساتھ مشرق کی
طرف کلور کوٹ میانوالی سے لے کر مظفر گڑھ تک صحرا کی ایک وسیع پٹی ہے جسے تھل کلاں کہا جاتا

ہے۔ اس صحرا میں بسنے والے صحرائی لوگ تھلوچی کہلاتے ہیں۔ یہ مفلس، صابر وشاکر، پرسکون چہروں اور خلوص بھری آنکھوں والے لوگ ہیں اور اندازِ انسانیت سے مالا مال تھے۔ ان غریب صحرائیوں کو یہ انداز انسانیت اسلام نے بخشا اور خدا کے ولی لوگوں کا ان لوگوں پر خاص فیضان نظر تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ حاملانِ دین کے ساتھ رہے۔ لیہ میں نووارد درویش منش للّی لال کو بھی ان صحرائی لوگوں نے عقیدت و محبت دی۔ للّی لال کی شہرت صحرائے تھل میں بہت دور تک پھیل گئی۔ وہ استغراق سے جب بھی فرصت پاتے شہر کا گشت کیا کرتے اور پھر اپنے تکیے پر آ کر بیٹھ جاتے۔ ایک بار ان کا گزر ڈھینگرہ خاندان کے محلہ سے ہوا۔ ڈھولن رام سُنارا کی بیٹی میراں اپنے مکان کی بالکونی میں کھڑی شہر کا نظارا کر رہی تھی کہ اچانک گلی میں گزرتے ہوئے حضرت للّی لال پر ان کی نظر پڑی تو ان کے دل کی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ حضرت ''للّی لال'' تو مائی میراں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئے مگر مائی میراں بیقراریوں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ چنانچہ مائی میراں روزانہ اس وقت بالکونی میں آ کر کھڑی ہو جاتیں جب للّی لال کے گزرنے کا وقت ہوتا۔ حضرت للّی لال اسی انداز سے مائی میراں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ مائی میراں کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ یہ خبر ان کے بزرگوں تک بھی پہنچ گئی۔ پہلے تو انہوں نے مائی میراں کو سمجھایا بجھایا پھر انہوں نے حضرت للّی لال کو پابند کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان کی گلی سے نہ گزرا کریں لیکن درویش کے معمولات میں سر مو فرق نہ آیا۔ وہ پابندی وقت کے ساتھ ڈھینگرہ خاندان کی گلی سے گزرتے رہے۔ ادھر مائی میراں کی عقیدت میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کے مختلف خاندانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور مائی میراں کی کہانی گلی گلی پھیلنے لگی۔ ڈھینگرہ خاندان کے ہندو سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس نامعلوم مسافر درویش کو موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ڈھینگرہ خاندان کے لوگوں کو پیام بھجوایا گیا اور انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان سے کرائے کے قاتلوں کی ایک جماعت بھیجی۔ جو اپنے مذموم عزائم میں کسی بھی طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر کار مائی میراں اپنے کپڑوں کی گٹھڑی سنبھالے حضرت للّی لال کے قدموں میں پہنچ گئیں۔ حضرت للّی لال نے بدستور استغراق کے عالم میں پوچھا کون ہو؟ مائی میراں نے کہا میراں ہوں۔ فرمایا کس لئے آئی ہو؟ کہا مسلمان ہونا چاہتی ہوں اور آپ کے قدموں میں رہنا چاہتی ہوں۔ اپنا گھر بار اور کنبہ چھوڑ کر آ گئی ہوں۔ حضرت للّی لال نے مائی میراں کو کلمہ شہادت پڑھانے کے بعد دور پیلوں کے جھنڈ کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو میراں تمہاری جگہ وہ ہے۔ تمہارے اور ہمارے درمیان ایک دریا حائل ہے۔ اس دریا کو کبھی عبور کرنے کی کوشش مت کرنا۔ چنانچہ مائی میراں اپنے کپڑوں کی پوٹلی سنبھالے حضرت للّی لال کے حکم کی تعمیل میں حضرت للّی لال کے پیلو کے درخت سے بہت دور ایک اور پیلو کے درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ آپ کے ساتھ ایک خادمہ بھی بیٹھ گئی۔ حضرت للّی لال کی شہرت سن کر مخلوق خدا نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔ ڈھولن رام سنارا اس صدمے میں مر گیا اور مائی میراں کے بھائی ڈیرہ اسماعیل خان کی طرف نقل مکان کر گئے۔ مائی میراں کے رشتے داروں میں سے ہی ایک ہندو نے حضرت للّی لال سے متاثر ہو کر آٹھ ایکٹر رقبہ حاکم وقت سے خرید کر حضرت للّی لال کے نام وقف کر دیا۔ یہ وہی رقبہ تھا جس پر حضرت للّی لال اور مائی میراں کا قیام تھا۔ کچھ عرصے بعد حضرت للّی لال وفات پا گئے اور انہیں ان کی بیٹھنے والی جگہ پر دفن کر دیا گیا۔ چند سال بعد مائی میراں بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں اور انہیں بھی ان کے بیٹھنے والی جگہ پر دفن کر دیا گیا۔ حضرت للّی لال کے نام ہندو کے وقف کردہ رقبے کو مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں نے چاہ الاٹ کر کے کاشتکاری کی۔ ایک دفعہ حضرت لعل عیسن لیہ میں تشریف لائے تو انہوں نے مائی میراں کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور انہوں نے زائرین کی سہولت کے لئے مائی میراں کے مزار کے قریب ایک کنواں رحداث کرا دیا۔ حضرت لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ کے اس کام سے متاثر ہو کر ایک ہندو ہر جس رائے نے زائرین کی رہائش کے لئے ایک سرائے تعمیر کرا دی۔ جب کہ ایک مسجد حضرت لعل عیسن کے ایک مرید نے بنوا دی۔ حضرت للّی لال لیہ شہر کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ انگریز نے ان کے رقبے کا ذکر اپنے بندوبست میں بھی کیا ہے۔ کہ وہاں پر الف خان نام کا ایک شخص مزارعہ ہے اور حضرت للّی لال کے نام سے یہ کنواں منسوب ہے اور چھ پشت سے وہ مزارعہ ہے۔ حضرت للّی لال کی قبر اسی طرح ناپختہ اور گارے کی بنی ہوئی ہے۔ کچی چار دیواری بغیر چھت کے ہے۔ اسی طرح مائی میراں اور اس کی خادمہ کی دو قبریں پیلو کے درخت کے نیچے پہلو بہ پہلو ناپختہ حالت میں گارے کی بنی ہوئی موجود ہیں۔ جب تک پُرانے لوگ اس شہر میں زندہ رہے حضرت للّی لال کا کنواں اور ان کا رقبہ آباد رہا لیکن اب ایک مسجد اور حضرت للّی لال کے ناپختہ مزار مبارک کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔

تھل ڈیویلپمنٹ ایکٹ 1949ء

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

مملکت خداداد پاکستان میں تین بڑے صحراء تھر، تھل اور چولستان ہیں۔ علاقہ تھل صدیوں سے ایک ویران ریگستان پر مشتمل تھا۔ اس وسیع وعریض علاقہ کی تعمیر وترقی کی خاطر سندھ ساگر دو آب ایکٹ 1912ء کی شکل میں زمینداران تھل اور گورنمنٹ پنجاب کے مابین رضامندی سے یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ گورنمنٹ ایک مقررہ عرصہ کے اندر تھل کینال جاری کرنے کا بندوبست کرے گی اور زمینداران اس کے عوض رقبہ زیر آمدہ نہر کا 3/4 حصہ گورنمنٹ کے حوالے کرینگے مگر جنگ عظیم اول اور چند دیگر وجوہات کی بنا پر گورنمنٹ پنجاب مقررہ میعاد کے اندر نہر لانے سے قاصر رہی۔ حتیٰ کہ سندھ ساگر دوآب ایکٹ سال 1932ء میں ختم ہو گیا۔

اعلان آزادی کے بعد پاکستان معرض وجود میں آنے پر پاک پنجاب گورنمنٹ کو جب مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ درپیش ہوا تو پھر اس سنگین صورتحال کے پیش نظر کثیر رقبہ کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر گورنمنٹ کو اس علاقہ کی طرف توجہ مبذول کرنی پڑی کہ کن ذرائع سے یہ رقبہ کی کمی پوری کی جانی ممکن ہے۔

ان حالات کے پیش نظر تھل ڈیویلپمنٹ ایکٹ 1949ء منظور ہوا اور ایک نیم خودمختار ادارہ TDA وجود میں آیا تا کہ مہاجرین کی آبادکاری کا کام جلد نمٹایا جا سکے اور گنجان آباد اضلاع سے مہاجرین کا بوجھ کم کیا جا سکے۔ اس پیش رفت میں حصول اراضی کا آغاز ابتدائی نوٹیفکیشن مورخہ 4-04-1951 سے ہوا اور آخری نوٹیفکیشن سال 1955 میں جاری ہوا۔ اس دوران گورنمنٹ

پنجاب نے بذریعہ پریس نوٹ سال 1954ء اعلان کیا کہ جن مالکان کا رقبہ اندر حدود نہر (تھل کینال) آیا ہے ان مالکان کو درج ذیل مراعات کے ساتھ رقبہ دیا جائے گا۔ اس طریقہ کار کو مارجنل فارمولا (Marginal Formula) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو ابتداء سے تاہنوز قابل عمل رہا۔ تفصیل فارمولا رقبہ حق واپسی بحق مالکان درج ذیل ہے۔

1۔ 15 ایکڑ کے مالکان کو سالم رقبہ واپس کیا جائے گا۔ TDA کو کوئی رقبہ نہیں ملے گا۔

2۔ 16 ایکڑ سے 100 ایکڑ تک کے مالکان کو نصف 1/2 حصہ واپس ہو گا مگر ایسے مالکان کو کم از کم 15 ایکڑ ضرور واپس کرنا ہو گا۔ جن کا نصف حصہ حصول کرنے سے پندرہ ایکڑ سے کم رہ جاتا ہو۔

3۔ 100 ایکڑ سے زائد رقبہ کے مالکان کو ایک چوتھائی 1/4 حصہ رقبہ واپس ہو گا۔ مگر ان مالکان کو کم از کم 50 ایکڑ رقبہ ضرور واپس دینا ہو گا جن کا 3/4 حصہ رقبہ حصول کرنے سے باقی 50 ایکڑ سے کم رہ جاتا ہو۔

اس کے علاوہ رقبہ ملکیتی ادنیٰ، مزروعہ ربیع 1951ء بھی فارمولہ کٹوتی سے مستثنیٰ رہے گا۔ یعنی ایسے رقبہ جات سے محکمہ TDA کو کوئی رقبہ نہیں ملے گا۔

اس فارمولا کی روشنی میں عملہ ترقیاتی ادارہ تھل نے ریکارڈ ایڈجسٹمنٹ کی تیاری کا کام شروع کر دیا۔ سال 55-1954 میں ایل اے او اور اے ایل او صاحبان کی تعیناتی ہوئی اور زیر سرپرستی چیئرمین TDA اور زیر نگرانی C.O صاحبان ریکارڈ ترتیب دیا گیا۔ ان کاغذات کی بنیاد پر تقسیم کے کام کا آغاز ہوا جو ابتدائی الاٹمنٹ سال 55-1954ء کہلاتی ہے۔ ابھی یہ تقسیم پایہ تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ اس دوران ترمیمی ایکٹ 1955ء منظور ہوا جس میں رقبہ واپسی مالکان کا جدید فارمولا قائم ہوا۔ جو مندرجہ پریس نوٹ 1954ء کے بالکل برعکس تھا اور کئی مشکلات کا باعث بنا۔ نتیجتاً مالکان اور محکمہ TDA کے درمیان خاصی الجھن اور مقدمہ بازی کا باعث بنا۔ اس فارمولا کو سلیب سسٹم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ان ہر دو فارمولہ جات کے تضاد میں 1955ء کے بعد مالکان تھل اور محکمہ TDA کے درمیان معاملات عدالتوں میں زیر سماعت ہوئے جبکہ اس دوران ریکارڈ ایڈجسٹمنٹ مطابق مارجنل فارمولا مندرجہ پریس سال 1954ء تیار ہو چکا تھا۔ اس ریکارڈ کی روشنی میں دوبارہ

EACO صاحبان کی نگرانی میں کام ایڈجسٹمنٹ سال 1960ء میں شروع کیا گیا جو سال 1964-65ء میں ختم ہوا۔ اس عرصہ میں حسب ضابطہ امثلہ ایڈجسٹمنٹ اور فردات تقسیم چک وار مکمل کی گئیں۔ گویا کسی حد تک کام ایڈجسٹمنٹ پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔

اس دوران کنفرمیشن ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ زیر بحث آیا کہ EACO صاحبان کے پاس کنفرمیشن کے اختیارات نہ تھے بلکہ صرف ایسا افسر کنفرمیشن کا مجاز تھا جو TDA بورڈ کا ممبر ہو۔ TDA بورڈ، چیئرمین TDA‘ C.O اور D.C صاحبان سرگودھا، میانوالی، مظفرگڑھ پر مشتمل تھا۔ اس لحاظ سے کنفرمیشن سال 1959ء 1966ء جو EACO صاحبان نے کی ہوئی تھیں‘ کو قانونی الاٹمنٹ تسلیم نہ کیا گیا۔ چنانچہ C.O صاحب جو TDA بورڈ کا ممبر تھا‘ نے سال 70-1969ء میں تجاویز امثلہ ایڈجسٹمنٹ کو کنفرم کرنا شروع کیا لیکن اس دوران سال 1970ء میں محکمہ TDA ختم کیا جا کر افسران TDA چیئرمین اور C.O صاحبان کے عہدے ختم کر دیئے گئے اور محکمہ TDA کو ایڈمنسٹریٹر TDA (چیف سیکرٹری) پنجاب، لاہور کی نگرانی میں دے دیا گیا اور کنٹرول DC صاحبان کے سپرد ہوا۔ ایڈمنسٹریٹر TDA نے بذریعہ نوٹیفکیشن ایڈجسٹمنٹ کے اختیارات EACO صاحبان جوہرآباد، بھکر، لیہ اور A.C صاحبان جوہرآباد، بھکر، لیہ اور کوٹ ادو کو تفویض کیے تاکہ یہ دیرینہ الجھاؤ ختم ہو کر کاغذات ایڈجسٹمنٹ کی تکمیل ہو سکے اور ساتھ ہی اس علاقہ کا بندوبست بھی شروع کرنے کا حکم صادر ہوا۔

کام ایڈجسٹمنٹ درج ذیل اعداد و شمار پر مشتمل تھا۔

نام ضلع	تعداد مواضعات	تعداد مالکان	تعداد رقبہ اندر حدود آبپاش	حصہ TDA	حصہ مالکان
لیہ	42	20525	1548262 ایکڑ	1271269 ایکڑ	1276993 ایکڑ

ان اعداد و شمار سے واضح ہے کہ محکمہ TDA نے اپنے تصرف میں 1271269 ایکڑ ارقبہ ستعمال کرنا تھا جبکہ 1276993 ایکڑ کی ایڈجسٹمنٹ بحق مالکان کی جاتی تھی۔

ایڈجسٹمنٹ میں پریس نوٹ سال 1954ء کی تعمیل فارمولا کٹوتی کی حد تک تو درست طور پر کی گئی لیکن اس پریس نوٹ مذکورہ کی اس ہدایت کو نظر انداز کیا گیا جن مالکان سے محکمہ نے 1/2

حصہ یا 3/4 حصہ کٹوتی کیا ہے انہیں ایڈجسٹمنٹ میں چوائس دی گئی ہے۔ یعنی مالکان کو پسند کا رقبہ ایڈجسٹمنٹ میں دیا جائے مگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ محکمہ TDA نے اپنا حصہ رقبہ تعداد 1271269 ایکڑ مالکان کی حق رسی بذریعہ ایڈجسٹمنٹ سے قبل مختلف سکیم ہائے میں استعمال کرایا اور مالکان تاہنوز اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ اگر مالکان کی ایڈجسٹمنٹ تقسیم رقبہ زیر سکیم سے پہلے کر دی جاتی تو آج اس قدر مقدمہ بازی کا سیلاب نہ آتا جو محکمہ TDA کی بدنامی کا باعث بنا ہوا ہے۔ چونکہ ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ بندوبست بھی ہو رہا تھا۔ بندوبست کا ریکارڈ تیار ہونے سے قبل جس قدر رقبہ کی ایڈجسٹمنٹ بحق مالکان کنفرم کی جا چکی تھیں، ان مالکان کو خانہ ملکیت میں بطور مالک درج کیا گیا اور ہدایت بندوبست کے پیش نظر جن مالکان کی ایڈجسٹمنٹ بعد تیاری کاغذات بندوبست ہوئی ان کو بذریعہ انتقال قائمی ملکیت ریکارڈ زیر کار میں قائم کیا جا رہا ہے۔ بہرصورت جس قدر رقبہ کی ایڈجسٹمنٹ ہو چکی تھی ان کا عملدرآمد بندوبست کے ریکارڈ میں کیا جا کر کاغذات بندوبست تصدیق ہو کر داخل تحصیل ہو چکے ہیں۔

اب مشاہدے میں آیا ہے کہ مفہوم و اہمیت سے ناواقف عملہ کچھ تغیر و تبدل سے کام لے کر روشن ماضی کو سیاہ مستقبل میں بدلنے پر محرک ہیں۔ جن کا سدباب لازمی ہے۔

تاریخ لیہ اور ہمارے سادہ لوح مورخین

نسیم لیہ

اس دور میں جہاں انسان نے ہر شعبے میں ترقی کی ہے وہاں پر جھوٹ کے شعبے میں بھی بڑی ترقی سے ہمکنار رہا ہے۔ پہلے دور میں تاریخ سچے واقعات اور ترتیب وار ادوار پر مشتمل ہوتی تھی اور اب جھوٹے حالات پر مبنی تاریخ نے ایسا ہڑبونگ مچایا ہے کہ جھوٹا تاریخ نگار اس سلیقے یا شائستگی سے جھوٹ بولتا ہے کہ اس کھلے جھوٹ پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے۔

ہمارے لیہ کے مبالغہ آرا تاریخ دانوں نے کبھی اولیاء کے نام پر پلندے گھڑے، کبھی چشتیوں اور گوسفندیوں کو اللہ کا ولی قرار دیا اور کبھی واقعات کو توڑ موڑ کر اس من گھڑت انداز میں پیش کیا کہ تاریخ کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ یہ صرف ہمارے اس لاوارث شہر لیہ کی مٹی سے جنم لینے والے سادہ لوح تاریخ دانوں کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے اپنی سادہ لوحی پر اکتفا کر کے من گھڑت واقعات سے تاریخ کو مزین کرنے کی کوشش کی۔ جہاں سے بھی کوئی ایسی ویسی روایت ہاتھ آئی، اسے تاریخ کا حصہ سمجھ کر اپنی طرز نگاری کو چمکانا شروع کر دیا۔

میں لیہ کے بارے میں ایسے من گھڑت واقعات سن کر یا پڑھ کر اس قدر نادم ہوا کہ پہلے جی چاہا کہ خودکشی کر لوں پھر خیال آیا کہ دوسروں کے جرم کی سزا میں کیوں بھگتوں؟ وہ خود کیوں نہ عوامی عدالت میں پیش ہو کر اپنے خلاف اپنے جھوٹ کی سزا سماعت کریں۔ لہٰذا میں اس محاذ کے ہراول دستے کا پہلا مجاہد اعظم ہوں جو صرف قلم کی حرمت کا علم بلند کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ آج کے لیہ اور گذشتہ بیالیس برس کے لیہ میں بہت بڑا فرق اور امتیاز ہے۔

یہ تفاوت و بسیار اس صورت میں سامنے آ سکتا ہے، جب کوئی مجاہد قلم دونوں کا تقابلی مطالعہ کر کے اس انداز کا موازنہ پیش کرے کہ لیہ کی دونوں شکلیں اور دونوں تصویریں سامنے آ کر خود بول اٹھیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کون سا ہے؟

میں اپنے لیہ کے گذشتہ دور کا محاکمہ ~~۱۵۴۷ء~~ سے ۱۹۴۷ء یعنی پانچ صدی پہلے کا اس ترتیب استدلال سے کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخی شواہد نکھر کر سامنے آ سکیں بلکہ تاریخ کا وہ تھوڑا سا حصہ جس میں آپ بھی شعوری طور پر شامل رہے ہوں، واضح ہو کر اپنی دلالت خود پیش کرے۔

آج سے کم و بیش پانچ صدی پہلے کا لیہ جس کی بنیاد ہمارے سادہ لوح مورخین کے مطابق کسی میرانی بلوچ نے ڈالی، صریحاً بے بنیاد ہے۔ گزیٹر یا معارف سرائیکی نے غلط تحقیق سے یہ فیصلہ صادر کیا ہے جو ناقابل تسلیم ہے۔ قدیم ریونیو ریکارڈ کے مطابق لیہ نشیب لوہانچ اور تھل جنڈی کا تمام رقبہ لوہانچ اور سُمرا خاندانوں پر محیط ہے۔ حکومت برطانیہ کی بخشی ہوئی تمام جاگیروں کا وارث ہی سمرا اور لوہانچ خاندان ہے۔ وہاں میرانی قبیلے کا کوئی میرانی بلوچ ریکارڈ کے مطابق کسی ایک قطعہ زمین کا وارث نظر نہیں آتا بلکہ لیہ سے کوسوں دور ایک چھوٹی سی بستی میرانی کا نام ضرور آتا ہے۔ جس کا تعلق لیہ سے اور نہ لیہ کے کسی خطہ زمین سے ہے۔ تاریخ فرشتہ، گزیٹر کا معاون سرائیکی کے دعوے کے مطابق لیہ کا بانی اسی میرانی خاندان کا کوئی فرد ہے۔

اگر واقعی اس کے گھرانے کے چند افراد اور کچھ نقوش یا وہ خود بہ نفس نفیس یہیں آباد ہوئے تو پھر ریکارڈ میں اس کا باقاعدہ اندراج ہوتا لیکن اس کا دھندلا سا اک نشان بھی تاریخ لیہ کے شواہد و استدلال میں دکھائی نہیں دیتا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ لیہ کا بانی میرانی خاندان کا کوئی فرد نہیں بلکہ ریکارڈ کے مطابق سمرا اور لوہانچ ہی اس کے جائز وارث ہیں۔ چونکہ ہندو مسلم تاریخ ثقافت اور ہندو مسلم مخلوط سماج صدیوں سے اسی دھرتی پر اپنی اپنی روایت کے مطابق زندگی بسر کرتا چلا آ رہا ہے، اس لیے ہندو سماج کے نقوش برہنہ آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ دریائے اباسین کے ایک حصے کا نام لالہ سے موسوم ہے جہاں گُردوارے، دھوبی گھاٹ سرائے، انگریزوں کی قبریں، پوجا پاٹ کے مندر ہندوؤں کی وہ آباد اور سیراب زمینیں جو ان کے بعد مہاجرین اور تارکین وطن کو الاٹ ہوئیں۔ آج بھی موجود ہیں۔ حتیٰ کہ گاؤ شالا اپنی اسی مکانیت اور اسی شناخت سے ہندو دور کی یاد تازہ کر رہا ہے اور پھر ہندو لالوں مہاراجوں کے محلے گلیاں، جاگیریں، جائدادیں، زمینیں اور

مکانات اور ان مکانات میں چھپے ہوئے خزائن بدستور اسی سج دھج سے ہاتھ کی لکیروں کی طرح بول رہے ہیں۔ یہ تمام تاریخ لیہ کا وہ اہم حصہ ہیں جنھیں ہم فراموش کر کے اپنی درسگاہیں، اپنی مساجد اپنے مزارات اور اپنی رسومات و روایات کو آگے لا کر تاریخ کا وہ حصہ حذف کر دیتے ہیں جن سے مل کر تاریخ مکمل ہوتی ہے اور تاریخ کا ایک ذہن بنتا ہے۔

اس لیے میری نظر میں تاریخ لیہ کے اس ڈھب کا مؤرخ آج تک یہاں پیدا ہی نہیں ہوا جو اس اندازِ فکر سے سوچے اور اس زاویہ نظر سے دیکھ کر اپنے دور کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لے سکے۔ ہمارے سادہ لوح مؤرخین نے آج تک اس انداز سے لیہ کی تاریخ کے خدوخال نکھارنے کی کوشش نہیں فرمائی اور نہ انہوں نے اپنی تصانیف یا تحریروں میں ہندو مسلم مخلوط تہذیبی دور اور اس کے کارناموں کی فہرست گنوائی ہے۔

تاریخ لیہ کے چند اہم باب جو اولیاء، حکماء، علماء، اطباء، حفاظ یا ادب و موسیقی پر مشتمل ہیں جستہ جستہ میں نے ان پر قلم اٹھایا اور اس دور کو اجاگر کرنے کی سعی کی جو تدریجاً نوائے وقت ملتان میں شائع ہوئے اور آج بھی میں یہی چاہتا ہوں کہ گذشتہ ادوار کے مناظر میں لیہ کے خدوخال سامنے لاؤں تا کہ سرائیکی کلچر کی ہندو مسلم روایت کو تاریخ کے میزان میں رکھ کر دیکھا جا سکے ورنہ تاریخ لیہ سے انصاف ناممکن ہے۔ ان ادوار کی سماجی و معاشی اور تہذیبی و ثقافتی قدروں کی پہچان اور مکمل تذکرے کے بغیر تاریخ ایک ایسے ادھورے پن میں اٹک کر رہ جائے گی کہ بات آگے نہیں آ سکے گی اور ہم اس موازنے اور تقابلی مطالعہ سے محروم ہو کر حقائق کا چہرہ مسخ کر بیٹھیں گے۔ جس کا نتیجہ بقول قتیل یہ نکلے گا کہ:

جھوٹی تسلیوں میں گذاری تمام عمر
آئینہ آئینے کو دکھاتا رہا ہوں میں

اگر ہم اسی طرح صرف میرانی اور لوہانچ یا سمرا کے گرد ہالہ بنتے رہے تو پھر ہماری تاریخ لیہ ان کھرے اور سچے واقعات سے محروم ہو جائے گی۔ جو مورخ کے قلم کی آبرو کہلاتے ہیں بقول خود:

تاریخ رو کہ صرف محبت کے جرم پر
مزدور کو پہاڑ سے ٹکرا دیا گیا

مؤرخین کی ستم ظریفی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ کسی نے اس علاقہ کو طوفان نوح کا مرکز قرار دیا اور کسی نے یہ بڑ ہانکی کہ شہزادہ ہمایوں کی آنکھیں اسی علاقہ میں نکالی گئیں اور کسی نے یہ کہا کہ دخترانِ کربلا کی زبان یہاں کی سرائیکی زبان تھی گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔

دراصل یہ تمام کوتاہی تجسس اور نقصِ مطالعہ یا ضعفِ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ جس کو جو بات پسند آئی، اس نے تحقیق و استدلال اور حوالوں کے بغیر وہی لکھ ماری۔ مورخین کا یہ رویہ نہایت بے رحمانہ ہے۔

تاریخ لیہ کے سادہ لوح مورخین حضرات سے میری التجا یہی ہے کہ وہ تحقیق و شواہد میں اس وقت تک ہاتھ نہ ڈالیں جب تک کوئی محکم حوالہ اور مہرِ تصدیق ثبت نہ ہو ورنہ اس تاریخ کا حشر بھی لاوارث لیہ کی عاقبت کی طرح عبرتناک نکلے گا۔

میرا دعویٰ ہے کہ تاریخ کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے۔ جس سے واقعات کی ترتیب اس کا ایک ذہن تیار کرتی ہے۔ اس ذہن کے زیرِ اثر رہ کر تاریخ کا قاری مطالعہ سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اگر واقعات کی کڑیاں مربوط نہ ہوں تو قاری ان واقعات کی بے ربطی سے ایسی ٹھوکر کھا جائے گا کہ سفر کے آخر تک اس کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے تاریخ میں اپنی پسند و ناپسند کے واقعات کا دخل مؤرخ کی بدنیتی پر مبنی ہے۔

تاریخ لیہ کی کڑیاں بھی اسی طرح واقعات سے یقیناً جڑی ہوئی ہیں۔ مورخ کا یہ حق نہیں کہ ان واقعات کو ذاتی پسند سے تبدیل کر کے اپنی طرف سے جھوٹ کا وہ حصہ شامل کر دے جو دلائل و شواہد اور حوالوں سے عاری ہو۔

۱۹۴۷ء تک ہندو مسلم مخلوط معاشرت نے جو معروضی حالات ہمارے سامنے رکھے ہیں وہ تاریخ لیہ کے اہم باب ہیں۔ اس کے بعد اس مخلوط معاشرت کا در بند ہونے سے انقلاب کا ایک اور دریچہ کھلتا نظر آتا ہے جس کی فضا الگ، موسم جدا، ہوا اور روشنی کا مزاج علیحدہ صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مہاجرین کے کیمپ، ہندوؤں کے مکانوں اور زمینوں کی الاٹ منٹ، انتقال مکانی، پرانی روایات کی اکھاڑ پچھاڑ۔ تاریخ ایک نئے موڑ کا آغاز کرتی ہوئی اور ایک ایسی نئی کروٹ لیتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ہم تاریخ کی پہلی کڑیاں جن سے ٹوٹنے کی آوازیں سن کر ایک نئے سفر میں گامزن نظر آنے لگتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد کا یہ سفرِ جانکاہ ہماری کسی اور منزلِ مراد کی نشاندہی کرتا ہے۔

تاریخ لیہ کا یہ انقلابی سنگم ہماری دو مسلم تہذیبوں کا سنگم ہے۔ زبان و ثقافت کی یہ اچانک تبدیلی اپنا ایک اثر پیدا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مہاجر و انصار کی یہ دو اہم کڑیاں تاریخ کی پہلی کڑیوں کو توڑتی ہوئی ہمارے ایک ایسے مثالی تشخص کی جھنکار میں تبدیل ہو کر ہماری مسلم ریاست کی پہچان کا اعلان کرتی سنائی دیتی ہے۔ یہاں ہمارے قاری کو تاریخ لیہ کا یہ جائزہ ضرور لینا ہو گا کہ یہ تاریخ کن کن راستوں سے گذر کر، کیا کیا موڑ کاٹ کر اور کون کون سے پل عبور کر کے ہم تک اپنے واقعات کی بوجھل اور بھاری بھرکم گٹھڑی اٹھائے پہنچی ہے۔ اب ان تمام کڑیوں کو مربوط کرنے کے لیے تاریخ لیہ کے مورخ کو یہ چاہیے کہ وہ اپنے ذہن کی فضا کو ہموار رکھے اور تدریجی واقعات کی کھوج میں خود کو بھٹکانے کے بجائے ان منزلوں کی نشاندہی کرتا چلا جائے۔ جو راسخ و جامع حوالوں کی روشنی میں آج تک اپنے چہروں کے واضح نشانات کا اعلان کر رہی ہے لیکن افسوس کہ ہماری تاریخ لیہ کے سادہ لوح مؤرخ یہ کام سرانجام دینے سے قاصر ہیں۔ بقول خود:

ہائے کس کرب سے دم توڑ رہی ہے تاریخ

دراصل تاریخ واقعات کا ہاتھ تھام کر اس وقت تک سفر کرنا نہیں چاہتی جب تک مؤرخ کا عصائے قلم اس کا سہارا نہ بنے۔ تاریخ کبھی آنکھ بند کر کے نہیں چلتی۔ تاریخ نہ بہری نہ اندھی اور نہ ہی گونگی ہے۔ یہ مؤرخین کے سلوکِ تحریر پر موقوف ہے کہ وہ سچے اور کھرے لفظوں کی باگ ادھر کو موڑ دے جہاں سچ کے قافلے ہمیشہ رواں دواں رہتے ہیں۔

تاریخ لیہ کے واقعات اور حقائق بھی ایک ایسے مورخ کے انتظار میں ہیں جو ہر دور کی تصویر اس تناظر میں کھینچ کر سامنے لائے جہاں تہذیبی رنگوں کا انعکاس اس انداز سے ہو کہ ماضی کے خدوخال اپنی تائید میں خود بول اٹھیں۔

آؤ تاریخ لیہ کے خدوخال کی تلاش اپنے اس تناظر میں کریں۔ جہاں کی تہذیبی و ثقافتی صدیاں تاریخ کے حصار میں اپنے اسی تنوع سے مقید ہو کر اپنی ماضی کی عمارت میں ڈھلنا چاہتے ہیں۔

یہاں کی ہندو اکثریت، ہندو خاندان اور اس کی تہذیبی روایات گوت اور ذاتیں اور اس کے ساتھ انسانی رویوں کی تاریخی اہمیت و حیثیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ پنڈت، برہمن، چاولے،

راجپوت، ڈھینگڑے اور نارنگ تاریخ لیہ کا مثالی حصہ ہیں۔

دیگر روایتوں کی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ لیہ کی بنیاد رکھنے والا الہیات رام چاولہ ہے لیکن اس روایت کو میں اس لیے ثقہ بند نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تاریخی حوالے سے بات نہیں کہی گئی لیکن اس کے راوی لیہ کی ایک مقتدر اور مصدقہ شخصیت سائیں حکیم میاں الٰہی بخش لیکھی کے چچا بزرگوار سائیں میاں فقیر اللہ بخش لیکھی مرحوم و مغفور سابق جز وقتی لائبریرین بلدیہ لیہ تھے جن کی ذات گرامی پر جھوٹ کا شائبہ تک بہتان اور کفر کے مترادف ہے۔ اس لیے میں اس جامع روایت کو تاریخ کا ایک رخ تو مان سکتا ہوں لیکن کسی تاریخی حوالے کے طور پر تسلیم کرنے سے اس وقت تک قاصر ہوں جب تک کوئی دیگر شواہد اس بات کی تائید پر آمادہ نہ ہوں۔

یہ واقعہ ہے کہ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کہیں زیادہ انسان دوست کارنامے سرانجام دیئے۔ درس گاہیں، سکول، سرائے، پل، تالاب وغیرہ تعمیر کر کے انسانی خدمات کی داغ بیل ڈالی کہ آج نصف صدی گذرنے کے باوجود تاریخ کے اوراق رقم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد ان کی پوجا پاٹ کے مندروں کا انتظام و انصرام گھی کے دیوں کی بہاریں، مندرو اسپاں، دیوداسیاں، پرارتھنا، گیان، دھان رشی منی کی سندر کتھائیں، جنتر منتر، دیوالی دسہرے اور بسنت بیساکھی کے رنگا رنگ جشن، پریم مندر کی انفرادی دایات اور دیوداسی راجکماری کی پریم مندر پر راجدھانی، ایسی منہ بولتی سچائیاں ہیں جن کا آنکھوں دیکھا حال میں اور میرا دور ہی اپنی زبان حال سے بتا سکتے ہیں۔ نقرئی ماضی کے یہ پارینہ قصے ہماری مقامی ثقافت کے وہ اہم حصے ہیں جو تاریخ لیہ کا زریں باب ہیں۔

تاریخ لیہ میری طرح لنگڑی نہیں جو بغل میں بیساکھیاں دبا کر دوسروں کے سہارے چل کر منزل سے دور تھک کر ستانے کے بعد ہمارے سادہ لوح مؤرخین کے من گھڑت واقعات پر ماتم کرنے بیٹھ جائے۔

ہرجس رائے گابا نے مہمانوں کے لیے ایک بسیط و عریض سرائے تعمیر کر کے انسانی جذبوں کی تکمیل کی۔ وہ سرائے آج امام خانہ حسینیہ لیہ میں تبدیل ہو کر سامانہ کے حسینیوں کی عزاداری کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ برج لعل ڈھینگڑہ ڈال کی تعمیر کردہ اب دریا گاؤ شالہ کی بلند بام عمارت، جسے موسیقی کا گوالیار کہنا غلط نہ ہو گا، اس میں دسہرے کے تہوار پر گھن پت سہگل جیسے معروف و ممتاز

موسیقار یہاں آ کر اپنی گائیکی کا جادو جگاتے اور فن موسیقی کا ایسا فسوں پھونکتے کہ یہ گاؤشالہ دربارِ اکبری کا منظر پیش کرتا دکھائی دیتا۔ جودھا بائی کے شوہر نامدار اکبر کے اندر کا ہندو درباری جیسے ٹھاٹھ کا راگ الاپتا ہوا سامنے آ جاتا۔ غرض یہ کہ دریا کنارے دھوبی گھاٹ' مندر اور خوبرو آج بھی اس دور کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ دریائے سندھ کا چھوٹا سا حصہ لالہ ہو یا پھر ہزاری باغ ہوں یا سم سم کا بنگلہ، یہ سب اس جیتی جاگتی صدیوں کے انمٹ نقوش ہیں جن کا آج بھی تاریخی تشخص بدستور قائم ہے۔ دسہرے کا وہ دلکش منظر آج بھی آنکھوں میں تیرتا دکھائی دیتا ہے۔ رام لچھمن' راون سیتا اور لنکا کے جلانے کا سارا دلچسپ کھیل آج بھی آنکھوں کے سامنے اسی تازگی کے ساتھ رقص کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ہر چند تاریخ لیہ کی یہ اٹل حقیقتیں بھولی بسری کہانیوں کا روپ دھار چکی ہیں لیکن یہ تاریخ کے وہ زندہ پائندہ کردار ہیں جن سے ہندو سماج کی تہذیبی شکلیں لیہ کے انگ انگ میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو تعلیمی درسگاہیں بھراتری ہائی سکول لیہ اور سماجی سکول عقب مزار شہید محمد عارف، ایسی بارونق درسگاہیں تھیں کہ دور دراز سے ہندو بچے یہیں آ کر تعلیم سے آراستہ ہوتے لیکن افسوس کہ سماجی سکول تو تادیر قائم نہ رہ سکا البتہ بھراتری ہائی سکول اب تک اسی سج دھج کے ساتھ گورنمنٹ ایم سی ہائی سکول کے نام پر تعلیم کی خوشبو لٹا رہا ہے۔ لالہ آسا رام ہیڈ ماسٹر کے عہد زرّیں میں یہ سکول بڑی ترقی سے ہمکنار تھا۔ یہاں لیہ کی مشہور صنعت، ہاتھی دانت کا کام، سکول کے بچوں کو سکھایا جاتا تھا۔ جب کہ ان دنوں فٹ بال کے معروف و ہونہار پیٹر منگھو رام کی ہاتھی دانت کی دکان لیہ کی ہنر کاری اور صنعت کا منہ بولتا مرکز شمار ہوتی تھی جس میں ہمارے (مسلمان چوڑی گر) بھی کام سیکھتے سکھاتے تھے۔ ہندوؤں کے جانے کے بعد بھراتری ہائی سکول لیہ کی بہت بڑی جائیداد تحفظ نہ ہونے کے باعث مال غنیمت سمجھ کر لوگوں کی نذر کر دی گویا سکول کی قیمتی پراپرٹی ہندوؤں کی طرح رائیگاں چلی گئی۔ ہمارے مسلمان تو مشرقی پاکستان کے اتنے بڑے حصے کو نہ سنبھال سکے، وہ اس پراپرٹی کو کس طرح سلامتی سے اپنی تحویل میں رکھ سکتے تھے۔

تاریخ لیہ کے یہ تلخ حقائق ہمارے سادہ لوح مؤرخین کی بیباکی اظہار کے محتاج ہیں لیکن افسوس کہ آج تک نہ ان واقعات کو کوئی سپرد قلم کر سکا اور نہ کسی کو حقائق کے انکشاف کی توفیق حاصل ہوئی کہ وہ تاریخ لیہ کے ان واقعات کو منظر عام پر لا کر تاریخ کے منہ میں زبان دے سکے۔

مجھے ایک مدت تک اس احساس نے بے چین رکھا بالآخر میں نے عزم بالجزم کر لیا کہ تاریخ لیہ کے وہ حقائق پارے میں ہی یکجا کر کے اس تہذیبی ورثے کی تلاش میں واقعات کے گھنے جنگل میں مارا مارا پھروں گا اور ہندو سماج کی جنم پتری مکمل کر کے تاریخ کا چہرہ نکھارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کروں گا۔

اب کے تو یوں ہوا ہے کہ آندھی کے ہاتھ سے
گلشن کے پات پات کی ترتیب دی گئی
کتنے بتوں کو دل میں بسایا گیا نسیم
کعبہ میں سومنات کی ترغیب دی گئی

مجھے یاد ہے کہ ۳۹-۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لیہ میں اس دور کے گورنر پنجاب سر سکندر حیات خان کی معیت میں سر چھوٹو رام اپنے گلابی رنگ کے بڑے پگڑ اور اپنے چھوٹے قدو قامت کے ساتھ سود خور ہندو بنیے کے خلاف جب تقریر کو اٹھے تو سود خور ہندو بنیا ذہنیت کی قلعی کھولتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا کہ ہندو کی سود خور ذہنیت اور سود کی اندیشہ ناک چالوں سے بچیں' ورنہ سود خور ہندو تمہیں مقروض کر کے تمہاری خون پسینے کی کمائی اور محنت سے اکٹھی کی ہوئی پائی پائی سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دے گا اور تم مفلوک الحال ہو کر رہ جاؤ گے۔ یہ تو سچ ہے کہ ہندو کی تجارت کا انحصار سود پر ہی تھا۔ اگر رات کے کسی حصے میں اٹھ کر کوئی غریب مزدور کسی ہندو کی دہلیز تک پہنچ جاتا اور اپنی لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کی غرض سے بھاری قرض لینا چاہتا تو وہ ہندو بہت خوش ہو کر اسے خالی لوٹانے کی بجائے اس کی جھولی سکوں سے بھر دیتا اور پھر وہ مقروض تمام عمر سود دیتا اور مر جاتا لیکن اصل زر (موڑی) وہیں کی وہیں رہتی۔ بہر حال یہ تو ہندو دور کی ہندو ذہنیت کا قصہ ہے لیکن آج کے ہمارے مسلمان تاجر اور مسلمان سرمایہ دار بھی اپنے غریب مسلمانوں کا خون اس سود خور ہندو کی طرح چوس رہے ہیں اور اسی ہندو ذہنیت یا ہندو پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ حتیٰ کہ نصف صدی گذر جانے کے باوجود آج بھی بنک کاری کا سارا نظام اسی ہندو ذہنیت کے ارد گرد گھوم رہا ہے اور بینکاری کے سودی نظام کے زیر اثر چل رہا ہے۔ امیر اپنی سرمایہ داری اور سود خوری سے امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور غریب سودی قرضے کی لپیٹ

میں جس طرح پہلے تھا، سواب ہے۔ حتیٰ کہ اب ہماری زکوٰۃ کا نظام بھی سود خور بینکاری نظام کے حوالے سے ہے۔

غرض یہ کہ تاریخ لیّہ کو ماضی کے جھروکے میں جھانکنے سے تاریخ کا ایک محیر العقول اور دیدہ زیب باب سامنے آجاتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ ہم اپنی مخلوط معاشرت کے اس تصور کو کھو بیٹھے جو عہد پارینہ کا جزو لاینفک ہے۔

آیئے! آج ہم نصف صدی پیچھے کی طرف نگاہ ڈالیں اور تاریخ لیّہ کے وہ خوشگوار نقش تلاش کریں جنہیں ہمارے اجداد نے کندہ کیا اور ہمیں اپنے سگے پیارے اور انسانی رشتوں کی ہلکی ہلکی اور بھینی بھینی سی خوشبو آج بھی مہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کیا خبر ہمارا انسانی رویوں کا یہی احساس موانست ہماری بازیافت کا خاموش ذریعہ ثابت ہو اور ہم ایک بار پھر بھارت کو مشرف بہ اسلام کر کے گنگا جمنی تہذیب کو آبِ سندھ سے غسل دے سکیں۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

(اقبال)

لیّہ کی ہندو برادری

ڈاکٹر مزمل حسین

لیّہ پنجاب کے دور افتادہ اضلاع میں سے ایک ہے۔ یہ ضلع دریائی اور صحرائی تہذیب کے امتزاج سے مزین ایک قدیمی شہر ہے۔ اِس شہر کی معلومہ تاریخ تقریباً پانچ سو برس پر محیط ہے۔ اس شہر کے لوگوں کے غالب مذاہب ہندومت اور اسلام رہے ہیں۔ یہ شہر ماضی میں تحصیل، ضلع اور ڈویژن رہا۔ آغاز ہی سے یہاں کی غالب اکثریت مسلمان تھی۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق لیہ میں ہندو، آبادی کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر تھے اور یہ پیشہ کے اعتبار سے زیادہ تر دکاندار، آڑھتی اور دستکار تھے۔ ان کی یہ آبادی دیہات کی نسبت شہر میں زیادہ تھی۔ اس لیے بازاروں، مارکیٹوں اور دیگر کاروباری ماحول پر انہی کی اجارہ داری تھی اگرچہ کاشتکاری اور بڑی زمینداری میں بھی یہ مسلمانوں سے پیچھے نہ تھے لیکن ان کی شناخت اول و آخر ''کاروبار'' ہی تھی۔ محلوں میں مِل جل کر رہتے تھے اور چھوٹے چھوٹے تنگ مکان ان کی رہائش گاہیں تھیں۔ ضلع میں متمول ہندوؤں کی بڑی حویلیاں بھی تھیں لیکن یہ تعداد میں زیادہ نہ تھیں اگرچہ ''بنیا پن'' کی روایت یہاں بھی موجود تھی، لیکن انہی ہندوؤں میں مخیّر حضرات کی کمی بھی نہ تھی۔ فلاحی، تعلیمی اور دیگر رفاء عامہ کے ادارے انہی کے دم سے لیہ میں قائم ہوئے۔

یہاں کی اِس ہندو آبادی میں کئی ایسے نامور لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے شعبے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور پورے برصغیر میں لیہ کی پہچان اور وجہ شہرت بنے۔ ان مشاہیر میں موتی لعل (مشہور وکیل) نے اپنی ذہانت اور پیشے سے وابستگی کی بنا پر کئی مشہور مقدمے جیتے۔ موتی لعل بلا امتیاز اہل لیہ کی وکالت کرتے رہے اور پیسہ اور مفاد سے بالاتر ہو کر

یہاں کے لوگوں کو قانونی سہولتیں مہیا کیں۔ سیٹھ برج لعل (مشہور کاروباری شخصیت) نے
علاقے میں بہت سی سرائیں اور دفاعی ادارے قائم کیے۔ چونکہ لیہ کی زیادہ آبادی دیہات
میں رہتی تھی اس لیے دیہات سے آنے والے دیہاتیوں کیلئے شہر میں رہائش کے مسائل ہوتے
تھے۔ یا پھر رات کو جب کبھی تاخیر سے ایسے مسافر جو کسی دوسرے شہر سے آتے تو یہی سرائیں اُن
کی رہائش ہوتیں لہذا سرائیں جہاں مفت رہائش کا انتظام ہوتا تھا، یہاں کی فلاحی سہولتوں میں
سے تھیں۔

جیسا رام (مشہور کانگریسی راہنما) اِس علاقے کے وہ پہلے ہندو کانگریسی راہنما
تھے، جنھوں نے آزادی ہند کی جدوجہد میں گرفتاری پیش کر کے یہاں کے لوگوں کی بھر پور
نمائندگی کی اور ترک موالات کی تحریک میں بھری چوک میں تمام انگریزی ملبوسات جلا کر انگریز
کے خلاف نفرت کو عام کیا اور اپنی دھرتی سے غیر ملکی تسلط کے خاتمے کے لیے عوام میں سیاسی شعور
کی بیداری کی راہ ہموار کی۔ اسی طرح ڈاکٹر داس، دھنیگرا جن کا تعلق لیہ کی دھنیگر فیملی سے تھا۔
آپ ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے اور نامور معالج تھے۔ آپ کا کلینک ہر عام و خاص
کیلئے ہمہ وقت کھلا رہتا اور آپ بلا امتیاز ہر مریض کا علاج خندہ پیشانی سے کرتے۔ ہر جس
گابارائے انھوں نے بھراتری ہائی سکول کے سامنے سرائے گابا کے نام سے ایک ایسی سرائے قائم
کی جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے لیے الگ الگ عبادت گاہیں، کچن اور رہائش کا
انتظام تھا۔ روایت ہے کہ سرائے کے نزدیک اک چوک (مشہدی چوک) میں رات کے وقت ان
کے ملازمین لائن میں کھڑے رہتے اور باہر سے آنے والے مسافروں کو عزت و احترام کے ساتھ
سرائے میں لے آتے اور ان کے لیے یہاں پر مفت قیام و طعام کا بندوبست ہوتا۔ کے۔ ایل۔
گابا (۱۸۹۹ء تا ۱۹۸۱ء) معروف وکیل، کالم نگار، سیاستدان اور ادیب کا تعلق ہر جس گابا ہی کے
خاندان سے تھا۔ کے۔ ایل گابا گورنمنٹ ہائی سکول لیہ میں زیر تعلیم رہے۔ آپ کے خاندان کی
سرزمین لیہ کے لیے بے پناہ تعلیمی اور سماجی خدمات ہیں۔ بعد میں کے۔ ایل گابا ہندو مذہب چھوڑ
کر احمدیوں کی لاہوری جماعت میں شامل ہو گئے اور کندن لعل سے خالد لطیف بن گئے۔

آسارام، لیہ کے معروف ماہر تعلیم تھے۔ آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز درس و تدریس
سے کیا اور صدر معلم کے عہدے پر جا کر سبکدوش ہوئے۔ علم و ادب کی ترویج اور فروغ آپ کی

زندگی کا اولین مقصد تھا۔ رام داس نوا، معروف ادیب، نثر نگار اور شاعر تھے۔ آپ قیام پاکستان
سے قبل ہی اردو شعر و ادب میں اپنا مقام متعین کر چکے تھے۔

لالہ ہرکشن رام، معروف ماہر اقتصادیات جن کا تعلق لیہ کی ہندو برادری کے ایک مفلس
خاندان سے تھا۔ ان کے بچپن میں ایک ایسا واقع پیش آیا جس نے اس بے سہارا اور بے کس
لڑکے کو ایک اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا دیا۔ آپ گورنمنٹ پرائمری سکول پرانی سبزی منڈی میں
ابتدائی جماعتوں کے طالب علم تھے کہ ایک ایسے انگریز افسر کی نگاہ عمیق آپ پر پڑی جو بے اولاد
تھا۔ اُس نے ہرکشن کی پڑھائی میں دلچسپی دیکھتے ہوئے انھیں اپنا متبنّیٰ بنالیا اور اپنے ساتھ ڈیرہ
اسماعیل خان لے گیا۔ آپ تعلیم کے اتنے دلدادہ تھے کہ ڈیرہ اسماعیل خان سے لاہور پیدل
پنجاب یونیورسٹی میں امتحان دینے کیلئے گئے۔ یونیورسٹی میں نمایاں پوزیشن لینے پر آپ کو لندن
کے لیے سکالرشپ مل گیا۔ جہاں آپ نے اقتصادیات میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کی اور وطن
واپس آ کر اپنا ذاتی بنک قائم کیا۔ آپ انگریز کابینہ میں بطور وزیر بھی خدمات سرانجام دیتے
رہے۔

گوپی چند نارنگ کے خاندان کا تعلق بھی لیہ سے رہا۔ آپ نے سکول کی سطح کی چند
جماعتیں گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول میں پڑھیں۔ آپ کا اس وقت ہندوستان کے چوٹی کے
ادیبوں میں شمار ہوتا ہے اور آپ ہندوستان کے سب سے معتبر ادبی ادارہ ''ساہتیہ اکیڈمی'' کے
چیئرمین ہیں۔ آپ نے اپنی اکثر تحریروں اور تقریروں میں اپنے استاد محترم مرید حسین ڈوگر کا نام
انتہائی عقیدت سے لیا ہے۔ مرید حسین ڈوگر مرحوم موضع سہووالا ضلع لیہ کے رہنے والے تھے۔

تاریخ اور روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے مسلمان اور ہندو اپنے اپنے مذہب اور
دھرم سے ماورا ایک دوسرے سے سماجی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ ثقافتی اور مذہبی
تہواروں کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ شب برات، عیدین، یوم عاشور، دیوالی، بیساکھی اور اولیاء کرام
کے عرس اکٹھے منائے جاتے تھے۔ یہاں کے خوشحال ہندوؤں نے عقائد اور اپنے نظریات سے
بالاتر ہو کر دفاعی اور فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی جن کی بڑی مثال ہر جس گابا کی سرائے اور دھینگرا
خاندان کا قائم کیا ہوا بھراتری ہائی سکول (موجودہ گورنمنٹ ایم سی ہائی سکول لیہ) تھا۔ اس کے
علاوہ بھی کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ ہسپتال، پانی کی سبیلیں، مستحق لوگوں میں اناج کی تقسیم،

نادار طلباء کے تعلیمی اخراجات، بے گھروں کے لیے گھر، حتی کہ عوامی تفریح کیلئے مختلف انتظامات بھی یہاں کی متمول اور مخیر خاندانوں کے بے مثال کارنامے ہیں۔ انہی ہندوؤں نے عوامی تفریح کیلئے نانوں آلہ تھلہ کے نام پر "لالہ دریا" (دریائے سندھ کا نالہ) پر ایک ایسا خوب صورت گھاٹ بنایا جہاں پر عورتوں اور مردوں کیلئے نہانے کیلئے الگ الگ جگہیں مخصوص تھیں۔

اِس دھرتی اور اس کے لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ رکھنے والے یہ ہندو قیام پاکستان کے بعد جب یہاں سے بھارت چلے گئے تو وہاں پر بھی انھوں نے لیہ کو بھلایا نہیں اور آج بھی بھارت کے مختلف شہروں خصوصاً پانی پت میں لیہ کے نام پر تعلیمی، کاروباری اور سماجی اداروں کی بنیاد رکھی جس سے اُن کی اس شہر کے ساتھ محبت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں پر پیچھے رہ جانے والے ہندوؤں کی وہ کلاس موجود ہے جو تب بھی اور اب بھی معاشی اعتبار سے خستہ حال ہے اور لدھانہ کے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں گمنامی کی زندگی گزار رہی ہے۔

قبائلِ لیہّ

ناصر ملک

تلخیص: ثوبیہ اسلم (ریسرچ آفیسر)
پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگوئج، آرٹ اینڈ کلچر

شخصی پہچان اور نام و نسب کے حوالہ کیلئے قوموں اور قبیلوں کو الگ الگ نام دیئے جاتے ہیں۔ ہزاروں سال قبل اس روایت نے جنم لیا اور اب بھی برابر جاری ہے۔ دنیا میں ان گنت قبائل اور قومیں اپنی تاریخ رکھتی ہیں۔ ان میں کئی روبہ زوال ہو چکی ہیں جبکہ کئی بام عروج پر ہیں۔ برصغیر ہندو پاک تو شروع ہی سے قبیلہ بندی کا شکار رہا ہے۔ پاکستان میں کئی قومیں اور قبیلے ختم ہو کر اپنا نام کھو بیٹھے اور کچھ قبیلے اپنی پہچان برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

ضلع لیہ میں پاکستان کے دوسرے اضلاع کی طرح بہت سی قومیں اور قبائل آباد ہیں۔ تحقیق کے مطابق 314 قوموں کے افراد اس ضلع میں آباد ہیں۔ دوسرے اضلاع سے آنے والے آباد کاروں نے قوموں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ زیادہ تر قوموں کا تعلق بلوچ، جاٹ اور راجپوتوں کے قبیلوں سے ہے کیونکہ عصر قدیم سے برصغیر پاک و ہند میں تاریخی حوالوں کی امین یہی قومیں ہیں۔ ان سے آگے ان کی بہت سے ذیلی شاخوں نے جنم لیا۔ لیہ میں آباد قوموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

آہیر: یہ جٹوں کی گوت ہے۔ ان کو مویشی پالنے کا بڑا شوق تھا۔

اتراء: لیہ شہر کے نواح میں اور تحصیل چوبارہ میں زراعت سے منسلک ہیں۔

اٹھوال: یہ لوگ اونٹ پالتے تھے اور ان کے علاج معالجے کے سلسلے میں علاقہ بھر میں مشہور تھے، اس لیے انہیں ''اٹھوال'' کہا جانے لگا۔

اجراء: چندربنسی پانڈوں کی اولاد میں سے ہیں۔ بعض خود کو کھیتی باڑی سے منسلک ہونے کی وجہ سے جٹ سمجھتے ہیں۔

اچلانہ: سیال خاندان سے ہیں۔ زراعت پیشہ ہیں اور مختلف مواضعات میں آباد ہیں۔

ارائیں: اریحائی لوگ عرب دنیا سے براہ راست یہاں آکر آباد ہوگئے اور ارائیں کہلائے۔

اروڑہ: ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ سودی لین دین میں مہارت رکھتے تھے۔

استرانہ: محمد خان سدوزئی کے دور میں شمال مغربی سرحدی صوبہ اور افغانستان سے یہاں آکر آباد ہوئے۔

اسرانہ: یہ بھی جاٹوں کی ایک گوت ہے۔ تھل کے قدیمی خاندانوں میں سے ایک ہے۔

اسراء: جاٹوں کی گوت ''اسراء'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اولکھوں کے دور میں لیہ میں آباد ہوئے اور حضرت علی راجن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں مسلمان ہوئے۔

اسٹرہ: تحصیل کروڑ میں ان کے خاندان آباد ہیں۔

اعوان: ان کی دو شاخیں منظر عام پر ہیں: ا۔علوی اعوان ۲۔ ملک اعوان۔ لیہ میں بہت سے گھرانے آباد ہیں۔

انصاری: جب حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ میزبان اہلِ یثرب ''انصاری'' افراد کی نسبت رکھتے ہوئے یہ لوگ دستکاریوں میں ماہر تھے۔

انگڑا: کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہے۔

اوجلہ: مدتوں سے کاشتکاری کے شعبے سے منسلک ہیں جس کی وجہ سے جاٹوں کی گوت کے طور پر مشہور ہیں حالانکہ یہ راجپوتوں کی گوت ہیں۔

اوڈ: ہندوؤں کے نچلے طبقہ ''شودر'' سے ان کا سلسلہ جا ملتا ہے اور اس کی عورتیں اور مرد محنت کو عار نہیں سمجھتے۔

اورا: جاٹوں کی شاخ ہے۔ بہادری، ضدی پن اور اکھڑ مزاجی کی وجہ سے اورا مشہور ہوا۔

اولکھ: جٹوں کی گوت ہے۔ امرتسر کے علاقہ سے نقل مکانی کر کے لیہ کے علاقے میں آئے۔

باجوہ: بنیادی طور پر راجپوت ہیں زیادہ تر کاشتکاری سے منسلک ہیں۔

باگڑی: ان کا تعلق راجپوتوں سے ہے۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

بالکی: نواح میانوالی سے تھل میں آباد ہوئے۔

بپّی: سندھ سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب ابڑہ خاندان سے ملتا ہے۔

بُچہ: جاٹوں کی گوت ہے۔ کاشتکاری اور ملازمت سے وابستہ لوگ ہیں۔

بریار: یہ راجپوت بھٹی کی اک گوت کے طور پر ابھرے۔

بزدار: یہ بلوچوں کے ''رند'' قبیلے سے ہیں۔

بڑانہ: جاٹوں کی نسل سے ہیں اور کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہوئے۔

بسراء: وجہ تسمیہ ''بسرائے'' راجپوت ہے۔ بسرائے راجپوت کی اولاد پہلے ''بسرے'' اور بعد میں تلفظ کی تبدیلی سے بسراء کہلائے۔

بگھور: قدیم تھل کی قوم ہے۔ نور پور بگھور کے بعد لیہ میں اس ذات سے منسوب کافی تعداد میں لوگ آباد ہیں۔

بودلہ: اپنا شجرہ نسب حضرت عبدالرحمٰن بن حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملاتے ہوئے خود کو قریشی خاندان ظاہر کرتے ہیں۔

بلوچ: یہ آریہ قبیلہ ہے۔ ایرانی حکومتوں نے عہد قدیم میں انہیں بلوچستان کی طرف دھکیل دیا۔

بھٹہ: اکثریت کاشتکاری اور زراعت سے وابستہ ہے اور خود کو جٹ کہلواتے ہیں۔

بھٹی: راجپوتوں کی ایک گوت ہے۔ ان کی زیادہ تعداد پنڈی بھٹیاں میں آباد ہے۔ لیہ میں بہت سے خاندان آباد ہیں۔

بھلر: ہندو اور سکھ مذاہب کے پیروکار جاٹوں سے ان کے آباؤ اجداد تعلق رکھتے تھے۔

بھندرال: ان کا سلسلہ نسب جاٹوں سے جاملتا ہے۔ کھیتی باڑی سے وابستہ ہیں۔

بھنڈ: یہ شادی بیاہ و دیگر خوشی کی تقریبات میں طنز و مزاح پیش کرنے کی وجہ سے بھنڈ کہلاتے۔

بھمب: ان کا مورث دلیری اور بہادری میں علاقے بھر میں مشہور تھا۔ بھمب قدیم پنجابی اور سرائیکی زبان میں ''زلزلے'' کو کہتے ہیں۔

بھڈوال: بھڑیں اور بکریاں پالتے تھے۔

پاولی: یہ دستکاری کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے فنکارانہ ہاتھوں سے کھڈیوں پر کپڑا بُنتے تھے۔

پتافی: بلوچوں کے بڑے قبیلے لشاری کی ایک ذیلی شاخ ہے۔

پٹھان: ''پختون'' یا ''پشتون'' زبان کی وجہ سے انہیں پٹھان کہا جاتا ہے۔ ان کا سلسلہ نسب یہودی بادشاہ ''سول'' سے ملتا ہے جو بنی سرائیل میں سے تھا۔ نسل درنسل ان کی شجاعت اور دلیری کی داستانیں تاریخ عالم میں رقم ہیں۔

پراچہ: قالین بانی کی دستکاری سے وابستہ تھے۔

پرہاڑ: راجپوتوں کی شاہی اقوام میں سے ایک ہے۔

پکھی واس: یہ خانہ بدوش لوگ ہیں۔ ایک دو ماہ سے زیادہ کسی علاقے میں نہیں رہتے۔

پندھیر: یہ برصغیر کے شاہی خاندانوں میں شمار کی جاتی ہے۔

پنوار: یہ بھی راجپوتوں کی بڑی قوموں میں شامل ہے۔ تھل میں ان کی اکثریت کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہے۔

پنوں: بلوچوں کی ذیلی شاخ ہے۔

پوپل زئی: یہ پٹھانوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔

پوڈھا: اس قوم سے تعلق رکھنے والے افراد اپنا سلسلہ نسب جاٹوں سے منسوب کرتے ہیں۔

پہوڑ: جٹ قوم کی ایک گوت ہے۔ قدیم زمانے کی ایک دلیر قوم گنی جاتی ہے۔

تارڑ: ان کا سلسلہ نسب جاٹوں سے ملتا ہے۔

تتلہ: اپنے مورث ''تتلا'' کے نام سے مشہور ہے جو خود جنجوعہ قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔

ترکھان: تعمیر اور لکڑی کی دستکاری سے وابستہ ہیں۔

ترگڑ: ترگڑ راجپوتوں کے قبیلے بھٹی سے تعلق رکھتے ہیں مگر خود کو جٹ کہلواتے ہیں۔

تنگوانی: بلوچ خاندان کے نوتک خان کے بیٹے تنگو خان کی اولاد میں سے ہیں۔

تھگو: راجپوت قوم کی ذیلی شاخ ہے۔ قدیم زمانے سے کاشتکاری کے پیشہ سے منسلک ہیں۔

تھراج: راجپوت قوم کی ذیلی شاخ ہے۔ اس قوم سے تعلق رکھنے والے بعض افراد اپنا سلسلہ نسب ''سیال'' سے جوڑتے ہیں۔

تھہند: ''یہ کمبوہ خاندان کی ایک ذیلی شاخ ہے اور زراعت سے منسلک ہے۔

تھوری: آہیر کی ذیلی شاخ ہے۔ یہ لوگ کوہستان نمک سے دوسرے علاقوں میں نمک لے کر جاتے تھے۔ ''تھور'' نمک کو کہا جاتا ہے۔

ٹاٹری: بھٹیوں کی ذیلی شاخ ہے۔

ٹانوری: جاٹوں کی ذیلی شاخ ہے۔ کاشتکاری کے پیشے سے متعلق ہے۔

ٹوانہ: ٹوانے اپنا سلسلہ نسب راجپوتوں سے جوڑتے ہیں اور اپنے مورث ''ٹوان'' سے خود کو منسوب کرتے ہیں۔

ٹھکراء: ٹھکراء اپنا سلسلہ نسب ٹھاکروں سے جوڑتے ہیں۔ کاشتکاری سے منسلک ہیں اور ان کے بہت سے افراد ملازمت پیشہ بھی ہیں۔

جاڑا: کاشتکاری سے منسلک ہیں۔

جام: ان کا شجرہ نسب سندھ کے سمہ خاندانوں سے ملتا ہے۔

جٹ: عربی کے لفظ ''زط'' کو جاٹ کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل ان خانہ بدوشوں، غیر

متمدن قبائل کی مہذب شکل ہے جو زمانہ قدیم اور زمانہ واسطی میں دریائے گنگا سے شط العرب کے درمیان پھیلے ہوئے تھے۔

جسکانی: بلوچ قبیلے کے ایک معروف فرد ''جسکت خان بلوچ'' ان کا مورث ہے۔

جکھڑ: اپنی قوم کو جٹوں کی ذیلی شاخ قرار دیتے ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق جکھڑوں کا مورث ''جٹ'' کا بیٹا ''جکھڑ'' تھا۔

جگ: زراعت پیشہ سے منسلک ہیں۔ بعض جگہ خاندان اپنا سلسلہ نسب جاٹوں سے ملاتے ہیں۔

جلالی: یہ بھی سلسلہ نسب کے اعتبار سے جاٹوں سے جاملتے ہیں۔

جنجوعہ: اس قدیم کا قوم کا تعلق بھی راجپوتوں سے ہے۔ محمود غزنوی کے دور میں مسلمان ہوئے۔

جوتہ: کاشتکاری کے پیشہ سے منسلک ہیں۔ یہ بھی راجپوتوں کی ایک گوت ہے۔

جوراء: جاٹوں کی ایک گوت ہے۔ سرگودھا سے تھل میں آباد ہوئے۔

جوئیہ: یہ قوم راجپوتوں کے شاہی خاندان میں شمار ہوتی ہے۔

جودھ: روایات کے مطابق جنجوعہ کی ذیلی شاخ ہے۔ تھل کی قدیم قوموں میں شمار ہوتی ہے۔

جُونی: جٹ قوم کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ اپنے نام کے ساتھ ملک لکھتے ہیں۔

جھبیل: دریائے سندھ کے کناروں پر آباد ہیں۔ یہ پیشے کے لحاظ سے ملاح ہیں۔

جھنڈیر: اسلام کے ابتدائی دور میں جنگوں میں علم اٹھانے والے افراد مخصوص ہوا کرتے تھے۔ جنہیں جھنڈے کی مناسبت سے جھنڈیر کہا جانے لگا۔

جھورڑ: جاٹوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔

چانڈیہ: راجپوتوں کی ذیلی شاخ ہے۔ اکثر خاندان اپنی قوم کو بلوچوں کے ایک قبیلے سے موسوم کرتے ہیں اور خود کو بلوچ کہتے ہیں۔

چٹھہ: زیادہ روایات کے مطابق ''چٹھہ'' راجپوتوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

چدھڑ: جٹ قوم کی ذیلی شاخ ہے۔ حضرت جلال الدین بخاری (اُچ شریف) کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔

چن: راجپوتانہ ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چاند کی پرستش کرنے والے لوگوں کو بعد میں چن کہا جانے لگا۔

چنگڑ: پکھی واسوں کی ذیلی شاخ ہے۔ چھوٹے چھوٹے کام کر کے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

چنہڑ: زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ جاٹوں کے راجہ ''چنہ'' کی اولاد سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں مسلمان ہوئے۔

چوڑی گر: یہ لوگ چوڑیاں بنانے والے دستکار تھے۔ سونے اور چاندی کے زیورات بنانے میں ان کو کمال دسترس حاصل تھی۔

چوغتہ: پٹھانوں کی ایک ذیلی قوم کے طور پر جانی جاتی ہے۔ چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کی اولاد جو افغانستان میں آباد ہوئی وہ ''چغت'' کہلائی۔

چوہان: راجپوتوں کے شاہی خاندانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ماضی کی دلیر اور نڈر قوم ہے۔

چھجڑا: بھٹیوں کا سپوت ''کیہار'' جو تیرہویں صدی عیسوی میں جیسل میر کا راجہ تھا، اس قوم کا مورث ہے۔

چھینہ: راجپوتوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ بھیکم پور کا راجہ کیلن چھینہ ان کا مورث کہلاتا ہے۔

چیمہ: ان کا مورث ''راجہ چیمہ'' اور بعض لوگوں کے نزدیک ''راجہ جیم'' ہے۔ یہ پرتھوی راج کا بیٹا تھا۔

خواص: ماچھیوں کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ راجوں اور بادشاہوں کے دربار میں تعیناتی کی وجہ سے ''خاص'' گنے جاتے تھے۔

خوجہ: تبلیغی سلسلے میں جو ہندو مسلمان ہوتا اسے عزت و تکریم دینے کیلئے ''خواجہ'' کا لقب دیا جاتا۔

دبکر: ماضی میں چمڑے کی دستکاری سے وابستہ تھے۔ ضلع لیہ میں بستی دبکراں ان کی آماجگاہ تھی۔

درانی: یہ اصل میں پوپل زئی قوم سے تعلق رکھتے ہیں مگر کانوں میں دُر (بمعنی موتی) پہننے کی وجہ سے ''درانی'' مشہور ہوئے۔

دریشک: یہ قبیلہ ''قزائی'' خاندان کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے۔ دریشک کے لفظی معانی ''مضبوط آدمی'' کے ہیں۔

دستی: بلوچوں کی ایک شاخ ہے بے آب وگیاہ علاقوں اور دشت وصحرا کی نسبت سے ''دشتی'' کہلائے اور بعدازاں ''دستی'' کہلائے۔

رندانی: یہ بھی بلوچوں کی ایک ذیلی شاخ ہے جو پندرہویں صدی عیسوی میں لیہ میں آباد ہوئی۔

ڈکڑ: یہ سورج بنسی راجپوت ہیں اور راجہ ڈھکڑ کی نسبت سے یہ ''ڈکڑ'' کہلائے۔

دھت: جاٹوں کی قوم کمبوہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ دھاتوں کی تجارت سے منسلک تھے۔

دھوتڑ: لیہ میں جاٹوں کی گمنام گوت ہے۔ آبائی پیشہ زراعت ہے۔

ڈھول: راجپوتوں کی قدیم قوم ہے۔ ''راجہ ڈھول'' ان کا مورث ہے۔ کاشتکاری اور کاروباری دنیا میں نام کمایا۔

ڈھولکا: راجپوتوں کی سوم بنسی قوم ڈھول کی ذیلی شاخ ہے۔

دیئوال: جاٹوں کی ایک ذیلی شاخ ہے مویشیوں کو پالنے اور دودھ دہی کی فروخت کی وجہ ''دہی دال'' کہلاتے تھے۔

دیول: راجہ دیول جو جٹ قوم سے تعلق رکھتا تھا، اس قوم کا مورث ہے۔

ڈاگی: بلوچوں کا ایک قبیلہ ہے۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

ڈاہا: ان کا مورث ''ڈاہا'' نامی شخص تھا جو راجپوت سلسلہ نسب سے تعلق رکھتا تھا۔

ڈاہر: انہیں ''ڈار'' کے تحت اللفظ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ان کا مورث ''روان'' ہے۔

ڈبڈا: ان کا مورث جٹ قوم سے تعلق رکھنے والا ''ڈب سنگھ'' تھا جو مسلمان ہو کر میاں محمود کہلایا۔

ڈلو: کھرل راجہ ''جگ دیو'' کی اولاد میں ڈھلو نامی شخص کی اولاد بعد میں ڈلو کہلائی۔

ڈونہ: بلوچوں کا قبیلہ ہے۔

ڈوگر: راجپوت قوم سے تعلق رکھتے ہیں کچھ خود کو چوہان قبیلے سے منسلک کرتے ہیں جبکہ دوسرے خود کو پنواروں سے جوڑتے ہیں۔

ڈنہار: ماضی میں کھالوں اور چمڑے کی خرید وفروخت کرتے تھے اور دور دراز کے علاقوں تک بھیڑ کی اون سپلائی کرتے تھے۔

ڈھڈی: جاٹوں کی ایک گوت ہے۔ ان کا مورث حاجی شیر دل ہے جو بورے والا کے قریب دفن ہے۔

ڈھلوں: راجپوتوں کی گوت ہے۔ ان کا مورث سورج بنسی راجپوتوں سے تعلق رکھنے والے ''راجہ کرن کا پوتا ''ڈھلو'' تھا۔

ڈھمرا: جاٹوں کی ایک قدیم گوت ہے۔ ان کا مورث ''ڈھمرا'' کے نام سے مشہور ہوا تھا۔

ڈیہڑ: کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

راٹھور: راٹھور برصغیر کی بہادر قوموں میں شامل ہے۔ یہ قنوج کے ''راجہ کشن'' کی اولاد ہیں۔ راجپوتوں کی شاہی قوموں میں شامل ہیں۔

راجپوت قدیم: جنگ جو اور بہادر قوم ہے۔ تین شاخیں ہیں۔ ۱۔ سورج بنسی ۲۔ چندربنسی ۳۔ اگنی بنسی

رانا: راجپوتوں کی شاہی قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔

رانگڑ: جب بھی راجپوتوں کا کوئی خاندان مسلمان ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا تو اس کی ہندو برادری نفرت سے ان کو رانگڑ کہہ کر پکارتی۔

رانجھا: ان کی اکثریت جاٹوں سے تعلق رکھتی ہے جبکہ کئی خاندان راجپوتوں سے

سلسلہ نسب جوڑتے ہیں۔

رڈ: یہ بھی جاٹوں کی شاخ ہے اپنے ناموں کے ساتھ جام لکھتے ہیں۔

رند: بلوچوں کی ایک بڑی شاخ ہے۔

رندھاوا: یہ بھٹی راجپوت ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں راجپوتوں کا ایک فرد ''رندھاوا'' ہوگزرا ہے جو بعد میں اس قوم کا مورث بنا۔

رونگھا: ان کا مورث ''رنگھا'' تھا جو جاٹوں کے ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

رول: ان کے بعض افراد خود کو راجپوتوں کے فرد ''راول'' سے موسوم کرتے ہیں جبکہ بعض افراد اپنے مورث کو ''راول جٹ'' قرار دیتے ہیں۔

روہتکی: ہندوستان کے صوبہ روہتک سے قیام پاکستان کے وقت آنے والے بے شمار قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد کو روہتکی کہا جاتا ہے۔

ریما: جٹ قوم کی سب کاسٹ ہے۔ ضلع لیہ میں کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہے۔

سادات: یہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے ہیں۔

سامٹیہ: راجپوت قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مورث کا نام ''رام چندر'' ہے۔

سانسی: پکھی واسوں کی ایک شاخ ہے۔ ان کا پیشہ بھیک مانگنا اور نوسر بازی کرنا ہے۔

ساوند: راجپوتوں کے ایک شخص کا نام ''ساون'' تھا جس کی شادی جاٹوں کے گھر ہوئی اور اس کی اولاد اس کے نام سے موسوم ہوئی۔

ساہی: جاٹوں کی معروف گوت ہے۔ اس کا مورث ''بھان'' تھا جس کی اولاد ساہی کہلائی۔

سپراء: جاٹوں کی ایک شاخ ہے۔ ان کے گھرانے کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

سٹھار: جاٹوں کی ایک گوت ہے۔

سٹھو: بعض روایات کے مطابق انہیں بلوچوں اور بعض حوالوں سے انہیں پٹھانوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے کاشتکار اور زرگر ہیں۔

سدھو: یہ جاٹوں کی مشہور شاخ ہے۔ ان کا مورث ''سدھا'' نامی شخص تھا۔ اس کی اولاد اس کی نسبت سے سدھو کہلائی۔

سدوزئی: پٹھانوں کا ایک معروف قبیلہ ہے۔ افغانستان سے اس علاقے میں آباد ہوا۔ ان کا مورث ''سدوخان'' تھا۔

سرگانی: مزاری بلوچوں کی شاخ ہے۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

سقلیگر: یہ درباروں اور فوجوں سے منسلک ہوتے تھے، پیشے کے لحاظ سے یہ تلواریں بناتے اور انہیں دھار لگاتے تھے۔

سکھانی: بلوچوں کی ایک شاخ ہے۔ ''تاریخ لیہ'' میں انہیں نوتک خان کی اولاد لکھا گیا ہے۔

سکھیرا: ان کا مورث ''سکھیا'' گردانا جاتا ہے۔ سکھیا راجپوت قوم سے تعلق رکھتا تھا۔

سگو: راجپوتوں کی شاخ ہے۔ ان کا مورث ''ساگا'' راجپوت تھا۔

سمرا: بعض حوالوں میں راجپوتوں سے جبکہ کئی تاریخی حوالوں میں ان کا سلسلہ نسب جاٹوں سے ملتا ہے۔

سنبل: میانوالی اور شمال مغربی سرحدی صوبہ سے آبائی تعلق رکھتے ہیں۔ نیازیوں کی شاخ کے طور پر معروف ہیں۔

سنپال: راجپوتوں کا ایک گھرانہ بہت دوست نواز تھا۔ کاشتکاری اور تجارت کے پیشہ سے منسلک ہیں۔

سندھڑ: بعض لوگوں کے نزدیک سندھو اور سندھڑ ایک ہی قوم ہے۔ ان کا مورث ''رام چندر'' کے خاندان کے ایک شخص کو قرار دیا جاتا ہے۔

سندھو: جاٹوں کی بڑی شاخ ہے۔ سندھ سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔

سندیلہ: قیام پاکستان سے قبل نواح ملتان سے یہاں آ کر آباد ہوئے۔

سنڈھل: جاٹوں کی شاخ ہے۔ سندھ سے پنجاب میں آباد ہوئے کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

سنیکھا: یہ اپنا سلسلۂ نسب جاٹوں سے ملاتے ہیں۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

سواگ: ان کا مورث ''میاں سوہاگ'' تھا جو کھوکھر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔

سوہلنڑ: کاشتکاری کے شعبے سے منسلک ہیں۔ راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔

سوہیہ: ان کا مورث جٹ قوم سے تعلق رکھنے والا ''سوہی'' ہے جو راجہ کانگ کی اولاد سے تھا۔ اس کی اولاد سوہی اور بعد میں سوہیہ کہلائی۔

سہارن: جاٹوں کی ایک شاخ ہے۔ کاشتکاری کے پیشہ سے منسلک ہیں۔

سہل: اس قوم کا مورث ''سال'' نامی جٹ خاندان سے تعلق رکھنے والا شخص تھا۔

سیال: اس قوم کا مورث ''رائے شنکر'' تھا۔ وہ رائے سیال کے نام سے معروف تھا۔

سیہڑ: سیہڑا خاندان لسبیلا سے لیہ آ کر آباد ہوئے اور بہیلم قوم سے ان کے وسیع علاقے چھین کرشتکاری شروع کی۔

شاہانی: بلوچوں کا ایک قبیلہ تھا۔ ان کا مورث ''شہانہ خان'' ہے۔

شیخ: جو شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوتا تھا، اسے شیخ کے لقب سے نوازا جاتا۔ تجارت پر اپنی مہارت کی وجہ سے چھائے ہوئے ہیں۔

شیخو: یہ شیخوپورہ کی قدیم قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔

شیرانی: بلوچوں کی شاخ ہے۔ کاشتکاری سے منسلک ہیں۔

طور: راجپوتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

عاربی: جاٹوں کی ایک شاخ ہے۔ بلوچوں کی ایک شاخ بھی اسی نام سے معروف ہے۔

علوی: اعوانوں کی ایک شاخ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اپنا سلسلہ نسب حضرت علیؓ سے منسوب کرتے ہیں۔

علیانی: بلوچوں کی شاخ ''لغاری'' کی ذیلی شاخ (پھلی) ہے۔

قریشی: قریشی خاندان کی تمام شاخوں کا سلسلہ نسب فہر بن مالک سے جا ملتا ہے۔

قیصرانی: ان کا مورث ''قیصر خان'' تھا۔ قیصر خان رند بلوچ تھا اور نہایت محنتی اور امن

پسند ہیں۔

کاٹھو: جاٹوں کی ذیلی شاخ ہے۔ ان کا مورث ''کاٹھا'' نامی جٹ تھا۔

کالرو: کالرو جاٹوں کی شاخ ہے اور کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہے۔

کانجو: ان کا مورث ''کانجن'' یا کانجوں ہے جو راجپوت بھٹی خاندان کے ایک راجے کا بیٹا تھا۔

کاہلوں: جاٹوں سے منسلک قوم ہے۔ اس قوم کا مورث ''راجہ کاہلوان'' تھا۔

کٹانہ: برہمنوں کے مظالم کی وجہ سے یہ نکل کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے محنت مزدوری سے پیٹ پالتے ہیں۔

کچالا: جاٹوں کی ایک گوت ہے۔ عرف عام میں کچالے جٹ کہلاتے ہیں۔

کچھیلا: آبائی طور پر یہ کاشتکار اور قدیم زمیندار ہیں جاٹوں کی ایک شاخ سے متعلق ہیں۔

کلاسرا: جٹ سلسلہ نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''راجہ کالس'' اس قوم کا مورث ہے۔

کلال: یہ کلال، کلوال، کڑوال، کڑیال وغیرہ کے نام سے منسوب ہیں۔ جاٹوں کی شاخیں ہیں۔

کلو: راجپوتوں کی ایک چھوٹی سی ریاست کا دارالحکومت کلو نامی شہر تھا اور یہاں کا حکمران ''راجہ کلو'' کہلاتا تھا۔

کلہوڑا: حضرت عباسؓ کی نسل سے سندھ میں ابراہیم نامی شخص کا نام ''کلہوڑا'' مشہور ہوا۔

کلیار: رانا راج وردھن کا بیٹا ''کلیار'' اس قوم کا مورث ہے۔

کلیانی: بلوچوں کی شاخ ہے۔

کلیرا: سمراء تھل کلاں اور چوبارہ میں مقیم ہیں۔

کمبوہ: جاٹوں کی بڑی مشہور شاخ ہے۔ بعض روایات کے مطابق ان کا سلسلہ ایرانی کائیوں سے ملتا ہے۔

کمنگر: ان کا تعلق جاٹوں سے ہے۔ سقلی گروں کی طرح یہ درباروں سے وابستہ تھے۔ سامان حرب تیار کرتے تھے۔

کمہار: ان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے برتن اور مورتیاں آج بھی پرانے ٹیلوں سے دستیاب ہوتی ہیں۔

کنجال: ان کا جد امجد ''کنجو'' کا ایک جنجوعہ راجہ تھا۔ راجہ کنجو کی مناسبت سے اس کے علاقے کو ''کُنج'' کہا جاتا ہے۔

کنجڑا: سبزیاں اُگانے میں مہارت رکھتے تھے۔

کنگ: راجپوتوں کی شاخ ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس کا مورث ''راجہ جنگ'' تھا۔

کنگر: اس قوم کا شمار پکھی واسوں میں ہوتا ہے۔ خانہ بدوشی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

کنیرا: کنیروں کا سلسلہ نسب جٹوں سے ملتا ہے۔ محنتی قوم ہے اور اس قوم کے اکثر خاندان کاشتکاری سے منسلک ہیں۔

کورائی: بلوچوں کی شاخ ہے۔ مورخین کے مطابق ان کا سلسلہ نسب رند بلوچوں سے ملتا ہے

کوہنہ: جنجوعہ کی ذیلی شاخ ہے۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

کھتران: ان کا شمار بلوچوں میں کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ پٹھانوں کی شاخ ہیں۔

کھچی: اس قبیلے کا مورث راجپوت خاندان کا ''کھچی خان'' تھا۔ کاشتکاری کرتے ہیں۔

کھر: یہ قوم ''کھرل'' ہی ہے جو اختصار کے باعث کھر کے نام سے مشہور ہوئی۔

کھرل: راجپوتوں کی ایک شاخ ہے۔ کاشتکاری کرتے تھے۔

کھکھ: ان کا سلسلہ نسب جاٹوں سے ملتا ہے۔ یہ زمینداری کرتے ہیں۔

کھگہ: قریشی حسب ونسب کے مالک ہیں۔ حضرت جلال الدین سُرخ بخاری کے مریدین میں سے ہیں۔

کھنڈ: زمینداری سے منسلک گھرانہ ہے۔ تعلق مردان کے علاقے سے ہے اور یہ وہاں گنے کی کاشت مہارت رکھتے تھے۔

کھیارا: ان کا مورث ''کھنیا'' تھا جس کا تعلق سندھ کی قدیم قوم ''سمہ'' سے تھا۔

کھوکھر: کھوکھروں کو جاٹوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سرگودھا کے ایک حکمران ''راجہ کوکھڑہ'' کو ان کا مورث قرار دیا جاتا ہے۔

کھیرانی: لیہ میں کھیرانی قوم کے کئی گھرانے آباد ہوتے ہیں۔ ظاہری علامت ''نی'' سے بلوچ لگتے ہیں۔

کھیڑا: سیالوں کے ''رائے سیال'' کا حقیقی بھائی ''رائے کھیڑا'' اس قوم کا مورث ہے۔

کیہل: ملاحوں کی مشہور قوم ہے۔ مچھلیاں پکڑتے ہیں، بیچتے اور کھاتے ہیں۔

گٹ: جاٹوں کی ایک مشہور گوت ہے۔

گجر: ''گجر'' اور ''گوجر'' دونوں طرح سے لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

گدارا: جاٹوں کی شب گوتری شاخ ہے۔ کاشتکاری ان کا آبائی پیشہ ہے۔

گرواں: یہ جاٹوں کی شاخ ہے۔ پیشہ کاشتکاری سے وابستہ ہے۔

گشکوری: یہ بلوچستان کے علاقہ ''گچکور'' سے آنے کی وجہ سے گچکوری اور بعد میں گشکوری کہلائے۔

گگرال: ان کے ایک یا دو گھرانے ضلع لیہ میں مقیم ہیں۔

گل: جاٹوں کی مشہور گوت ہے۔ ان کا مورث ''پرتھی پال'' ہے۔

گورمانی: بلوچوں کا ایک معروف قبیلہ ہے جو ڈیرہ جات سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوا۔

گوڑیانی: غوری پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے۔

گوندل: راجپوتوں کی سورج بنسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مورث راجہ دلیپ کے خاندان کا ایک فرد تھا۔

گھانگرہ: یہ جاٹوں کی ایک گوت ہے۔ کاشتکاری سے منسلک ہیں۔

گھوڑے واس: راجپوتوں کے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دورِ قدیم میں اصطبل پر مامور ہوتے تھے۔

گھلو: جاٹوں کی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

گھمن: یہ راجپوت النسل ہیں۔

لبانہ: یہ بھی راجپوت النسل ہیں۔ اس قوم کے افراد نمک کا کاروبار کرتے تھے۔

لٹی: سندھ کے معروف ''کلہوڑا'' خاندان کو زلفیں بڑھانے کی وجہ سے ''لٹی'' کا نام دیا گیا۔

لدھانہ: ان کا سلسلہ نسب بھی راجپوتوں سے ملتا ہے۔ تجارت اور کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

لڈو: سورج بنسی راجپوتوں میں سے ہیں اور ان کا مورث ''راجہ سوسارا ما'' کو قرار دیا جاتا ہے۔

لڑھکا: جٹ قوم کی شاخ ہے۔ زمیندار طبقہ ہے۔

لسکانی: بلوچوں کا ایک قبیلہ ہے۔ ''لشکر خان'' اس قبیلے کا مورث ہے۔

لشاری: بلوچوں کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ ان کا مورث ''لشار خان'' ہے۔

لغاری: بلوچوں کا اہم قبیلہ ہے۔

لکھویرا: ان کا مورث ''لاکھو ویر'' کو قرار دیا جاتا ہے جو راجپوت النسل تھا۔

لُنڈ: بلوچوں کے رند قبیلے کی ذیلی شاخ ہے۔ ایک سردار نے تلوار سے ایک گھوڑے کی دم کاٹ دی تھی جس کی وجہ سے وہ ''لُنڈ'' نام سے مشہور ہوا۔

لنگاہ: اس قوم کا سلسلہ نسب راجپوتوں سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ ملتان کی قدیم اور مشہور قوم ہے۔

لنگڑیال: ضلع لیہ میں کافی تعداد میں آباد ہیں۔

لودھرا: جاٹوں کی ذیلی شاخ ہے۔ اس کا مورث ''لودھرا'' تھا جو راجپوتوں کے معزز گھرانے کا فرد تھا۔

لودھی: ضلع لیہ میں لودھی گھرانے آباد ہیں۔

لوری: یہ دریائے سندھ کے کناروں پر آباد ہیں۔ محنت کش اور غریب قوم ہے۔

لوہانچ: راجپوتوں کے چوہان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

لیکھی: لیکھی خطاب ہے جو دو الفاظ ''لیکھے'' اور ''علی'' کا مجموعہ ہے جس کے معنی ''وصفِ علی'' کے ہیں۔

لیل: کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

ماچھی: ماچھیوں کے ذمہ دیہاتوں میں روٹیاں پکانا ہوتا ہے۔

مچھیرا: مچھیروں کا سلسلہ نسب کیہل قوم سے ملتا ہے۔

مانگٹ: جاٹوں کی قدیم شاخ ہے۔ کاشتکاری کے ذریعے اپنی گذر بسر کرتے ہیں۔

ماہڑہ: ان کا مورث چغتہ قوم سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اسے چوغتوں کی شاخ کہا جاتا ہے۔

مٹاوا: روایات کے مطابق ڈلو کی ذیلی ذات ہیں جن کا تعلق جٹ قوم سے ہے۔

منجوٹھہ: یہ جٹ قوم سے متعلق ہیں۔

مڑل: اس کا مورث ''مڑھل'' راجپوتوں کے چوہان قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔

مزاری: بلوچوں کی مشہور شاخ ہے جو اپنی شجاعت اور دلیری کے باعث بہت مشہور تھی۔

مغل: اس کا سلسلہ نسب منگول حکمرانوں سے ملتا ہے۔

مکول: انہیں پہلے ''مکے والے'' اور بعد میں انہیں مکے وال، مکوال اور مکول کہا جانے لگا۔

مگسی: یہ بلوچوں کے ایک قبیلے ''لاشاری'' کی شاخ ہیں۔

مکھیانہ: ضلع لیہ کی قدیمی قوموں میں سے ایک ہے۔

ملغانی: بلوچوں کی ایک ذیلی شاخ جن کا مورث ''ملغ خان'' تھا۔ یہ تجارت اور ملازمت پیشہ ہیں۔

ملہی: راجپوت النسل جٹ ہیں۔

ملیانی: رند بلوچوں کی شاخ ہے ان کا مورث ''ملی خان'' تھا۔

ملیحہ: کہا جاتا ہے کہ ملوہیہ، ملوحہ اور، ملیحہ ایک ہی قوم ہے۔

ممراء: جٹ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

منڈا: جاٹوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان کا مورث جوگیوں کی طرح اپنا سر اور ابرو کے بال منڈواتا تھا۔

منگنو: راجپوت النسل ہیں۔ اپنے آبائی پیشے زمینداری کو جاری رکھا۔

موہانہ: یہ ہندوستان کی قدیم ترین قوم کیہل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت جفاکش اور محنتی قوم ہے۔

موہل: یہ ملیحہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

مہار: محمود غزنوی کے تاریخی شہرت یافتہ غلام ''ایاز'' کی اولاد میں ''مہار'' نامی شخص اس قوم کا مورث تھا۔

مہوٹہ: جٹوں کی ذیلی ذات ہے۔

میتلا: کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

میکن: راجپوتوں کی ایک ذیلی شاخ ہے اور زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میلوانہ: ان کا مورث ''میل'' تھا جس کی مناسبت سے یہ میلوآنہ اور میلوانہ کہلائے۔

میوء: میوات میں رہنے والوں کو میوء کہا جاتا رہا ہے۔ میواتی زبان بولتے ہیں۔

ناصر: پٹھانوں کا مشہور قبیلہ ہے۔ ملازمت اور تجارت سے متعلق ہیں اور قاضی کہلواتے ہیں۔

ناگرہ: راجپوت النسل جٹ ہیں۔ ان کا مورث ''ناگرمل'' کو قرار دیا جاتا ہے۔ کاشتکاری کے ساتھ ملازمتوں سے بھی رغبت رکھتے ہیں۔

نائی: قوم کے طور پر جانی جاتی ہے۔ بال مونڈنا، داڑھی بنانا اور بچوں کی گل تراشی جیسے امور ان کے ذمہ ہوتے ہیں۔

نت: جاٹوں کی ذیلی شاخ ہے۔ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

نوتکانی: بلوچوں کی مشہور ذات ''رند'' کی ذیلی شاخ ہے۔ اس کا مورث ''میر عالی نوتک خان'' کو قرار دیا جاتا ہے۔

نول: راجپوت النسل جاٹوں کی ایک شاخ ہے۔ اس کا مورث ''نول'' کو سمجھا جاتا ہے۔

نون: بھٹی راجپوتوں کی نسل سے ہیں۔ ان کا مورث ''راجہ نون'' تھا جو راجہ راج و ردھن کا بیٹا تھا۔

نیازی: پٹھانوں کے پاوندہ قبیلے کی ذیلی شاخ ہیں۔ اپنے مورث ''نیازی'' سے موسوم ہوئے۔

والہلہ: راجپوتوں کے سلسلۂ نسب سے ہیں۔ زمیندار اور ملازمت پیشہ ہیں۔

واہگہ: جاٹوں کی شاخ بیان کی جاتی ہے۔ کاشتکاری اور محنت مزدوری سے پیٹ پالتے ہیں۔

واہنڈر: ان کا سلسلہ نسب جاٹوں سے ملتا ہے۔ ان کے چند گھرانے کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہیں۔

وٹو: ان کا مورث ''وٹو'' راجہ راج پال کا بیٹا تھا۔ کاشتکار پیشہ ہیں۔

ویرڑ: یہ خود کو جاٹوں کی شاخ قرار دیتے ہیں۔

وڑائچ: اس قوم کا سلسلہ نسب سورج بنسی راجپوتوں سے ملتا ہے۔ اس کا جدامجد ''راجہ کرن'' کو گردانا جاتا ہے۔

ولر: جاٹوں سے اس قوم کا نسب ملتا ہے۔ اس کا مورث ''ولر'' تھا جو راجہ پال کی اولاد سے تھا۔

ولک: یہ راجپوت النسل جاٹ ہیں۔ کاشتکاری اور محنت مزدوری سے منسلک ہیں۔

ووہند: ووہند پختون النسل نیازیوں سے منسلک ہیں۔ ان کا مورث ''ووہند'' کہا جاتا ہے جو اٹک میں مقیم تھا۔

وہنیوال: ان کا سلسلہ نسب جاٹوں سے ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا مورث کھیتی باڑی میں وسیع تجربہ رکھتا تھا۔

ونیس: جاٹوں کی معروف اور قدیمی شاخ ہے۔ ان کا مورث ''وائیس'' نامی شخص تھا۔ زمینداری کرتے ہیں۔

دیہا: یہ راجپوت النسل جاٹ ہیں۔ اس خاندان کا مورث ''راجہ بھوناک'' کو قرار دیا جاتا ہے۔ کاشتکاری سے منسلک ہیں۔

ہانس: جاٹوں کی ایک قوم ہے۔ زمیندار اور ملازمت پیشہ ہیں۔ بعض لوگ ان کا مورث ''راج ہنس'' کو قرار دیتے ہیں۔

ہراج: راجپوتوں کی ذیلی شاخ ''سیال'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر کاشتکاری سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہنجراء: راجپوتوں کا قدیم اور ممتاز زمیندار خاندان ہے۔

ہوت: بلوچوں کی معروف اور ممتاز شاخ ہے۔ ماضی کی دلیر اور جنگجو قوم ہے۔

ہوتوانی: بلوچوں کی ایک شاخ ''ہوتوانی'' بھی معروف ہے۔ اس قبیلے کا مورث ''ہوتو خان'' تھا۔

لیہ......آثارِ قدیمہ کے تناظر میں

ناصر ملک

ہزار ہا سالہ تاریخ کے حامل علاقہ لیہ کی ہم عصر دوسری تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں مگر یہاں اکثر عصرِ قدیم کے مظاہر دریائے سندھ کے کٹاؤ، آندھیوں اور انسانوں کی عدم توجہی کے باعث معدوم ہو گئے ہیں۔ یہاں کے پرانے باسیوں کے پاس نسل در نسل سے چلے آتے ٹھیکراتی نشان، قدیم فرمانرواؤں کے سکے اور نوادرات موجود ہیں جو اس علاقے کی قدامت کے مظاہر ہیں۔

نواں کوٹ کے ٹھیکرات اس کی قدامت کا ثبوت ہیں۔ کئی عمارتیں دریا برد ہو گئیں اور کئی عمارتوں میں لوگ رہائش پذیر ہو گئے جنھوں نے بعد میں ان عمارات کو مسمار کر کے نئی عمارتیں ایستادہ کر دیں۔ چنی والا بھڑ تحصیل چوبارہ میں ہے۔ یہ ابتدائی ہڑپہ کی ہم عصر تہذیب رکھتا ہے۔ لمبڑاں والا تحصیل چوبارہ میں ہے اور ابتدائی ہڑپہ دور کی یادگار ہے۔ مقبرہ لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ کروڑ شہر میں مرجع الخلائق ہے۔ 1590ء میں میرانی حکومت کا تاج ''غازی خان چہارم'' کے سر سجا۔ سندھ سے ''آدم شاہ کلہوڑا'' کروڑ میں آیا اور اس نے حضرت لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ روایات میں ہے کہ غازی خان چہارم کے دور میں حضرت محمد یوسف نے وفات پائی۔ حاجی خان چہارم ان کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے ہوت حکمران اسماعیل خان کے تعاون سے حضرت لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ کا روضہ تعمیر کروایا۔ اسماعیل خان ہوت، حاجی خان چہارم اور غازی خان چہارم مرنے کے بعد یہیں دفن ہوئے۔ یہ ان کی لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کی واضح دلیل ہے۔ یہ مزار خوبصورت عماراتی شاہکار ہے۔ اس پر بڑی محنت سے تزئین کاری کی گئی ہے۔

مقبرہ راجن شاہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تحصیل کروڑ میں واقع ہے۔ یہاں حضرت علی راجن شاہ رحمۃ اللہ علیہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا مزار اپنی زندگی میں ہی تعمیر کرایا۔ یہ مزار بالکل حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار جیسا ہے۔ آپ کی وفات 1000ء میں ہوئی اور اپنے تیار کرائے ہوئے مزار میں دفن ہوئے۔

لڈے والا کھوہ تحصیل چوبارہ میں ہے۔ یہ ہڑپہ دور کی ہم عصر تہذیب کا حامل ہے۔ مندر سری گاڑھو لال جی تحصیل کروڑ میں دربار راجن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے قریب واقع ہے۔ 10-1500ء میں تعمیر ہوا۔ برہمن زادہ سری گاڑھو لال جی نے تعمیر کرایا۔ اس کے بعد اس کی اولاد اسی نام سے پہچانی جاتی تھی۔ یہاں پوجا پاٹ کے علاوہ جن بھوت نکالنے کے عمل بھی کئے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ محکمہ اوقاف کے پاس ہے۔ اس سے 121 ایکڑ متصل رقبہ وقف شدہ ہے۔ مندر گاڑھو لال جی کی جگہ فدا حسین نامی ایک شخص نے پٹے پر لے رکھی ہے۔ یہاں اب بھی ضعیف الاعتقاد لوگ جنوں بھوتوں کیلئے تعویز گنڈے لینے آتے ہیں۔ مندر کی عمارت نسبتاً درست حالت میں ہے۔ تعمیر کے مکمل نقوش واضح ہیں۔ عمارت کے اندر ہندوؤں کے مقدس دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ راون کی جنگ کا بھی نقشہ کھینچا ہوا ہے۔

کوٹ سلطان میں ایک دھرم سال واقع ہے۔ سکھ دورِ حکومت سے کافی پہلے اسے تعمیر کیا گیا۔ یہاں ہندوؤں کا مندر تھا جس میں تبدیلی کر کے دھرم سال بنا دیا گیا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کئی ہاتھوں والی طاقتور ''درگاہ دیوی'' کی تصویر اور سکھوں کے عقائد کے مطابق اس کے گرونانک کی تصویر بھی کندہ کی گئیں۔ اپنے عہد کی یہ خوبصورت عمارت اب محکمہ تعلیم کے زیرِ تصرف ہے۔ کوٹ سلطان میں ہی سکھ شاہی کی ایک یادگار شمشان بھومی واقع ہے جو 1897ء میں تعمیر کی گئی۔ یہاں ہندوؤں کی آخری رسومات ادا کی جاتی تھیں۔ اب اس شمشان بھومی میں سینما کی عمارت واقع ہے۔

ایک شمشان بھومی لیہ شہر کے قریب دریائے سندھ کے نالے ''لالہ'' پر سکھ دورِ حکومت میں تعمیر کی گئی۔ اس کے قریب ہی گؤشالہ کی عمارت بھی واقع ہے۔ اس میں اب بھی کئی گھرانے آباد ہیں۔ لیہ کا سب سے مشہور مندر ''مائی ماتاں کا مندر'' تھا۔ یہاں دور دراز سے لوگ چیچک کے موذی مرض کے علاج کیلئے جادو ٹونے کروانے کیلئے آیا کرتے تھے۔ (''ماتا'' مقامی زبان میں

چیچک کو کہا جاتا ہے)۔ اس کے منہدم آثار ابھی بھی اس کے عماراتی خطوط واضح کرتے ہیں۔ 18 ایکڑ کے لگ بھگ رقبہ اس کیلئے مختص تھا جہاں خاص دنوں میں ہندو اکٹھے ہو کر اپنی مخصوص عبادتیں کرتے تھے۔ پل ہزاری کے قریب ہندوؤں کے دو بڑے مندر تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں ان کو منہدم کرا کر دھرم سال باوا یورن داس تعمیر کرایا تھا۔ پریم مندر سکھ دورِ حکومت سے قبل از موجود تھا جس کی مرمت کا کام نرائن چند نے کروایا۔ لیہ میں ایک مشہور مندر ''کالی دیوی کا مندر'' بھی تھا جو منہدم ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی اکثر مقدس عمارتوں میں قیام پاکستان کے بعد مختلف خاندان آباد ہو گئے جس سے ان کی پہچان ختم ہو گئی۔

آسارام بھراتری سکول قیام پاکستان سے قبل لیہ کا مشہور سکول تھا جو ہندوؤں کی عملداری میں چلتا تھا۔ 1901ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ 1912ء میں اسے پرائمری سے مڈل کا درجہ دے دیا گیا۔ ''لال اندر بھان ڈھینگرا'' نے موجود جگہ کا عطیہ دیا اور اپنے خرچ پر عمارت کی بنیاد رکھوائی۔ 1926ء میں اس نے ذاتی خرچ پر تعمیر کی جانے والی عمارت میں قائم مڈل سکول کو ہائی سکول کا درجہ دلوایا اور لالہ آسارام یہاں کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اندر بھان ڈھینگرا کی وفات کے بعد اس کی بیوی نے 25,000 روپے عطیہ دیا جو اس عہد کے لحاظ سے خطیر رقم تھی جبکہ دوسری بیوی ''لیلہ رام'' نے سکول کا ہوسٹل تعمیر کرایا۔ انجمن کے قواعد کی رو سے علاقے میں لاولد فوت ہو جانے والے ہندوؤں کی جائیدادیں اس سکول کی انجمن کے نام وقف ہو جاتی تھی۔ اس سکول کے نام شہری حدود میں 162 کنال اور مختلف چکوک میں 3,000 ایکڑ زرعی رقبہ وقف ہے جو محکمہ اوقاف کی عملداری میں مختلف پٹہ داروں کو دیا جاتا ہے۔ یہاں ہندوؤں کے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مشہور زمانہ ادیب ''کے ایل گابا'' بھی یہاں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انجمنِ اسلامیہ نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ 1952ء میں اسے بلدیہ لیہ کی تحویل میں دے کر اس کا نام تبدیل کر دیا گیا اور ایم بی ہائی سکول رکھا گیا۔ 1964ء میں اس کا نام ایک مرتبہ پھر تبدیل کیا گیا اور ایم سی بھراتری سکول کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یکم جولائی 1978ء کو نیشنلائز ہو کر براہِ راست سرکاری تحویل میں چلا گیا۔ اور ایم سی ہائی سکول کے اسم سے موسوم ہو گیا۔

برج سکھے والا کے عماراتی خطوط چند سال قبل تک قدرے واضح اور قابل فہم تھے مگر اب یہ

برج منہدم ہو چکا ہے۔ یہ میرانی دورِ حکومت میں تعمیر کیا گیا۔

قلعہ دیو پال کو تقریباً 870ء میں راجہ بل کے ایک رشتے دار "راجہ دیو پال" نے تھل پر اپنا جنگی تسلط قائم رکھنے اور حملہ آوروں سے نبٹنے کیلئے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تعمیر کرایا۔اس سے متعلقہ شہر "کوٹ دیپال گڑھ" زبان زدِ عام ہوا (بعد میں اسے کوٹ کروڑ اور کروڑ لعل عیسن کے نام سے مشہور کیا گیا)۔اس قلعے میں اس کا تعینات کردہ گورنر اپنی مستعد فوج کے ہمراہ رہتا تھا۔اس قلعہ کی عمارت اب پوری طرح منہدم ہو چکی ہے مگر کہیں کہیں اس کی موجودگی کے آثار ملتے ہیں۔ چوبارہ میں مٹی سے تعمیر کردہ قلعہ خاندان سادات کے پہلے حکمران سید خضر خان نے تعمیر کرایا۔اس کے بعد اس قلعے کی از سرِ نو تعمیر محمد خان سدوزئی (والی منکیرہ) کے دور میں ہوئی۔ بعد ازاں جب 1821 میں والی منکیرہ حافظ احمد خان کے ہاتھ سے نکل کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ لگا تو اس نے فوجی حکمت عملی کے تحت یہ قلعہ مسمار کرا دیا۔اب سے چند سال قبل اس قلعے کے ملبے سے اس کی ہیئت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا مگر اب ممکن نہیں ہے۔ تھانہ چوبارہ کے عقب میں اس کے آثار دیکھنے کو ملتے تھے۔قلعہ نوانکوٹ بھی سید خضر خان نے تعمیر کرایا تھا۔مٹی کا بنا ہوا ہے اور منہدم حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے ملبے سے اس کی ہیئت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔اسے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مسمار کرا دیا تھا۔

نواں کوٹ میں سکھ دورِ حکومت کی ایک یادگار "دھرم سال" کی دو منزلہ عمارت کی شکل ہے۔یہ کافی بہتر حالت میں موجود ہے اور محکمہ اوقاف کے زیرِ اہتمام پٹے پر دی گئی ہے۔

ابتدائی انگریز دورِ حکومت میں (1850ء) لیہ کو جب ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کا درجہ دیا گیا تو کرنل راس کو پہلا کمشنر بنا کر بھیجا گیا۔وہ یہیں فوت ہو گیا اور اسے یہاں دفن کیا گیا۔اس کی قبر لیہ میں موجود ہے۔ 1849ء میں تعمیر ہونے والی ڈی سی آفس کی عمارت کو کمشنر آفس کا درجہ دیا گیا۔ یہ عمارت قیام پاکستان کے بعد بھی استعمال ہوتی رہی۔ 1982ء میں جب لیہ کو ضلعی ہیڈ کوارٹر کا درجہ ملا تو متروک ہو گئی۔ان کے علاوہ ضلع لیہ میں کئی عہد (بالخصوص سکھ دورِ حکومت) تعمیر شدہ رہائشی عمارات موجود ہیں جن میں قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں نے اپنی رہائش اختیار کر لی۔فتح پور، کروڑ، بستی سبانی، لیہ، کوٹ سلطان، چوبارہ اور نواں کوٹ میں ایسی کئی عمارتیں سالخوردگی کے عالم میں آخری سانس لے رہی ہیں۔

تہذیب وثقافت

لیّہ کے جل تھل میں شہزادہ نائف کا دربار

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

لیہ کا جل تھل مجھے ہمیشہ متاثر کرتا رہا۔ میں یہاں قریباً ایک سال بطور اسسٹنٹ کمشنر تعینات رہا۔ میں 1979ء کے آخر میں شجاع آباد سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس لحاظ سے بطور اے۔سی میری یہ دوسری تعیناتی تھی۔ میں 1981ء کے شروع میں یہاں سے تبدیل ہو کر لاہور سول سیکرٹریٹ میں تعینات ہوا۔

لیہ کے تھل کی خوشبو، چوک اعظم کے سرسبز و شاداب اشجار، چوبارہ کا وسیع و عریض صحرا، کروڑ لعل عیسن کا پرنور مزار، لیہ میں دور دراز کھیتوں میں چرند و پرند، اِدھر بھی تیتر اُدھر بھی تیتر---یہ سب نظارے اب بھی میری آنکھوں میں جھلملا رہے ہیں۔

لیہ میں تعیناتی کے دوران بعض عظیم ہستیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ چوبارہ سے چند کلومیٹر دور نواں کوٹ میں سعودی عرب کے وزیر داخلہ شہزادہ نائف بن عبدالعزیز شکار کے سلسلے میں دسمبر 1979ء اور 1980ء میں تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ قریباً 250 سعودی مہمانوں کا قافلہ تھا۔ تلور کا شکار کھیلنے کے لئے آپ یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کے ہمراہ شہزادہ سعود بن عبدالعزیز بھی تھے۔ ان دنوں وہ کسی امریکن یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ چوبارہ میں ان سعودی مہمانوں کی وجہ سے پورا صحرا دلہن بنا ہوا تھا۔ سرشام جنریٹر چلنا شروع ہو جاتے۔ سیٹلائٹ کے ذریعہ ان کا رابطہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق اور سعودی حکومت سے ہر وقت رہتا۔ وسیع و عریض دستر خوان، جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے، قیمتی قالین، خوبصورت خیمے، بڑے خیمے کے پیچھے سجے

ہوئے باز جن کی آنکھوں پر چمڑے کے کیس بندھے ہوئے تھے اور وہ خوبصورت سٹینڈز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض پرندے تو اتنے قیمتی تھے کہ ان کی مالیت 4 لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اس لحاظ سے یہ باز کروڑوں روپے کی مالیت کے تھے۔ ایک شام کمشنر ملتان لیفٹیننٹ کرنل نثار احمد خان اپنے بیٹے فیصل کے ہمراہ وہاں سعودی وزیر داخلہ سے ملنے آئے۔ دربار میں جو وسیع وعریض خیموں پر مشتمل تھا' بیٹے نے کمشنر صاحب سے پوچھا۔ ابو! یہ پرندے کون سے ہیں؟ میرے منہ سے باز کا عربی لفظ ثغر نکل گیا۔ سعودی وزیر داخلہ چونک اٹھے اور آپ نے پوچھا یہ شخص کون ہے جس نے لفظ ثغر استعمال کیا ہے۔ میں عربی زبان میں مخاطب ہوا کہ میں شہر لیّہ کا قاضی ہوں (اسسٹنٹ کمشنر کا متبادل لفظ عربی زبان میں نہیں مل سکا لہٰذا قاضی ہی استعمال کیا)۔ وزیر صاحب بہت خوش ہوئے اور عربی میں ہی پوچھا کہ تم نے عربی زبان کہاں سے سیکھی میں نے عرض کیا گورنمنٹ کالج لاہور سے۔ میں نے اجازت طلب کی اور جاہلی شاعری (قبل از اسلام کی شاعری) میں سے حماسہ ابوتمام کے اشعار سنائے۔ تمام مہمان لطف اندوز ہوئے۔ اس شام 12 ربیع الاول کا مبارک دن تھا۔

اکثر ہم شاہی مہمانوں کے ساتھ ہی خیمے میں کھانا کھاتے۔ دسترخوان پر انتہائی عمدہ سعودی کھانے سجے ہوتے۔ مکمل بکرے سجی کر کے دسترخوان پر رکھے جاتے۔ ہمارے ہمراہ شہزادہ سعود بن عبدالعزیز تھے۔ وہ بڑے خیمے سے ننگے پاؤں ہی کھانے والے خیمے میں آئے اور کہنے لگے ہمارے ٹیلوں کی خنکی دل کو بھاتی ہے۔ میں نے لیّہ کے بارے میں تاثرات پوچھے تو کہنے لگے کہ یہاں کا پانی بہت عمدہ ہے اور شیریں بھی۔ زمین سرسبز ہے اور درخت بہت خوبصورت اور گھنے ہیں۔

ایک شب مترجم نے بتایا کہ آج وزیر داخلہ سخت پریشان ہیں کیونکہ ان کا ایک انتہائی قیمتی باز اُڑ گیا ہے۔ باز اور تلور کی لڑائی ہوتی ہے۔ باز تلور کو قابو کر لیتا ہے اور اس طرح یہ پُرلطف جنگ شاہی مہمان دیکھتے اور شکار شدہ تلوروں کو منجمد کر کے ساتھ لے جاتے۔ ہم نے مترجم کے ذریعے اس باز کی عادات پوچھیں تو پتہ چلا کہ وہ اُونچی جگہ پر بیٹھتا ہے۔ پٹواریوں اور گرداور صاحبان سے کہا کہ باز کو تلاش کرو۔ اگلے دن ایک پٹواری بھاگتا آیا کہ جناب باز مل گیا ہے۔ وہ ایک ٹریکٹر پر بیٹھا تھا اور اسے ماہرانہ طریقے سے پکڑ لیا گیا ہے۔ یہ باز بھی قریباً 4 لاکھ کی مالیت کا تھا۔

چنانچہ شاہی دربار میں باز کو پیش کر دیا گیا۔ انتظامیہ کے اہلکار بعض دفعہ ناممکن کاموں کو بھی اپنی محنت، عقل سے ممکن بنا دیتے ہیں۔

اکثر میری جیپ کو چوک اعظم چوکی والے پولیس اہلکار روک لیتے اور کہتے جناب اسلام آباد کے سفارت خانے اور وزارت خارجہ اسلام آباد سے شاہی مہمانوں کے لئے ایک پیغام بذریعہ سعودی ٹیلی فون وصول ہوا۔ جناب اس پیغام کو وصول فرما کر وزیر صاحب تک پہنچا دیں۔ جب ہم وہاں چوبارہ پہنچتے تو مترجم کے ذریعے پیغام بھجواتے۔ پتہ چلتا کہ یہ پیغام سیٹیلائٹ کے ذریعے بڑی دیر کا براہ راست شاہی مہمانوں تک پہنچ چکا ہے۔ ہم دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے کہ اس جدید دور میں بھی ہم کس قدر پسماندہ ہیں۔ قریباً 2 ہفتوں کے بعد جب شاہی مہمان الوداع ہونے لگے تو میں نے ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ' خان محمود الزمان خان (مرحوم) کی اجازت سے عربی میں الوداعی خطبہ سعودی وزیر داخلہ اور دیگر سعودی زعماء کو سنایا۔ آخری جملہ یہ تھا کہ خدا کرے ہم دوبارہ اس جل تھل میں اس طرح اکٹھے ہوں۔ شہزادہ نائف بن عبدالعزیز بہت خوش ہوئے اور تین دفعہ انہوں نے فرمایا: شُکراً' شُکراً' شُکراً

انہوں نے شکریہ ادا کیا اور مجھے اور میرے سٹاف کو انتہائی قیمتی گھڑیاں بھی تحفہ میں دے گئے۔ قافلہ کو الوداع کرنے کے بعد میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے گفتگو کی اور عرض کیا کہ جناب خطبہ کیسا رہا۔ کہنے لگے تم نے خطبے میں میرا نام تو عزت سے لیا تھا یعنی دو دفعہ خان کا لفظ استعمال کیا (خان محمود الزمان خان) لیکن تم نے لفظ ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ کی جگہ محافظ مظفر گڑھ استعمال کیا۔ محافظ تو سپاہی کو بھی کہتے ہیں۔ تم نے یہ لفظ استعمال کر کے تمام مزہ کرکرا کر دیا۔ پھر ڈپٹی کمشنر صاحب برس پڑے اور فرمانے لگے کیا تم نے اخباروں میں عدالتی اشتہارات نہیں دیکھے لکھا ہوتا ہے ''دستخط حاکم''۔ میں نے عرض کیا کہ حاکم تو گورنر ہوتا ہے آپ گورنر تو نہیں ہیں۔ بڑی مشکل سے سمجھایا کہ کویت میں ڈپٹی کمشنر سے ملتا جلتا ایک ادارہ ہوتا ہے جسے محافظہ کہا جاتا ہے۔ آپ کے عہدے کو وزیر داخلہ سمجھ گئے ہوں گے اس طرح اپنے بزرگ ڈپٹی کمشنر کو بڑی مشکل سے راضی کیا۔

ان دنوں میرے ساتھی ایک معمر ڈی ایس پی پر بھی عربی زبان کا خاصا اثر ہو گیا ایک دفعہ میں ایک خیمے میں داخل ہوا تو موصوف بڑی روانی سے اپنے اہلکاروں سے عربی بول رہے تھے۔

میں بہت خوش بھی ہوا اور متاثر بھی کہ ڈپٹی صاحب پولیس آفیسر ہو کر بھی خاصے اہلِ علم ہیں بلکہ مجھ سے بھی زیادہ عربی زبان میں رواں ہیں۔ میں سنتا رہا اور دل ہی دل میں کہتا رہا کہ سبحان اللہ! چوبارہ کا یہ جل تھل اور ڈپٹی صاحب کی رواں عربی میں گفتگو! ماحول کا کیا زبردست اثر ہوتا ہے۔ جب وہ عربی بول بول کر تھک گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ ڈپٹی صاحب آپ کے بارے میں تو آج انکشاف ہوا کہ آپ عربی بڑی روانی سے بول لیتے ہیں۔ گو میں آپ کی عربی سمجھ تو نہیں سکا بھلا بتائیں کہ آپ نے یہ عربی کہاں سے سیکھی۔ فرمانے لگے کہ قبلہ والد صاحب کافی عرصہ عراق میں رہے ہیں اور میں بھی وہاں ان کے زیرِ سایہ رہا، وہاں سے میں نے عربی سیکھی۔ ساتھ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ میں عربی میں اپنے اہلکاروں کو گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اُف الامان کہہ کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

اُس دوران پاکستان کے مشہور شکاری تہور علی خان بھی تشریف لائے اور شاہی مہمانوں سے ملے۔ چیتے اور شیر کے شکار کے قصے سناتے رہے کہ کس طرح انہوں نے بنگلہ دیش میں ان خونخوار جانوروں کا شکار کیا۔

شاہی مہمانوں سے ہم کافی متاثر بھی ہوئے۔ جب مغرب یا عشاء کا وقت ہوتا تو ہم سب باجماعت نماز پڑھتے، جب کھانے کا وقت ہوتا تو ان کے ہمراہ قالینوں پر بیٹھ کر کھانے کے خیموں میں کھانا کھاتے۔ مساوات کا ایک اعلیٰ نمونہ دیکھا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔

شکاریات، جنگلی حیات

ہمارا قومی ورثہ

فضل علی سمرا

لیہ کو جولائی 1982ء میں ضلع کا درجہ ملا۔ اس میں تحصیل کروڑلعل عیسن، تحصیل لیہ اور تحصیل چوبارہ شامل ہیں۔ ضلع بھر میں گیم سینکچری صرف تین ہیں جس میں ماچھو پلانٹیشن گیم سینکچری ،عنایت پلانٹیشن گیم سینکچری اور راجن شاہ پلانٹیشن گیم سینکچری قابل ذکر ہیں۔

گیم سینکچری کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ ایسی باؤنڈری جس میں شکار کھیلنے کی ممانعت ہو۔ باہر کا جانور اندر آسکے اور نہ اندر کا جانور باہر جاسکے اور نہ قدرتی ماحول اور آب وہوا میں کسی قسم کی مداخلت ہو سکے۔ گیم ریزرو میں ماسوائے سپیشل پرمٹ کے حامل افراد کے کسی کو شکار کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس ضلع میں تحصیل چوبارہ کا سارا علاقہ گیم ریزرو ہے اور یہاں ہرن اور خرگوش پائے جاتے ہیں جبکہ لومڑی، جنگلی سور اور سیہہ ضلع کے دیگر علاقوں میں بکثرت ہیں جن کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ پرندوں میں تیتر مقامی پرندہ ہونے کی وجہ سے بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کے تحفظ کیلئے مقامی محکمہ وائلڈ لائف نے اپنی استعداد کے مطابق بہتر اور مثبت اقدامات کیے ہیں۔

شکاری پرندوں میں باز جو کہ مقامی طور پر پایا جاتا ہے جبکہ چرگ سائبیر یا روس سے ہجرت کر کے آتا ہے۔ اسی طرح مہاجر موسمی پرندے جن میں مرغابی، مگھ ودیگر (آبی) پرندے شامل ہیں جبکہ کونج، تلور اور بیٹر بھی سائبیر یا سے موسم سرما میں نقل مکانی کر کے قلیل عرصہ کیلئے پاکستان آتے ہیں۔ ٹھنڈے ماحول اور آب وہوا کے عادی ہونے کی وجہ سے گرمیوں کی آمد سے قبل

واپس چلے جاتے ہیں۔فاختہ،جنگلی کبوتر اور سہڑا بھی مقامی پرندے ہیں جو ہر جگہ اڑتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وائلڈ لائف ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جو شکاری گیم سینکچری اور گیم ریزرو میں شکار کھیلے گا اسے 5ہزار روپے جرمانہ اور 2 سال قید کی سزا بھگتنا پڑتی ہے جبکہ ضلع کے باقی مقامات پر مروجہ قواعد وضوابط کی خلاف ورزی پر شکار کے مرتکب افراد کو کم از کم ایک ہزار روپے تک جرمانہ کیا جاسکتا ہے۔

محکمہ تحفظ جنگلی حیات کی طرف سے لائسنس یافتہ شکاریوں کو کئی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔
مزید برآں ضلع لیہ سعودی شہزادگان اور شاہی احکام کے شکار کیلئے مخصوص ہے جو ہر سال موسم سرما میں آکر تلور کے شکار کیلئے صرف 2 ماہ کیمپ لگاتے ہیں اور شکار سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔آبی پرندوں کیلئے شکار کا موسم 15 اکتوبر سے 30 مارچ تک جبکہ تیتر اور دیگر پرندوں کیلئے 15 نومبر سے 15 فروری تک شکار کی اجازت ہوتی ہے لیکن اس کیلئے بھی حکومت کی طرف سے باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کیا جاتا ہے جس میں مختلف اضلاع کی ایک یا چند تحصیلوں میں تیتر کے شکار کی اجازت ہوتی ہے اور شکار کیلئے کھلے علاقوں میں گزٹیڈ چھٹی اور جمعہ کا دن مقرر ہے۔شوٹنگ لائسنس کی سالانہ فیس مبلغ 2 سو روپے جبکہ لائسنس تیتر کی اجراء فیس مبلغ 50 پچاس روپے وصول کی جاتی ہے۔

ضلع لیہ میں کوئی بریڈنگ سنٹر نہیں ہے۔البتہ گیم سینکچریوں میں پرندوں اور جانوروں کی بریڈنگ کیلئے مخصوص سیزن کے دوران ان کے انڈوں اور بچوں کے بچاؤ اور تحفظ کیلئے کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔اسی طرح جنگلی حیات انکے بچوں اور انڈوں کو نقصان پہنچانے اور وائلڈ لائف ایکٹ کی خلاف ورزی کرنیوالے شکاریوں کے خلاف سخت کاروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔مزید برآں محکمہ تحفظ جنگلی حیات کی طرف سے شکاریوں اور جنگلی حیات کے شائقین افراد کی رہنمائی اور معلومات کیلئے پوسٹر،نقشہ جات اور دیگر مطبوعہ مواد بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ضلع لیہ میں تقریباً ہر ماہ چھ ہزار روپے وائلڈ لائف ایکٹ کی خلاف ورزی کے مرتکب شکاریوں سے بطور جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔جنگلی حیات کے زیادہ نقصان کی صورت میں جرمانہ کی شرح بھی بڑھ جاتی ہے۔اسی طرح لائسنس فیس کو بھی باقاعدگی سے سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔جولائی 1982ء

سے قبل لیہ کو سب ڈویژن کی حیثیت حاصل تھی جو ضلع مظفرگڑھ سے منسلک تھا۔محدود پیمانے پر کام کی وجہ سے معمولی ریونیو خزانہ میں جمع ہوتا تھا۔لیہ کو ضلع کا درجہ ملنے پر محکمہ تحفظ جنگلی حیات کا خودمختار ضلعی دفتر قائم کیا گیا جس کی بدولت آج حکومت کو لاکھوں روپے کی باقاعدہ آمدنی ہو رہی ہے۔مزید برآں عدالتی جرمانے بھی قومی خزانے میں جمع ہو رہے ہیں۔
جنگلی حیات کے تحفظ کیلئے دنیا میں کئی طریقے رائج ہیں۔ایک طریقہ حفاظت کا یہ ہے کہ ہم قانون نافذ کرتے ہیں جو مکمل حل نہیں ہے۔جنگلی حیات ہمارا قومی ورثہ ہے اسے ہم مکمل تحفظ فراہم کریں اور یہی ہر مہذب قوم کا وطیرہ ہے۔مزید برآں ہمیں اپنے معاشرہ اور عوام میں جنگلی حیات کا شعور پیدا کیا جائے کہ یہ کیوں ضروری ہے،اگر یہ ختم ہوگئی تو ماحول پر اسکے کیا منفی اثرات مرتب ہونگے۔قدرت نے ہر چیز اور ہر جاندار کا اپنا اپنا دائرہ کار متعین کر رکھا ہے اگر اس میں معمولی غفلت اور کمی پیدا ہو جائے تو متعلقہ ماحول ضرور متاثر ہوتا ہے۔پاکستان میں کئی سال اس شعبہ کو نظرانداز کیا گیا مگر اب تحفظ جنگلی حیات کے بارے میں بچوں اور بوڑھوں کو تعلیم وشعور دیا جائے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جنگلی حیات مرنے سے بچ جائے گی اور یہی ہماری ملکی اور قومی پالیسی کا مدعا ہے۔پاکستان بھرپور میں قانون تعلیم اور بھائی چارے کے ذریعے جنگلی حیات کا تحفظ ممکن ہے۔محکمہ تحفظ جنگلی حیات کو اپنی آمدنی بڑھانے کیلئے بھرپور اور مثبت اقدامات کرنے چاہیے۔
اسی طرح دوسرے شکاریوں کے لائسنس فیس مناسب وصول کی جائے۔اگر شکاریوں میں زیادہ لائسنس فیس کی وجہ سے شکار کا شوق کم یا ختم ہوگیا تو غیر قانونی طور پر شکار کرنیوالوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور نیٹنگ سے تیتر،مرغابی،مگھ،سرخاب کونج،بھٹ اور چکور وغیرہ کی نسل مکمل طور پر ختم ہو جائے گی متعلقہ محکمہ (تحفظ جنگلی حیات) اپنی پالیسیوں کو جدید خطوط پر استوار کرے اور محکمانہ کارکردگی کو زیادہ افعال بنانے کے ساتھ ساتھ نایاب جانوروں اور پرندوں کے مکمل تحفظ کیلئے بہتر اقدامات کرے تاکہ آئندہ نسلیں جنگلی حیات کا اثاثہ دیکھ سکیں۔اور محکمہ تحفظ جنگلی حیات کو چاہیے کہ اپنی تمام تر توجہ نایاب اور قیمتی جانوروں اور پرندوں کی حفاظت پر مرکوز کرے۔
گیم ریزرو میں عام طور پر تیتر شکار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔میملز بالکل ممنوع ہیں لیکن صرف سور کا شکار کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح گیدڑ،لومڑی،چوہا،سیہہ اور جنگلی بلا جس کی قانون میں اجازت ہے شکار کئے جاسکتے ہیں۔جنگلی حیات کے خاتمے اور کم ہونے کی کئی وجوہات ہیں

جن میں چیدہ چیدہ یہ ہیں۔

جنگلات کا کم ہونا، ژالہ باری و دیگر قدرتی آفات، کیڑے مار ادویات کا استعمال، جنگلی جانوروں کے باعث جنگلی حیات کے انڈے اور بچوں کا ضیاع آبی ذخیروں میں کمی اور شدید موسمی حالات شامل ہیں۔ اسی طرح ایٹمی تجربات نے بھی قیمتی پرندوں جن میں مرغابی، مگھ، سرخاب شامل ہیں کی ہلاکت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قانون کی بالادستی کو یقینی بنایا جائے اور وائلڈ لائف ایکٹ کی خلاف ورزی کے مرتکب شکاریوں سے کسی قسم کی رعایت نہ برتی جائے۔ پاکستان میں خطرناک حد تک کم ہوتی ہوئی جنگلی حیات کیلئے یہ ضروری ہے کہ ناجائز شکار کی ہر صورت میں حوصلہ شکنی کی جائے ورنہ پاکستان قیمتی جنگلی حیات جن میں پاڑا، چنکارہ، کالا ہرن، نیل گائے، اڑیال، برفانی ریچھ، گوڑی بکری فیزنٹ برفانی ہرن شامل ہیں سے محروم ہو جائیگا جو قومی ورثے کا سخت نقصان ہوگا۔

کوٹلہ حاجی شاہ میں میلہ

نسیم لیہ

میلے زندہ قوموں کی زندہ علامتیں ہوتے ہیں۔ میلے ٹھیلے ثقافتی ریلے، تہذیبی وثقافتی ہنگامے دول دمامے چہل پہل رونقیں علاقائی کھیلیں، دھریس، جھمر، ویلیں، تماشے، مصری بتاشے جانے ایک میلے میں کیا کیا جشن بپا ہوتے ہیں۔ کہیں گھڑ دوڑ، کہیں کبڈی، کہیں کشتی، کہیں مشاعرے کہیں راگ رنگ کی محفلیں، کہیں تقاریر و مواعظ حسنہ، کہیں دکانیں، کہیں اذانیں، کہیں مہمانی میزبانی، کہیں تیمارداری، کہیں گرم بازار، کہیں گاہکوں کی بھرمار، کہیں ریکارڈنگ کی یلغار غرض کہ تاحد نظر، زندگی کی ایک لہر رواں دواں دکھائی دیتی ہے اور گرم جوش انسانوں کا ایک بے کراں سمندر موجزن ہو کر ہر سمت ہر طرف اپنے مدوجزر کا انقلابی مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ خاص میلے کی مقصدیت میلے میں شریک ہونے والے شہری اور دیہاتی پر واضح ہو سکتی ہے۔ حکومتی سطح پر کسی بڑے ادارے کی جانب سے میلے کا انعقاد آمدنی میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ میلے کی اس آمدنی سے ادارہ، شہری یا دیہی بہبود پر دل کھول کر خرچ کرتا ہے اور سماجی و معاشرتی مسائل حل کر کے پل، سڑکیں، روشنی، پانی، مدرسے، ہسپتال، ڈسپنسریاں وغیرہ تعمیر کر کے عوام کو سہولتیں میسر کرتا ہے۔ یہ قومی وملی اداروں کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس طرح کے ہر سال پاکستان میں کتنے ہی میلے منعقد کیے جاتے ہیں اور کتنے ہی جشن بپا ہوتے رہتے ہیں۔ جشن اور میلے زندگی کے لئے اشد ناگزیر اور اہمیت کے حامل ہیں اور تقریبات کی ضمانت ہیں۔ اگر میلے اور جشن نہ ہوں تو زندگی گھٹن کی نذر ہو جائے اور سکون وطمانیت، تہنیت وانبساط کے دریچے نہ کھل سکیں، تازہ ہوا کے لئے یہ دریچے کھلنا بہت ضروری ہے۔ تازہ ہوا کے جھونکے زندگی کو تازہ دم رکھتے

ہیں اور موسم کا نکھار نئی توانائی، نئی تازگی بخشتا ہے ان سدا بہار میلوں کی اہمیت سے انکار کفر ہے۔

گزشتہ دنوں ہمارے لیہ میں ایک عدیم النظیر اور فقید المثال میلہ کوٹلہ حاجی شاہ میں اس دھوم سے بپا ہوا کہ گزشتہ سال کے التواء کا ازالہ ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر ضلع لیہ سرفراز الحق بیگ نے اس میلے کا افتتاح کیا۔ جب کہ مہمانِ خصوصی اصغر علی گجر ایم پی اے اور محمد اکبر نوانی تھے۔

ڈسٹرکٹ کونسل لیہ کا یہ میلہ اپنی انفرادیت اور اہمیت کے لحاظ سے بہت ہی یکتا اور اکائی کا حامل تھا، جس میں تنوع اور رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیئے گئے اور لیہ کی اہمیت کو ایک تاریخی حیثیت سے منوایا گیا لیکن افسوس کہ ادبی پروگرام اور مشاعرے کا آئٹم اس دفعہ فراموشی کی نذر ہو گیا۔ حالانکہ علاقائی تہذیب و ثقافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس بہت بڑے میلے سے اراکین ڈسٹرکٹ کونسل اور سیاسی زعما بالخصوص سرائیکی مشاعرے کے انعقاد میں ممد ثابت ہوتے جس میں معروف مقامی و مہمان شعراء کو مدعو کیا جاتا کیونکہ سرائیکی مشاعرے کے انعقاد سے میلے کی افادیت دوبالا اور رونق دو آتشہ ہو جاتی۔

تھل میں شادی کی رسمیں

نسیمِ لیہ

☆ ڈھولک ☆ گنڈھیں ☆ منگنی ☆ کانڈھے ☆ بیور ☆ میل ☆ وری سُوئی ☆ دھریس ☆ جُھمر ☆ چندرانہ ☆ گانا ☆ رنگ ڈالنا ☆ آگے دی رات ☆ آگے دا بھت ☆ مینڈھی ☆ چُھری ☆ سبالا ☆ گھڑا چھونی ☆ کھارا ☆ باٹن ☆ پھنڈر لیک ☆ جنج ☆ لاداں ☆ نیندر ☆ سلامی ☆ ڈاج ☆ حق مہر ☆ پلو باندھنا ☆ موہاڑی پکڑنا ☆ سکھیوا ☆ رُٹھی ٹھہری ☆ پہاج ☆ وٹہ سٹہ

دعائے خیر اور گنڈھیں باندھنے کے اس سلسلہ کو منگنی کہا جاتا ہے۔ پھر لڑکے والوں کی طرف سے کانڈھے پھیرے جاتے ہیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے شادی کے مقررہ دن اور تاریخ پر برادری اور رشتہ داروں کو دعوت میں شرکت کو کانڈھا یا گنڈھ کا نام دیا جاتا ہے۔

منگنی کی تقریب منانے کے لئے برادری یا محلہ کی عورتیں جمع ہو کر بڑے دھوم دھڑکے سے گانے بجانے والی عورتوں کے جھرمٹ میں ڈھولک کی خوش آہنگ اور تیز تھاپ پر دلہا کے ''سہرے'' گاتی لڑکی والوں کے گھر لڑکی کی لال پوشاک بیور پہنانے کی غرض سے روانہ ہوتی ہیں۔ دلہن کی ''لال پوشاک'' خوشبودار تیل، طلائی زیورات اور بالخصوص یہاں کی ایک خاص قسم کی چیز پنجیری (جو خالص گھی اور چینی سے تیار کی جاتی ہے) چنگیر میں بڑے سلیقے سے دایہ کے سر پر رکھی جاتی ہے۔ دایہ بڑے والہانہ انداز سے خوشیوں کی ترنگ میں خراماں خراماں سر پر چنگیر کو اٹھائے اس طرح عورتوں کے وسط میں جلوہ گر ہوتی ہے جیسے کوئی محنت کش گلنار جٹی اپنے کسان

شوہر کے لئے سر پر روٹیوں کا چھابڑا یالسی کا دملا اٹھائے ہرے بھرے کھیتوں کی جانب قیامت برپا کرتی جاتی ہے۔

پھر لڑکی والوں کے گھر یہ غول نسوانی دھریس اور جھمر جیسے علاقائی رقص کا مظاہرہ کر کے شادی کے ماحول کو خلد آثار اور سر نوس نگاہ بنا دیتا ہے۔ ڈھولک اور سہرے کے ساتھ یہ دھریس اور جھمر کا مظاہرہ میل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سہرے درحقیقت وہ لوک گیت ہیں جو میل کے وقت مراثنیں ڈھولک کی تھاپ پر اونچی اور سریلی آواز میں گا کر محظوظ ہوتی ہیں۔

اس کے بعد لڑکے والوں کے گھر میں نئے چاند کی پہلی تاریخ کو رسم چندرانہ ادا کی جاتی ہے جس میں ڈھول اور شہنائی کی گھمبیر گونج میں پہلی چاندرات کو سلامی دی جاتی ہے اور برادری کو جمع کر کے ڈھولی کو ''ویل'' یعنی اس خوشی میں ڈھول بجانے والے کو روپیہ 'اٹھنی' چونی بطور نذرانہ دیا جاتا ہے۔ جس پر وہ ڈھولی ''ویل'' دینے والے کا نام لے کر اسے دعا کے رنگ میں داد و تحسین پیش کرتا ہے۔ اس رسم کو چندرانہ کہتے ہیں۔

چندرانہ کے بعد شادی تک ہر شب محلے اور برادری کی عورتیں جمع ہو کر ''دولہا'' کے نام پر سہرے گاتی ہیں اور میل کا اہتمام کر کے تقریب شادی کی مسرتوں کو دوبالا کرتی ہیں۔

چندرانہ بجانے کے بعد شادی سے ایک دن پہلے سرخ وسفید تاگا (دھاگا) جس میں لوہے کی تاروں سے بنا ہوا چھلا بھی شامل ہوتا ہے جو برادری کے کسی بزرگ آدمی کے دست مبارک سے خانقاہ یا مسجد کے دروازے پر جا کر دولہا کی کلائی میں باندھ دیا جاتا ہے اسے گانا کہتے ہیں گانا۔ باندھنے کے بعد دولہا کے دوست احباب اور برادری کے لوگ اس کے ملبوس پر مختلف رنگ چھڑک کر اپنی رنگا رنگ خوشیوں کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ خوشی کے موقع پر رنگ پاشی کی یہ رسم درحقیقت ''ہولی'' کا دوسرا روپ ہے جو ہندو مسلم مخلوط قوم سے ہمیں ورثے میں ملی ہے۔

اگر خوش قسمتی سے یہاں آپ کو کسی شادی بیاہ میں شرکت کا موقع میسر آیا تو آپ نے یقیناً یہ دیکھا ہوگا کہ دلہن (کنوار) کے حنائی ہاتھوں کی طرح دولہا (گھوٹ یا گھبرو) کو بھی مہندی سے اپنے ہاتھ رنگنے پڑتے ہیں پھر اس کے سرخ سرخ ہاتھ میں باقاعدہ چھری دی جاتی ہے تا کہ اس کے آہنی اثرات سے تعویز گنڈا اور جنات کا سایہ وغیرہ غالب نہ آنے پائے اس اثنا میں شہ بالا کا ساتھ لازمی ہے پھر دولہا جی کو ایک لال کپڑا جسے یہاں کی اصطلاح میں ٹھپڑا کہتے ہیں اور ہار دیا

جاتا ہے تا کہ یہ سرخ فام ٹھپڑا اس کی شخصیت کو اور سرخ رو کر لے پھر لطف کی بات یہ ہے کہ دولہا میاں. دولہا ہو کر بھی پرانے کپڑوں میں ملبوس رہتا ہے جب تک کہ اسے کھارے نہ چڑھایا جائے۔

کھارے چڑھنا دولہا کے لئے بہت خیر و برکت کی گھڑی ہوتی ہے۔ کھارے چڑھنا دراصل دولہا کو نہلانے کی ایک رسم ہے۔ وہ کپڑا جو نہانے سے پہلے وہ اوڑھے ہوئے ہوتا ہے، وہی دولہا کے سر پر سائبان کی طرح تان دیا جاتا ہے کہ چاروں کونے سے ایک ایک آدمی اسے تھامے رہتا ہے اور دولہا اپنے شفق رنگ ٹھپڑے کی چھاؤں میں غسل کرتا ہے اور پھر پانی سے بھرا ہوا بھاری بھر کم گھڑا وہ محض ایک ہی ہاتھ سے اٹھا کر سر پر انڈیلتا ہے۔ ایک ہاتھ کے ساتھ وزنی گھڑے سے پانی انڈیلنے کی اس جل تھل رسم کا دو تین بار اعادہ کیا جاتا ہے۔ اس انداز سے نہانے کے پورے شغل کو کھارے چڑھنا کہتے ہیں۔

کھارے چڑھنے یا نہا لینے کے بعد وہ اپنا پرانا ملبوس اتار دیتا ہے جو یہاں کے رواج کے مطابق حجام (نائی) کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ سسرال سے سِلا سلایا نیا لباس زیب تن کر کے تازہ اور رنگین وخوشگوار پھولوں سے سجا دیا جاتا ہے۔ جب دولہا بن ٹھن کے غسل کرنے کی رسومات پوری کر کے پہلا قدم باہر رکھتا ہے تو اسے سسرال سے بھیجے ہوئے نئے پاپوش (جوتے) پہن کر اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے چھوٹی یعنی مٹی کی ڈھکنی (چپن) کو چور چور کر دینا پڑتا ہے۔ اس فاتحانہ رسم کے بعد دولہا پر یک لخت پیسوں کی بارش ہو جاتی ہے، پھر دولہا اپنی برادری اور باراتیوں کو بڑے ادب و احترام کے ساتھ جُھک جُھک کر سلام کرتا ہے۔ جس کے جواب میں برادری کے لوگ پانچ پانچ یا دس دس کے کڑکتے نوٹ پیش کر کے اس کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ سلام کی یہ وزنی اجرت دولہا کے لئے بڑی دل بستگی کا باعث ہوتی ہے۔ ادھر ڈھول پیٹنے والے زور زور سے ڈھول کی ڈھم ڈھم شہنائی (شرفاہ) اور طوطی بجانے والے اپنی سریلی گونج سے شادیانے کی رسم کو نکتہ عروج پر لے جا کر شادی کی تقریب کو نقار خانہ بنا دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب سماں ہوتا ہے۔ بڑے بڑے بوڑھے کھوسٹ بزرگوں کا جی للچا جاتا ہے۔ تاہم اس وقت شرم کے عالم میں دلہن اپنی جنبش لب سے اتنا کہہ پاتی ہے کہ میرے مختار میرے والد بزرگوار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ باحیا دلہن اپنے اظہار میں ہوتی ہے کہ بالغ ہونے تک جس کے قدموں

سے میں نے اپنی آبرو کا تحفظ کیا ہے آج بھی میرا وارث اور مختار وہی ہے میرا ہاتھ جس کے ہاتھ
میں تھمادے اس کو کھلی آزادی اور میری جانب سے کُل اختیار حاصل ہے۔

ان شرعی بندھنوں کے بعد پھر دولہا کو لاواں کی غیر شرعی رسم کے دائرے میں گھیر لیا جاتا
ہے۔ ویسے لاواں ایک دلچسپ اور نہایت ہی بامذاق رسم ہے۔ جس میں برادری کی بڑی بوڑھیاں
کہتی آئی ہیں کہ لاواں سے دولہا دلہن کو احتیاط لازم ہے کیونکہ مخالفوں کی طرف سے تعویذ گنڈے،
کالا جادو، طلسمات ٹونے وغیرہ مہم لاواں میں نہایت کارگر ہوتی ہیں۔

دولہا کو سب سے پہلے دودھ پیش کیا جاتا ہے۔ دودھ کے بعد اسے سہرے کی دعوت مع
آئینہ دی جاتی ہے۔ آگے چل کر اس کی نسبتی بہنیں (سالیاں) طشتری میں گھی کے چراغ جلا کر
کھڑی ہوتی ہیں۔ اسے ایک ہی پھونک سے ان چراغوں کو گل کرنے کا کرشمہ دکھانا پڑتا ہے پھر
وہی دلہن کی بہنیں (سالیاں) اپنے ہونے والے بہنوئی دولہا میاں کے جوتے چرا لیتی ہیں جس
سے دولہا بہت حیران و سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ اپنے جوتے واپس کرانے میں اسے نذرانے کے
طور پر جیب سے کافی کچھ پیش کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ ان سے نجات حاصل کر لیتا ہے تو اس کی
حقیقی بہنیں اس کا تعاقب کر کے اس کا پلو باندھتی ہیں۔ پلو باندھنے کی رسم بڑی پیاری رسم
ہے۔ بھائی کے دامن سے اپنا پلو باندھتی ہیں۔ جب وہ پلو چھڑانے کا اصرار کرتا ہے تو اسے اس
کے معاوضے میں کوئی قیمتی ہدیہ، کھنکتے سکے، کڑکتے نوٹ یا بھینس گائے یا کاشتہ زمین کا کوئی زرعی
ٹکڑا ان کی نذر کرنا پڑتا ہے پھر وہ بے چارہ خود کو حد درجہ مطمئن پاتا ہے کہ شاید اب وہ ان رسومات
کے سلاسل سے آزاد ہو گیا ہے حالانکہ اس کی اصل گرفتاری کے مرحلوں کا آغاز یہیں سے ہوتا
ہے۔ پھر اسے دلہن کے پاس لے جایا جاتا ہے کہ وہ اس کی بند مٹھی کھول کر زور آوری کا اعجاز
دکھلائے اسی طرح دلہن اور دولہا دونوں ایک دوسرے کی بند مٹھیاں کھولنے کی تحریک میں سرگرم و
شاداں رہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان دونوں میں کسی سے بند مٹھی نہ کھل سکے تو بھری بارات میں
اسے حد درجہ پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس دست کشائی کی رسم کے بعد دلہن اور دولہے کو ذرا
سا تخلیہ دیا جاتا ہے جس میں دونوں کو چُوری کھلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ یہ چُوری محض یہی
دونوں ''میاں مٹھو'' ہی کھا سکتے ہیں جن کو آگے چل کر غم حیات کے پنجروں میں بند ہونا ہوتا ہے۔
چوری میں تخلیے کو ایک عظیم اور دلچسپ رسم شمار کیا جاتا ہے۔

لاواں کی یہ تمام رسومات ادا ہو جانے کے بعد کرب کی ایک رسم باقی رہ جاتی ہے۔ جسے ڈ[illegible]
کہتے ہیں ڈولی سے پہلے دلہن کی رخصتی پر تمام بارات کے روبرو داج یعنی جہیز کا سامان گنوایا اور
دکھایا جاتا ہے تا کہ برادری کے لوگوں کو پتہ چلے کہ والدین نے بیٹی کو پورے ساز و سامان کے
ساتھ رخصت کیا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ جتنے برس تک بیٹی گھر میں رہی ہے اس کا تمام حق
حاضرین برات کے سامنے اسے دیا جا رہا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اب آئندہ اس گھر
میں مہمان تو ہو سکتی ہے، مالک نہیں۔

داج یعنی جہیز دکھائے جانے کے بعد ڈولی میں سوار کرتے وقت پھر گھر کے تمام افراد اسے
آنسوؤں کی اندوہناک رم جھم کے علاوہ آہوں کے سلگتے ماحول اور گریہ پیہم کی دلدوز چیخوں میں
اسے اپنے بھرے گھر سے ہمیشہ کے لئے اذن رخصتی دے رہے ہوتے ہیں۔ جہاں کل تک وہ
سب کچھ تھی اور اگر کل یہاں واپس آئے گی تو اسے وہ حق ملکیت نصیب نہیں ہوگا جو کل تک تھا۔
یہ منظر ایک نظارہ مرگ سے کسی طور بھی کم نہیں ہوتا۔ اس کے جہیز میں سب کچھ ہوتا ہے البتہ ایک
کفن نہیں ہوتا ورنہ اس موقع پر موت و حیات میں فرق کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔

اب کجاوے اور اونٹوں پر جھومتی جھامتی رنگ رنگیلی چھیل چھبیلی سرخ زار اور باغ و بہار
بارات دلہن کو تمکنت و فاتحانہ سج دھج اور گڑتاں سے لا رہی ہوتی ہے۔

ڈولتے کجاؤں پر تھل کی پہلوؤں کے مدھ بھرے لوک گیت اور بالخصوص وہ خوش رنگ کجاوہ
جس میں دلہن کی سواری رنگ و نور کی بارش میں بھیگتی ہوئی چھم چھم آ رہی ہوتی ہے اور جسے دولہا
اپنے زور بازو سے تھامے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے ساحل بزم خود مطمئن ہوتا ہے کہ سمندر کی
ساری پہاڑی اس کی مختصری گود میں سمٹ گئی ہے بہرحال دولہا کا یہ احساس کہ اب دونوں عالم کی
باگ میرے ہاتھ میں ہے کوئی کم درجہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

جھمر دریس، لوک گیت، ڈھولے، بگڑو، بالو دوہے، کانیاں، شہنائیاں، ڈھول، بینڈ، باجے اپنے
سیل نغمہ اسے ساعتوں کی بھرپور آبیاری کر رہے ہوتے ہیں اور دولہا اپنی زندگی کے سہانے سپنے کھلی
آنکھوں سے بُن رہا ہوتا ہے۔

(جج) بارات دولہا کے گھر آ جانے سے دولہن کو سب سے پہلے مہاڑی پکڑنا پڑتی ہے۔
دلہن دولہا کے گھر میں داخل ہو کر اس کی دہلیز پر رک جاتی ہے اور اپنے لانے والوں کا راستہ اس

وقت تک روکے رہتی ہے یا دروازہ گھیر لیتی ہے جب تک اسے اپنے پیاروں کے دست کشادہ سے کچھ فراخ غیور دستیاب نہ ہو جائے۔

رات کو دولہا اور دلہن کی سیج آراستہ کی جاتی ہے۔ پھولوں کی مہکار کمرے کی زعفرانی فضا، نگہتوں کی لپٹیں، نوحہ گداز پلنگ اور قد آدم آئینوں کی آویزش چغلیاں کھا رہی ہوتی ہیں کہ آج رات دو اجالے ایک دوسرے میں نور کا انعکاس اس حسن عمل سے کریں گے کہ عروسی خانے کا گوشہ گوشہ ماہتابیوں کا گہوارہ بن جائے گا۔ کھجم لھمی جسمک جسمی کی خوش الحان کرامین اس سلیقے سے گونجیں گی کہ جس کے خط موت سے دولہا اور دلہن کیف و رنگ میں ڈوب ڈوب جائیں گے اور پہلی شب کی سیج سجادہ حور دکھائی دے رہی ہو گی مگر اس مرحلے سے پہلے سیج پر پہلا قدم دھرتے ہی دولہا کو حق مہر ادا کرنا پڑتا ہے مگر یہاں کی اکثریت اپنے حق مہر دلہنوں سے معاف کرانے کی عادی ہیں۔

طلوع آفتاب کے بعد دلہن کی نقاب کشائی کرائی جاتی ہے جسے یہاں کی اصطلاح میں گھنڈ کھلائی کہتے ہیں جس میں برادری محلے کے لوگ اور نزدیکی رشتہ دار نذرانہ زیارت دے کر دلہن کے بشاش اور تابناک چہرے کی بلائیں لیتے ہیں اور پھر دولہا کے گھر باراتیوں کو کھانا (دعوت ولیمہ) دی جاتی ہے۔ جس کا نام جنج ہے جس میں ''پلاؤ'' زردہ اور گوشت روٹی شامل ہوتے ہیں اس جنج کے بعد برادری کے لوگ نیندر دیتے ہیں۔

نیندر ہمارے ہاں اس قسم کو کہتے ہیں جو دعوت ولیمہ اور جنج کے بعد مدد اور تعاون کے لئے برادری کے لوگ دولہا والوں کی نذر کرتے ہیں تاکہ شادی کے مصارف کا بوجھ کم یا ہلکا ہو جائے! کاش! یہ نیندر جنج اور دعوت ولیمہ سے پہلے ادا کی جاتی تاکہ مدد اور تعاون کا مفہوم زیادہ واضح ہو سکتا۔

اس کے بعد تین یا سات روز گزرنے پر دلہن دولہا کے گھر سے میکے کو، اپنے چھوڑے ہوئے گھر کے ماحول کا جائزہ لینے کو جاتی ہے تو اسے ستوواڑہ کہتے ہیں۔ ستوواڑہ سے پہلے شادی میں کام کرنے والے کمیوں کو جی بھر کے ان کو حق خدمت انعام یا معاوضہ دیا جاتا ہے جس میں نقد پیسوں کے علاوہ نئے کپڑے نئی پوشاک وغیرہ شامل ہیں۔ اس کو کھیوا کہتے ہیں۔

تھل میں شادی کی ان رسومات کے علاوہ یہاں وٹہ سٹہ کے نام سے ازدواجی لین دین کی

وبا بھی عام ہے، آپس میں ایک دوسرے کو لڑکیاں تبادلے میں برنگ عقد لینے دینے کا نام وٹہ سٹہ ہے۔ اکثر ان بے جوڑ تبادلے کے نکاحوں کا انجام اس قدر بھیانک ہوتا ہے کہ یا تو ہر دو وٹے کی منکوحہ تنسیخ کے لئے عدالتوں کے کٹہرے میں انصاف کا دروازہ کھٹکھٹاتی دکھائی دیتی ہیں یا تمام عمر خود کو میکے کی بھینٹ چڑھا کر ایسے ایسے ازنکابات کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے جن کا ذکر کرنے سے قلم قاصر ہے۔ اکثر و بیشتر اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ کوئی کمسن، نوخیز، خوبرو اور باحیا لڑکی ایسے بدشکل و بدسیرت بوڑھے کھوسٹ سے باندھ دی جاتی ہے جو اس کے تبادلے (وٹے) میں اپنی لڑکی دینا منظور کر لیتا ہے۔

فائدوں سے کہیں زیادہ وٹے سٹے نے بھاری نقصان ہی پہنچایا ہے۔ اگر بدقسمتی سے ایک لڑکی اپنے سسرال میں خوش نہیں تو اس کے تبادلے والی لڑکی جو گھر میں نہایت پُرامن طور پر خوش و خرم اور شریفانہ زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ اسے انتقاماً طلاق دیدی جاتی ہے یا زدوکوب کر کے سسرال سے نکال دیا جاتا ہے تاکہ نان نفقہ سے نجات مل جائے۔ دراصل یہ وٹے کے مجرم قانون امن کے حد درجہ دشمن ثابت ہوتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں وٹہ سٹہ اس قدر ناکام ہوا ہے کہ یہ ارتکاب کرنے والے طرفین ہمیشہ ناخوش و بیزار دیکھے گئے ہیں۔ آئے دن اخبارات میں واردات کی خبریں وٹے کی شادیوں کا شاخسانہ بنی ہوتی ہیں۔

کاش! آج ہمارا مسلمان معاشرہ ہندو ثقافت کے اثرات کو یک لخت زائل کر کے اور رسومات کے غول سے نکل کر شرعی احکامات کی روشنی میں شادی بیاہ کا جشن رچانے میں گامزن ہو سکتا تاکہ فرمان الٰہی اور سنت رسول ﷺ کا اتباع پوری طرح کیا جاتا۔

مسیحی برادری: پاکستانی قوم کا ایک حصہ

برکت اعوان

وطن عزیز میں مسلمان ۹۷ فیصد اور غیر مسلم تین فیصد آباد ہیں۔ غیر مسلم آبادی عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں اور قادیانیوں پر مشتمل ہے۔ ہر پاکستانی حکومت اقلیتوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں یہ لوگ آباد نہ ہوں۔ اچھے کاروبار کے علاوہ سرکاری شعبوں میں بھی اہم عہدوں پر فائز ہیں اور بطریق احسن اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ تخلیق پاکستان میں بھی اس برادری نے تاریخی کردار ادا کیا۔ موجودہ حکومت نے ۳۴۵ ملین روپے کی خطیر رقم عیسائی کمیونٹی کی مالی امداد کے لئے مختص کی ہے تا کہ یہ برادری مالی طور پر پسماندہ نہ رہے حکومت اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت' ان کے مقدس مقامات کی حفاظت اور عبادت گاہوں کی تعمیر میں بھی بھرپور تعاون کرتی ہے۔

مسٹر جے سالک مسیحی برادری کی اہم سیاسی شخصیت ہیں۔ وہ ان دنوں وفاقی وزیر بہبودی آبادی بھی ہیں۔

لیہ ضلع میں مسیحی برادری لیہ شہر' چک نمبر ۲۷۰ ٹی ڈی اے، فتح پور، چک نمبر 75 A 75 - B- اور چوک اعظم میں آباد ہے۔ ملک بھر سے ممتاز پادری فادر ز اپنی برادری کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں یہاں آتے ہیں۔ چک نمبر 270 ٹی ڈی اے میں گرجا گھر بھی ہے اور سالانہ یادگار اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں۔

بقول نعیم سیموئیل، چوک اعظم میں مسیحی لوگ زیادہ تر سیالکوٹ سے 1965ء میں ہجرت

کر کے یہاں آئے۔ بشپ یوسف پطرس ممتاز حیثیت کے مالک ہیں جنہوں نے چوک اعظم کے مسائل حل کرنے کے لئے ڈومینکا اقبال کو بھیجا۔ فادر فلیکس بھی ہیں مقیم ہیں جنہوں نے ٹیوشن سنٹر قائم کیا۔

لیہ میں کیتھولک کے علاوہ دیگر مکتبہ خیال مسیحی لوگ بھی آباد ہیں۔ فیروز نسیم کیتھولک گروپ کے نمائندہ ہیں۔

فادر فیلکس اللہ دتہ (لوریتو تھل)

''ملتان کیتھولک ڈایوسس کے سینٹر کامن فادر فیلکس اللہ دتہ لوریتو تھل میں مقیم ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے لوریتو چک نمبر 170 میں رہنے والے مسیحیوں کے لئے بجلی فراہم کی۔ آپ ادبی' سماجی اور مذہبی حلقوں میں قد آور شخصیت اور شاعر بھی ہیں۔

چرچ میں اہم علمی شخصیت الفت اے حمید ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر مقیم ہیں۔ آپ نہایت ملنسار' دلچسپ اور مختلف خوبیوں کے مالک ہیں۔

لیّہ میں طبّی سہولتیں

عابد منہاس

صحت کے بغیر ترقی کا حقیقی تصور ممکن نہیں۔ وہ اقوام عالم جنھوں نے صحت کو بدرجہ کمال اولیت دی ہے، دنیاوی نقطہ نگاہ سے تعمیر وترقی میں بہت آگے جارہی ہیں۔ عصر حاضر میں نئی دواؤں کی دریافت نے ازالہ مرض اور فروغ صحت کی راہ ہموار کردی ہے۔ لیّہ کو ضلع کا درجہ دیا گیا تو اس سے قبل تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال قائم تھا۔ 1982ء میں (ضلعی ہیڈ کوارٹر ہسپتال) کے آرڈرز ہوئے۔ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر' میڈیکل، سپرنٹنڈنٹ سنیئر میڈیکل آفیسر اور کئی میڈیکل آفیسرز ان دنوں ہسپتال میں اپنے فرائض بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ شب و روز بیماریوں کی تشخیص، آپریشن، حادثات کے سلسلے میں سٹاف موجود رہتا ہے۔

تحصیل چوبارہ اور کڑور میں تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال کام کر رہے ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں کے علاوہ سول ڈسپنسریاں کم اور پرائیوٹ کلینک زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان سرکاری فرائض منصبی کے بعد اپنے پرائیوٹ کلینک پر بھی کام کرتے ہیں۔

علم طب یونان سے چلا لیکن اسے فروغ مسلمانوں کے عہد میں ہوا۔ اسلامی دور کے عروج میں یہ خوب پھلا پھولا۔ مدینۃ الحکمت بغداد میں یہ علم پروان چڑھا۔ برصغیر میں آیورویدک کا رواج تھا۔ مسلمان اطباء نے معدنیات اور کشتہ جات کو آیورویدک سے اخذ کیا۔ اس طرح یہ طب یونانی اور آیورویدک کے حسین امتزاج کے بعد سامنے آئی۔ اس فن سے نئے امراض اور نئی ادویات دریافت ہوئیں۔

موجودہ حکومت نے سرکاری ہسپتالوں میں ہومیو پیتھک ڈاکٹرز کی بھی تعیناتی کا حتمی فیصلہ کیا ہے۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال میں طبی ڈسپنسری بھی ہے جہاں حکیم رشید احمد باروی (ماہر شعبہ طب) موجود ہیں۔ اس مقصد کے لئے ۱۹۶۵ء کا طبی ایکٹ بھی ہے۔ نیشنل کونسل فار طب و وفاقی وزارت صحت کا قائم شدہ ہے جس کے تحت چار سالہ ڈپلومہ کورس کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے گو ملک بھر میں ۱۸ طبی کالجز قائم ہیں مگر بدقسمتی سے اس ضلع میں کوئی طبی کالج قائم نہیں ہو سکا البتہ ان دنوں نئے کالج کی تعمیر کے بارے منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ اب پرائیویٹ سیکٹر میں ایک طبیہ کالج موسوم بہ الھادی طبیہ کالج قائم ہو چکا ہے۔

ضلع لیہ میں بہت سے سرکاری بنیادی مرکز صحت، ڈسپنسریاں، سوشل ویلفیئر ڈسپنسری، بہبودِ آبادی سنٹر اور نجی سطح پر ہسپتال کلینک قائم ہیں جو بساط بھر عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے میں اپنی بہترین کوششیں بروئے کار لا رہے ہیں مگر اس کے باوصف سرکاری سطح پر ان سہولیات کو انتہائی ناکافی قرار دیتے ہوئے خصوصی توجہ کا مرکز سمجھا جانا چاہیے۔ بالخصوص چوک اعظم اور فتح پور کے رورل ہیلتھ کمپلیکس توسیع طلب ہیں۔

لیہ.....سوغاتیں، جڑی بوٹیاں اور درخت

ناصر ملک

ہر علاقہ کسی صنعت، فصل یا جڑی بوٹی کی عام دستیابی کے سبب شہرۂ خاص کا حامل ہوتا ہے۔ لیہ کا علاقہ بھی چند اشیاء کے سبب پاکستان بھر میں معروف ہے۔ یہاں وسیع و عریض ریگزار میں چنے کی بارانی فصل کاشت کی جاتی ہے۔ علاقہ نواں کوٹ و چوبارہ میں پیدا ہونے والا چنا اپنے ذائقے اور بہتات کی بدولت مشہور ہے۔ اس سے چنے کی دال اور بیسن تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی پیداوار کا انحصار بارش پر ہوتا ہے۔

1990ء تک لیہ کا علاقہ شیشم (ٹاہلی) کی بہترین لکڑی کے لئے پنجاب بھر میں مشہور تھا۔ یہ لکڑی فرنیچر سازی میں کام آتی تھی۔ راجن شاہ اسٹیشن پر تیار کیا جانے والا منفرد ذائقے کا حامل حلوہ دور دراز کے علاقوں میں بہ شوق منگوایا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے اطراف میں کاشت کی جانے والی کماد کی فصل دور دراز تک شہرت رکھتی ہے۔ ٹی ڈی اے نے اس فصل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں لیہ شوگر ملز قائم کی تھی جسے بعد میں نجی تحویل میں دے دیا گیا۔ لیہ کا تقریباً تین چوتھائی رقبہ ریگزارِ تھل پر مشتمل ہے۔ ماضی میں دریائے سندھ کا سیلابی پانی اور بارش سیراب کاری کے معتبر ذرائع تھے۔ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے قیام کی بدولت دریائے سندھ کا پانی نہروں کی شکل میں سیراب کار ہوا تو نباتات، جڑی بوٹیوں اور زراعت میں عمومی تغیر دیکھنے کو آیا۔ ریگستانی وضع و قطع کے پودوں اور جنگلی جھاڑیوں کی جگہ فصلوں اور نوع نوع کے درختوں نے لے لی۔ ذیل میں ان جڑی بوٹیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو ہر دو مختلف ادوار میں تھل کی زینت بنیں۔ طب و حکمت میں مستعمل ادویات کا جزو بنتی رہیں اور بنی نوع انسان کے لئے فائدہ بخش رہیں۔

پیلے رنگ کی آکاس بیل (Air Creeper) بیر، کیکر اور ٹاہلی کے درختوں پر لپٹی نظر آتی ہے۔ یرقان کی ادویات میں استعمال کی جاتی ہے۔ اِٹ سٹ (Spreading Hog Weed) مشہور خودرو اور پھول دار جڑی بوٹی ہے۔ چونکہ اس میں نمکیات کی مقدار خاصی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے مویشیوں کے چارہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ادویات سازی میں بھی کام آتی ہے۔ السی دو سے تین فٹ قامت کی فصل ہے۔ اس پر نیلے رنگ کے خوب صورت پھول لگتے ہیں۔ ان بیجوں سے تیل نکالا جاتا ہے جسے السی کا تیل کہا جاتا ہے۔ اَک قدرے زہریلی بوٹی ہے۔ پتے چوڑے اور موٹے، دودھ کی طرح کا سفید زہریلا سیال مادہ پتوں اور ٹہنیوں میں رواں، پھل چھوٹا جس کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے۔ جوڑوں کے درد اور قوتِ باہ کی ادویات میں مستعمل ہے۔ ارنڈ (Castor Oil) تھل میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ بڑے سائز کے پتوں، گول اور خاردار ڈوڈہ نما پھل اور درمیانی قامت کا پودا ہے۔ اس سے روغن ارنڈ اور Ricim حاصل ہوتا ہے۔ کم پانی والے ریگستانی ماحول میں پلتا ہے۔ اُٹھ کٹارا خاردار پودا ہے۔ تین چار فٹ قامت کا مالک ہے۔ اس کا پھل بھی خاردار ہوتا ہے۔ اونٹ بہ رغبت کھاتے ہیں۔ ہاضمہ دار ہوتا ہے۔

باتھو (White Goose Foot) تھل میں گندم کی فصل میں پیدا ہوتا ہے۔ سبز رنگ کا بدمزہ ذائقے کا حامل پودا ہے اور بہ طور ساگ پکایا جاتا ہے۔ بہت سی امراض میں مفید ہے۔ بکین (The Persian Lilac Bead) نیم یا دھریک کے خاندان کا درخت ہے۔ تھل میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ رنگ سبز، پھل کنچوں کی جسامت کا، جسے دھرکونے کہا جاتا ہے، ذائقہ کڑوا اور خاصیت خون صفا کی ہے۔ گھنا اور سایہ دار درخت ہے۔ کم پانی پر بھی اپنی نمو جاری رکھتا ہے۔ بھکڑا بیل کی مانند ایک خودرو بوٹی ہے جس کا پھل کانٹے دار ہے۔ مثانے کی پتھری، سوزاک اور کمر درد میں مفید ہے۔ تھل میں بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ بھیڑ بکریوں کا چارہ ہے۔ بیر تھل کی خاص سوغات ہے۔ کئی اقسام کا حامل ایک خاردار درخت ہے۔ جنگلی اور پیوندی؛ اس کی دو مشہور اقسام ہیں۔ جنگلی بیر کنچے کی جسامت کا گول جبکہ پیوندی بیر، کھجور کی شکل اور جسامت کا ہوتا ہے۔ یہ خوش ذائقہ پھل پیچش میں انتہائی مفید ہے۔ مویشی اس کے پتے اور پھل شوق سے کھاتے ہیں۔

پیلوں تھل کا ایک مشہور درخت ہے۔ درخت کو مقامی زبان میں جال اور پھل کو پیلوں کہا جاتا ہے۔ خوش ذائقہ اور دانتوں کے لئے بے حد مفید پھل ہے۔ نواں کوٹ اور چوبارہ کے ریگزار

میں پایا جاتا ہے۔کئی لوک گیتوں میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

تربوز تھل کا مشہور پھل ہے۔چھیل سبز رنگ کی جبکہ گودا نہایت سرخ اور میٹھا ہوتا ہے جو پانی سے بھرا ہوتا ہے۔ بہت زیادہ مفید ہے۔اس کا بیج بہت سی قوت بخش ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے۔اسی خاندان کا پھل خربوزہ بھی تھل کی زینت ہے۔ بہت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔تمہ جسے مقامی زبان میں کوڑتمہ بھی کہا جاتا ہے، تھل میں بہ کثرت اُگتا ہے۔اس کی جسامت ٹینس بال جتنی جبکہ ذائقہ نہایت کڑوا ہوتا ہے۔ یہ بہت کارآمد ہے۔ وٹرنری ادویات کا جزوِ خاص ہے جبکہ انسانی ادویات میں بھی استعمال ہوتا ہے۔تل تھل کی مشہور فصل / بوٹی ہے۔کھانے اور دواسازی کے کام آتی ہے۔تل کے بیجوں میں سے تیل نکالا جاتا ہے۔خوش ذائقہ ہے۔سردیوں میں بڑے شوق سے تل کھائے جاتے ہیں۔توت تھل میں دو اقسام میں پایا جانے والا درخت ہے۔ سیاہ اور سفید۔پھل پُور بھر یا انگشت بھر اور ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔ بہت قوت بخش ہوتا ہے اور ادویات میں مستعمل ہے۔توت (اسے شہتوت بھی کہا جاتا ہے) چوڑے پتوں والا گھنا اور سایہ دار درخت ہوتا ہے جس کے پتے مویشی شوق سے کھاتے ہیں۔

جامن چوڑے پتوں والا طویل قامت درخت ہے۔تھل کے جنگلوں میں بہ کثرت پایا جاتا تھا۔ گہرا جامنی پھل لگتا ہے۔شربت اور سرکہ بنایا جاتا ہے۔ بہت مفید پھل ہے۔ چونکہ اس کے پتے بھی خوش ذائقہ ہوتے ہیں اس لئے انہیں مویشی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ جنڈ بڑی جسامت کا درخت ہے۔لیہ کے علاقے مین بکثرت پایا جاتا ہے۔اس کے پتے کیکر کے پتوں کے مشابہہ ہوتے ہیں جبکہ لوبیا کی شکل کا پھل لگتا ہے جو کھانسی میں مفید ہے۔. بہت کم پانی والے علاقے میں بھی اپنی نمو جاری رکھتا ہے۔جنگلی پودینہ تھل میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔سبز رنگ کا خوشبودار پودا ہے۔نمو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پیٹ کے جملہ امراض میں مفید ہے۔

چچک بوٹی / بیر بہوٹی ایک سرخ رنگ کا مخملیں کیڑا ہے جو بارش کے بعد ریتلی زمین سے برآمد ہوتا ہے۔ بچے اس کے ساتھ بڑے شوق سے کھیلتے ہیں۔کارِ حکمت میں استعمال ہوتا ہے۔ چنا تھل کی مشہور فصل ہے۔سیاہ اور سفید دو رنگوں میں پایا جاتا ہے۔ کچا پھل اور خشک پھل دونوں صورتوں میں پکایا جاتا ہے۔ چنے کی دال اور بیسن انہی چنوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔نقد آور اور بارانی فصل ہے۔چولائی ساگ کا پودا فٹ بھر اونچا ہوتا ہے۔لیہ کے مضافات (کچے اور

بیٹ کے علاقے میں) میں بہ طرزِ ساگ پکایا جاتا ہے۔ بہت سی امراض میں مفید ہے۔ چرچٹہ تھل کی عام جڑی بوٹی ہے۔قد ایک میٹر، باریک باریک پھول جو کپڑوں سے چمٹ جاتے ہیں، اس کی وجہ شہرت بنتے ہیں۔ مقامی طور پر اسے لیدھا بوٹی یا محبت بوٹی کا نام دیا جاتا ہے۔ بہت سی ادویات میں مستعمل ہے۔ مصفی خون ہے۔

دھتورا خاردار زہریلا خودرو پودا ہے۔اس کے پھول سفید اور سیاہ رنگوں کے حامل ہیں۔ ادویات میں کارآمد ہے۔تھل کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔

سرکنڈا باریک مگر لمبے پتوں والا خودرو پودا ہے۔سفید لچھے دار اور بے حد نرم پھول اگتے ہیں۔ باریک اور لمبی ٹہنیاں قلم سازی کے کام آتی ہیں۔اس کی جڑیں ائرکولر کی جالیوں میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لئے لگائی جاتی ہیں اور بعض ادویات میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔سورج مکھی علاقہ لیہ میں پیر جگی، لدھانہ میں بکثرت جبکہ باقی علاقوں میں بھی اگایا جاتا ہے۔اس کے پھولوں کا رُخ سورج کی طرف رہتا ہے جس کی وجہ سے سورج مکھی کا نام دیا جاتا ہے۔منافع بخش فصل ہے۔اس کا تیل کھانے میں مستعمل ہے۔ سہانجنہ بلند قامت درخت ہے۔تھل میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔سال میں دو تین مرتبہ ثمر بار ہوتا ہے۔درخت کے تنے سے گوند نکلتی ہے۔ پھل سے بے بو اور بے ذائقہ تیل نکالا جاتا ہے جو بہت سی اشیاء میں مستعمل ہے۔اس کا اچار ڈالا جاتا ہے۔

شیشم کو تھل میں ٹاہلی کا نام دیا جاتا ہے۔بہ کثرت پایا جانے والا سایہ دار درخت ہے۔اس کی مضبوط لکڑی فرنیچر سازی میں مستعمل ہے۔طویل عمر اور قامت والا درخت ہے۔ ضلع لیہ کی نہروں کے اطراف اور جنگلات میں سرکاری طور پر کاشت کیا گیا تھا۔

عشق پیچاں کی بیل تھل کے بیر کے درختوں پر ہر سو چھائی دکھائی دیتی ہے۔اس پر پھلی لگتی ہے اور تین عدد تکونیا تخم لگتا ہے۔ بہت سی ادویات میں مستعمل ہے۔

فالسہ کا پھل سیاہی مائل سرخ یا جامنی رنگت میں چیری کی جسامت کا ہوتا ہے۔تھل کی خاص سوغات ہے۔ کئی امراض بالخصوص پیشاب کی سوزش اور بخار وغیرہ میں مفید ہے۔ پودا جھاڑی کی صورت میں پھیلتا ہے اور ڈیڑھ دو گز قامت کا ہوتا ہے۔جنگلی اور باغی دونوں قسم کا فالسہ لیہ کے علاقے میں موجود ہے۔

کنوار گندل سبز رنگ کا موٹے اور لمبے پتوں والا پودا ہے۔ پتوں کے کناروں پر کانٹے اُگے ہوتے ہیں۔ پتوں میں گاڑھا لیس دار مادہ ہوتا ہے۔ بہار میں جڑ سے نئی لمبی ٹہنی نکلتی ہے جسے کنوار گندل کہا جاتا ہے۔ اس پر گلابی مائل خوبصورت پھول کھلتا ہے۔ اس سے نظام ہضم کے لئے ادویات بنائی جاتی ہیں۔ مویشیوں کو بھی کئی امراض کے لئے کھلایا جاتا ہے۔ کلفہ کو مقامی زبان میں ''لونڑک'' کہا جاتا ہے، بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ شاخیں گھنی ہوتی ہیں۔ نمکین اور لیس دار ہے۔ گوشت کے ساتھ اسے ساگ کے طور پر پکایا جاتا ہے اور رغبت سے کھایا جاتا ہے۔ کھمبی تھل میں بکثرت اگتی ہے۔ تنے اور پتے کے بغیر ہوتی ہے۔ تھل میں پائی جانے والی کھمبی کی تقریباً تمام اقسام زہریلی ہیں۔ شیریں اقسام کو بہ طور ترکاری استعمال کیا جاتا ہے۔ کھجور تھل میں پایا جانے والا طویل قامت درخت ہے۔ اس کی بہت سی اقسام ہیں۔ پھل خوش ذائقہ اور پتے مضبوط اور لمبے ہوتے ہیں جن سے استعمال کی کئی اشیاء بنائی جاتی ہیں مثلاً چنگیر، چھابا، آرائشی سامان وغیرہ۔ کھجوریں کئی اقسام اور ذائقوں کی ہوتی ہیں۔ بہت کم پانی میں بھی درخت اپنی نمو پاتا رہتا ہے۔ کھوی تھل کے ٹیلوں اور جنگلوں میں بہ کثرت پائی جانے والی گھاس نما خوش بو دار جھاڑی ہے۔ اس کی آگ کا دھواں بھی خوشبودار ہوتا ہے۔ جڑیں ادویات میں مستعمل ہیں۔ کیکر تھل کا مشہور درخت ہے۔ ساخت کے اعتبار سے اسے دو قسموں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک دیسی اور دوسری قسم کو پہاڑی کا نام دیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں اس کی تیسری قسم ''کابلی کیکر'' بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی چھال چمڑا رنگنے میں کام آتی ہے۔ مسواک (سک) بھی بنایا جاتا ہے۔ پتے اور پھلیاں ادویات میں استعمال ہوتی ہیں۔ خار دار درخت ہے۔ بکریاں، اونٹ اور بھیڑیں بہت شوق سے اس کے باریک پتے اور پھلیاں کھاتی ہیں۔

لسوڑھا ایک چوڑے پتوں والا سایہ دار درخت ہے۔ پھل گول اور لیس دار ہوتا ہے اور رغبت سے کھایا جاتا ہے۔ اس کا اچار بھی ڈالا جاتا ہے۔ لوسرن بہ طور چارہ کاشت کیا جاتا ہے۔ بہت مفید چارہ ہے۔ اس سے دوا تیار کی جاتی ہے۔ لوسرن کی عمر ایک سے پانچ سال تک ہوتی ہے۔ بنفشی رنگ کے پھول اور باریک بیج ہوتا ہے۔

ضلع لیہ میں دو طرح کے ماحول دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک گرم، خشک اور صحرائی ماحول جبکہ دوسرا دریائے سندھ کے اطراف کا نم، مرطوب اور زرخیز علاقے کا ماحول۔ یہاں شیشم

(ٹاہلی)، کیکر (دیسی، کابلی و جنگلی)، سرس، بیر (جنگلی و پیوندی)، سنبل، توت (سیاہ و سفید)، جامن، جال، کری، دھریک، نیم، بکین، سفیدہ (یوکلپٹس)، فراش اور لسوڑھا وغیرہ کے درخت بہ کثرت دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ ماحول کو تروتازہ رکھنے کے ساتھ ساتھ فرنیچر کے لئے لکڑی اور ایندھن فراہم کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

(۱) گلستانِ مفردات۔ از: حکیم محمد عبداللہ۔ عثمان پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور۔

(۲) کتاب المفردات۔ از: حکیم مظفر حسین اعوان شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔ کراچی۔

(۳) تاج عقاقیر۔ از: حکیم ہری چند ملتانی عثمان پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور۔

(۴) مفردات ادبیات۔ از: حکیم محمد عبداللہ عثمان پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور۔

اور لیہ جو مدت تک ڈیرہ جات کمشنری کا صدر مقام رہا صرف ضلع رہ گیا اور پھر ضلع بھی نہ رہا اور اسے بطور تحصیل ڈیرہ اسماعیل خان سے منسلک کر دیا گیا۔ بعدازاں اسے ضلع میانوالی میں شامل کر دیا گیا۔ قیام پاکستان کے وقت اسے ضلع مظفرگڑھ کی ایک ترقی پذیر تحصیل کا درجہ حاصل تھا اور یکم جولائی ۱۹۸۲ء کو اسے تحصیل لیہ تحصیل چوبارہ اور تحصیل کروڑ پر مشتمل ضلع بنا دیا گیا۔ ضلع لیہ میں کروڑ لعل عیسن، جمن شاہ، فتح پور، چوک اعظم اور کوٹ سلطان جیسے مشہور قصبات واقع ہیں۔

ضلع لیہ کا رقبہ ۱۸ لاکھ ۲۶ ہزار پانچ سو بارہ ایکٹر ہے جو شرقاً غرباً ۶۴ میل اور شمالاً جنوباً ۵۰ میل پر محیط ہے اور اس کی آبادی تقریباً سات لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

ڈپٹی کمشنر صاحبان 1982-1994ء

(1) فیصل حسین — 1-7-1982 تا 17-10-1984
(2) احمد سلیم حسین — 17-10-1984 تا 21-3-1987
(3) سرفراز الحق بیگ — 10-5-1987 تا 2-9-1989
(4) رانا افتخار الدین — 2-9-1989 تا 3-10-1991
(5) چودھری عبدالوحید — 3-10-1991 تا 5-5-1992
(6) ملک شیر محمد اعوان — 17-5-1992 تا 14-6-1993
(7) محمد خان موہل — 14-6-1993 تا 31-7-1993
(8) ظفر اقبال — 1-8-1993 تا 1995ء

اسسٹنٹ کمشنر صاحبان لیہ: 1946 - 1994

(1) کنور شوز نگ — 1946ء
(2) خان فتح اللہ خان — 1946ء
(3) خان احمد خان ترین — 1947-1948ء
(4) قاضی رحمت اللہ — 1949-1950ء
(5) چودھری ولایت حسین — 1951ء
(6) عنایت اللہ — 1952ء
(7) شیخ محمد اکرم — 1953ء
(8) سید محمد قاسم رضوی — 1953ء

انتظامی وسیاسی پس منظر

انتظامیہ اور پولیس

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

ضلع لیہ موجودہ صورت وحیثیت اختیار کرنے سے پہلے بھی جغرافیائی اور انتظامی لحاظ سے خاصا اہم رہا ہے۔ اِس علاقہ کا نام ''لیہ'' ہونے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس علاقے میں عام پائی جانے والی نرم و ملائم لکڑی جسے ''لئی'' کہا جاتا ہے، اسی کے نام پر شہر معروف ہوا۔ لیہ کی بنیاد ۱۵۵۰ء میں رکھی گئی اور اسے ایک صوبے کے صدر مقام کی حیثیت دی گئی۔

۱۷۲۷ء میں نادر شاہ نے اس علاقے کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا اور پھر یہ علاقہ مختلف قبائل کے زیر اثر رہا۔ ۱۸۳۷ء میں میانوالی تک کا یہ تمام علاقہ ملتان کے گورنر دیوان ساون مل کے زیر نگیں آ گیا۔ ۱۸۴۹ء میں جب ملتان سکھوں سے چھن گیا تو اس علاقہ پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران لیہ کا اسسٹنٹ کمشنر ٹامسن زخمی ہوا۔ کرنل راس اس وقت کمشنری لیہ کا پہلا کمشنر تھا جو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۵ء تک اس عہدے پر فائز رہا اور یہیں پیوند خاک ہوا۔ اس کے بعد میجر پولک ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان چند ماہ تک بطور قائم مقام کمشنر یہاں پر تعینات رہے۔ پھر میجر براؤن کرنل آرٹیلر، کرنل بجر، کرنل پولک، کرنل گریم، کرنل منرو، اور کرنل رومن ۱۸۸۰ء تک کمشنر رہے۔ کپتان پالنگر ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۲ء تک اور اس کے بعد ۱۸۵۶ء تک مسٹر سمسن ضلع لیہ کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ پھر کپتان میکنل، کپتان بیکن، کپتان فینڈل اور کپتان پارسن یکے بعد دیگرے ۱۸۶۰ء تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ حالات نے کروٹ بدلی

(9) مرزا رفیق عنایت	1955ء
(10) شیخ اظہار الحق	1956-1957ء
(11) میجر محمد اشرف	1958ء
(12) سید مصطفیٰ زیدی	1958ء
(13) محمود خلیق	1959ء
(14) خالد محمود چیمہ	1960-1961ء
(15) خالد جاوید	1962ء
(16) حاجی محمد اکرم	1963-1964ء
(17) اقبال معین	1964ء
(18) سردار اصغر علی	1966ء
(19) میاں ہدایت اللہ	1967ء
(20) جاوید الطاف	1968ء
(21) سیف الدین احمد	1969ء
(22) شکاء اللہ نائیک	1969ء
(23) آغا غضنفر علی	1970ء
(24) رانا محمد نواز	1970-1971ء
(25) چوہدری محمد اسلم	1971ء
(26) ریاض احمد خان	1973ء
(27) سید مسعود احمد شاہ	1973-1971ء
(28) رانا محمد افضل	1975-1977ء
(29) چودھری نذیر احمد	1977-1978ء
(30) چودھری عبدالرؤف	1976-1979ء
(31) لیاقت علی خان نیازی	1979-1981ء
(32) سید محمد حامد	1981ء
(33) چودھری وحید الدین احمد	1981-1982ء
(34) ملک محمد فیروز	1982-1984ء

(35) راجہ محمد عباس	1984-1985ء
(36) شیخ شمس الدین	1985ء
(37) حاجی شمیر علی خان سیال	1985-1986ء
(38) میاں محمد خان موہل	1986-1987ء
(39) مشتاق احمد خان نیازی	1987-1989ء
(40) کنور عظمت علی خان	1989-1993ء
(41) بابر حسن بھروانہ	1993-1993ء
(42) امیر علی خان	1993-1994ء
(43) حاجی محمد صدیق	1994ء

ضلع لیہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس

(1) محمد اسرار احمد خان	1-7-1982
(2) سلیم اللہ خان	18-8-1984
(3) میجر مختیار الملک	12-7-1985
(4) محمد شفیع	17-7-1986
(5) چوہدری غلام حیدر	17-9-1988
(6) نذر عباس	20-5-1991
(7) محمد انور ورک	6-8-1992
(8) ڈاکٹر طارق کھوکھر	16-4-1994

ضلع لیہ کے پولیس سٹیشن

تحصیل لیہ : تھانہ صدر، تھانہ سٹی، ماڈل چیک پوسٹ صدر بازار لیہ، تھانہ کوٹ سلطان، چیک پوسٹ پہاڑ پور، تھانہ چوک اعظم اور چیک پوسٹ دھوری اڈہ

تحصیل کروڑ : تھانہ کروڑ لعل عیسن، تھانہ فتح پور، چیک پوسٹ سامٹیہ چیک پوسٹ 234/T.D.A اور چیک پوسٹ 90/ML

تحصیل چوبارہ : تھانہ چوبارہ اور چیک پوسٹ کپوری

عدلیہ

سہیل احمد ملک

چرچل نے جنگ عظیم کے دوران کہا تھا کہ "جب تک ہماری عدالتیں آزادی سے کام کر رہی ہیں، ہم تباہ نہیں ہو سکتے"۔

عدلیہ کے وقار میں کسی قوم کی وجاہت پنہاں ہوتی ہے۔ یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔

لیہ کو ضلع کا درجہ دینے سے قبل مقدمات کے سلسلے میں مظفر گڑھ جانا پڑتا تھا۔۱۹۸۲ء کے بعد سیشن جج کی یہاں تعیناتی ہوئی۔

سیشن جج صاحبان۔۔۔(1982-1994)

نام سیشن جج	عرصہ ملازمت
1۔ چوہدری محمد سعید اختر	1-7-1982 تا 25-1-1983
2۔ محمد افضل ملک	25-1-1983 تا 30-5-1983
3۔ چوہدری محمد امجد خان	30-5-1983 تا 24-6-1985
4۔ سرفراز ارشد خان	7-7-1985 تا 20-6-1988
5۔ محمد سرفراز چیمہ	21-6-1988 تا 30-7-1989
6۔ ملک احمد بخش بھابھہ	8-8-1989 تا 4-3-1990
7۔ سید عبدالعزیز شاہ	13-3-1990 تا 1-6-1991
8۔ محمد عاشق خان	1-6-1991 تا 3-2-1993

9۔ پرویز احمد	3-2-1993 تا 3-11-1993
10۔ ملک احمد بخش بھابھہ	-11-1993

وکلاء صاحبان

ایک وکیل لوگوں کی سچی آرزوں کا پاسبان ہوتا ہے۔ دانش اور دلیل کے امتزاج سے ترتیب پاتا ہے۔قانونی مسائل و معاملات سلجھانے میں ایک اعلیٰ وکیل اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قانون کی عمل داری اور حقوق کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا ہے۔ قانون کی بالا دستی دیکھنا چاہتا ہے۔ حصول انصاف میں وکیل عدالت سے کم اہم نہیں ہے۔لیہ ضلع کے سینئر وکلاء حضرات اور نو وارد نوجوان ایڈووکیٹ اپنی اپنی قانونی صلاحیتوں کی بناء پر عام شہریوں کو انصاف کے حصول کی خاطر دلائل وحقائق کی روشنی میں اہم فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ہر وکیل کے مقدمات کی پیروی' اہم اور یادگار فیصلوں کی روداد وقت طلب ہے۔ دیوانی یا فوجداری مقدمات وکلاء برادری کی قابلیتوں کی بنا پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

بار ایسوسی ایشن

وکلاء حضرات کی بار ایسوسی ایشن ایک نہایت مؤثر اور طاقتور ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے وکلاء کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے وکلاء کے مقابلے میں بہتر صلاحیتوں کے مالک ہیں جو زیادہ محنتی اور مخلص ہیں۔ جنوری 1982ء میں بار ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔اس سے قبل مظفر گڑھ سے الحاق تھا۔ باقاعدہ سالانہ انتخابات کے ذریعے صدر و جنرل سیکرٹری کا چناؤ ہوتا ہے۔ اہم عہدہ دار وکلاء برادری کے مسائل کے حل کے لئے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ممبر سازی کی جاتی ہے اور بار ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم پر اہم نکات اٹھائے جاتے ہیں۔

صدر	جنرل سیکرٹری	
شیخ سجاد حسین	مہر حبیب اللہ گرواں	1983-83ء
ملک منظور حسین جوتہ	ارشد اسلم خان سیہڑ	1883-84ء
ملک نیاز احمد جھکڑ	شیخ نجیب صفدر	1984-85ء
شیخ منیر احمد	ملک رفیق احمد جونی	1985-86ء

شیخ مشرف الٰہی	شیخ سیف اللہ سعید	1986-87ء
ملک غلام محمد سواگ	ملک عبدالمجید بھٹہ	1987-88ء
شیخ سجاد حسین	عبدالروف	1988-89ء
سردار عبدالعزیز خان قیصرانی	ظفر اقبال ہاشمی	1989-90ء
ملک ناصر حسین	شیخ محمد ذوالفقار	1990-91ء
ملک منظور حسین جوتہ	مہر عاشق حسین اچلانہ	1991-92ء
ارشد اسلم خان سیہڑ	محمد اقبال قریشی	1992-93ء
سردار سعید الرحمٰن چانڈیہ	سید موسیٰ رضا شاہ	1993-94ء
سردار عبدالعزیز خان قیصرانی	عنایت اللہ مہار	1994-95ء

علمائے کرام اور ترویج اسلام

حضرت شیخ محمد یوسف المعروف لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ

فضل علی سمرا

دین متین کی تعلیم وتبلیغ اور انسانیت کی فلاح کے لئے اولیاء کرام اور مشائخ عظام کی عظیم قربانیاں اور خلوص نیت سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کی گئی کوششیں محتاج بیان نہیں۔ اللہ کی ان ہستیوں اور برگزیدہ بندوں نے نہ صرف عبادات اور جہاد کئے بلکہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ دور دراز، کٹھن اور پر خطر سفر بھی اسلام کی سربلندی کے لئے اختیار کئے۔ اولیاء کرام اور بزرگان دین دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور ظلمت کدوں میں دین اسلام کی شمع روشن کی اور آج ان کے مزارات مقدسہ مرجع خلائق ہیں۔ جہاں سے تشنگانِ رشد وہدایت فیضیاب ہو رہے ہیں۔ یہ اولیاء کرام کی مساعی جمیلہ کا اثر ہے کہ آج دنیا کے ہر خطہ میں کروڑوں مسلمان آباد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان نیک اور برگزیدہ ہستیوں (اولیاء کرام) میں ایک ولی کامل حضرت شیخ محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں جو اپنے اصل نام کی بجائے زیادہ تر مخدوم لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معروف ہیں۔ آپ حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ کے چشم وچراغ اور سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہیں۔ آپ ولی ابن ولی تھے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت بہاؤ الدین ثانی تھا جو اپنے وقت کے جید عالم دین اور بلند پایہ بزرگ تھے۔ حضرت شیخ محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے دینی، روحانی، ظاہری اور باطنی علوم اپنے والد بزرگوار اور اپنے جلیل القدر استاد حضرت ملوک سندھی سے حاصل کئے۔ جب حضرت لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے لئے اپنے وطن کوٹ کروڑ (موجودہ کروڑ لعل عیسن) تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں کی معاشی حالت ابتر تھی اور مسلمان اسلام کی نورانی اقدار اور تعلیمات کو تقریباً بھلا چکے تھے

۔صرف نام کے ہی مسلمان رہ گئے تھے۔ان گھمبیر حالات میں یہاں کی مقامی آبادی نے آپ کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔آپ کی خصوصی توجہ نگاہ جلال اور تبلیغ سے ہزاروں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔مزید برآں آپ رحمۃ اللہ علیہ سیر و سیاحت کے شوقین تھے۔دریائے سندھ کے کناروں پر آبادیوں میں دین اسلام کا پرچار کرنے کے لئے آپ رحمۃ اللہ علیہ نے دور دراز علاقوں کے دریائی سفر بھی کئے۔لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت عقیدت واحترام اور روحانیت کا یہ عالم تھا کہ عام آدمی کے علاوہ وقت کے حکمران بھی شرف ملاقات کے لئے حاضری دیتے تھے۔آپ سے ملاقات کی سعادت جن حکمرانوں نے حاصل کی ان میں میاں آدم شاہ کلہوڑہ اسماعیل خان، فتح خان اور غازیخان چہارم کے نام قابل ذکر ہیں۔ایسے حکمرانوں اور بلوچ سرداروں نے کوٹ کروڑ میں شاندار مسجد، مدرسہ، حجرے، روضہ مبارک اور دیگر عمارات تعمیر کرائیں۔دینی مدرسہ میں جید عالم اور علماء کرام درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔قلیل مدت میں دور دور سے تشنگانِ علم و ادب آنا شروع ہوئے۔آپ رحمۃ اللہ علیہ کے حسنِ سلوک، اوصاف حمیدہ، کرامات اور کمالات جلیلہ کی وجہ سے طالبان حق کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔آج بھی آپ کے مزار مبارک سے ملحقہ دینی مدرسہ سے فیوض و برکات جاری ہیں۔انسانیت مستفید ہو رہی ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مخدوم لعل عیسن) صاحب کرامت بزرگ تھے اور روحانیت اور علم ظاہری و باطنی کے اعلیٰ وارفع مدارج پر فائز تھے۔آپ کی تشریف آوری سے قبل کوٹ کروڑ کے عوام قحط کا شکار تھے۔آپ رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے بارانِ رحمت نازل ہوئی۔بیج کی بجائے بھوسہ سے بجائی کی گئی۔کہتے ہیں کہ بفضل تعالیٰ اور کرامت ولی کامل سے اتنی اچھی فصل ہوئی کہ علاقہ میں اناج کے ڈھیر لگ گئے۔عبادات اور مجاہدات کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ایک روایت کے مطابق آپ نے دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر ایک کروڑ مرتبہ سورۃ مزمل کا ورد کیا۔آپ کے فیض صحبت سے ہزاروں بندگان خدا مستفید ہوئے۔آپ کی نظر کرم جس شخص پر پڑتی وہ کارِ جہاں چھوڑ کر یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتا تھا۔جب آپ ملتان سے کوٹ کروڑ کی جانب عازم سفر ہوئے تو راستے میں غلام حسن نامی شخص سے آپ کی ملاقات ہوئی اور اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس (غلام حسین) کے لئے بلندی درجات کی دعا فرمائی اور اپنی قلندرانہ نظر سے اسے ولی کامل بنا دیا۔ہر سال کروڑ لعل عیسن (ضلع لیہ) میں

میلہ چودھویں اور سالانہ عرس مبارک بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوتا ہے۔جس میں دور دراز سے ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند اور زائرین شرکت کرتے ہیں۔اس موقع پر اونٹوں کی بڑی منڈی کے علاوہ کبڈی اور والی بال، فٹ بال اور دیگر مقامی کھیلوں کے مقابلے منعقد کرائے جاتے ہیں۔میلہ عرس مبارک کے تمام تر انتظامات ایم پی اے ملک احمد علی اولکھ اور چیئرمین بلدیہ کروڑ ملک محمد عمر علی کی زیر نگرانی طے پاتے ہیں۔

حضرت شاہ شرف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

برکت اعوان

خدا کے برگزیدہ بندے ہمیشہ مثل شمع جیتے ہیں اور ان کے مرقد بھی مخلوق خدا کو شمع کی صورت ہی روشنی بخشتے رہتے ہیں۔ مادیت کے ستائے ہوئے اور دنیا کے آلام و مصائب سے گھبرائے ہوئے درماندہ لوگ اب بھی لیہ شہر کے حضرت شاہ شرف بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ مبارک پر ہاتھ پھیلائے ہوئے آتے ہیں اور دین دنیا کی آسودگیاں سمیٹ کر گھروں کو واپس لوٹتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے رہنے والے تھے اور بلخ بخارا کی طرف سے آنے والے تجارتی قافلوں کے ہمراہ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے قافلہ تجارت کے ہمراہ اپنے وطن واپس جا رہے تھے کہ لیہ شہر کے مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے پڑاؤ کیا تا کہ کل سویرے دریائے سندھ عبور کر کے وہ کوہ سلیمان کے پہاڑوں میں داخل ہو جائیں۔ صبح جب تمام قافلے والے جاگے اور انہوں نے اونٹوں پر اپنا سامان لادنا شروع کیا تو حضرت شاہ شرف بغدادی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا وہ اُونٹ جو انہیں اور ان کے کئی من وزنی قیمتی سامان کو لئے پورے ہندوستان میں پھرتا رہا تھا، اچانک مر گیا ہے۔ آپ کافی دیر تک استغراق کے عالم میں بیٹھے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ زندگی کا اگر مآل یہی ہے تو اس چند روزہ زندگی کے لئے اتنی تگ و دو آخر کس کے لئے کی جائے۔ قافلہ بالکل تیار ہو کر آپ کے انتظار میں رکا ہوا تھا کہ آپ نے اعلان کیا کہ ان کا مال و متاع جس نے بھی اٹھانا ہے وہ اٹھا لے۔ اب وہ یہیں رہیں گے۔ قافلے کے لوگوں نے آپ کو پیش کش کی کہ آپ اونٹ کی وجہ سے نہ رکیں ان کے پاس کئی فالتو اونٹ ہیں ان میں سے کوئی اونٹ لے لیں مگر آپ نے انکار کر دیا اور قافلہ والوں کو صرف وطن کے نام سلام دے کر روانہ کر دیا

اور خود وہیں دریا کے کنارے اللہ کی یاد میں مشغول ہو گئے اور زہد و تقویٰ میں ولایت کے اسی درجہ پر فائز ہوئے کہ لیہ تھل کا ایک بہت بڑا روحانی سید خانوادہ آپ کا عقیدت مند ہو کر آپ کا مرید ہوا۔ آپ کی شکل و شباہت اور وجاہت و جلالت کو دیکھ کر آپ کو لوگ پیر پٹھان کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ آپ کے حسب و نسب کے متعلق کوئی ثقہ روایت نہیں مل سکی۔ نور خدا سے خود کو مثل شمع روشن کرنے والا خدا کا یہ برگزیدہ بندہ ایک عرصہ تک مخلوق خدا میں روشنیاں تقسیم کرتا رہا۔ لیہ میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مستقل قیام کے بعد بلخ بخارا کی طرف سے سامان تجارت لے کر آنے والے قافلے آتے ہوئے بھی ادھر سے گزرتے اور آپ کے ہاں پڑاؤ کرتے اور واپسی پر بھی یہ تجارتی قافلے آپ کے پاس پڑاؤ کر کے جاتے۔ آپ کے اس دنیا سے پردہ پوش ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک یہ تجارتی قافلے اسی طرح ہر سال آپ کے روضہ مبارک کے قریب آ کر پڑاؤ کرتے اور تجارتی منڈی لگاتے اور پھر یہ منڈی پورے ہندوستان میں نمک کی منڈی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس وقت ہندوستان میں تجارت زیادہ تر کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی اور موجودہ پاکستان کی مختلف کانوں کا نمک کشتیوں کے ذریعے دریائے سندھ سے لیہ پہنچتا تھا اور لیہ سے یہ نمک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اونٹوں کے ذریعے پہنچتا تھا۔ یہ نمک کی منڈی بھی صدیوں تک چلتی رہی، حتیٰ کہ جب ریل گاڑی اور ٹرک چلنے شروع ہو گئے تو اس نمک منڈی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ حضرت شاہ شرف بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی کشف و کرامات کی وجہ سے ہندوؤں کو بھی آپ سے عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ لوگ آپ کے مزار مبارک پر حاضری تو نہیں دے سکتے تھے مگر آپ کے مزار کے قریب سے گزرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر آپ کے مزار کو سلام ضرور کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کے مزار کے بالکل سامنے دریا کے ایک نالہ ہزاری کے اُس پار سناتن دھرمی ہندوؤں نے دیوان ساون مل کے بیٹے کرم فرائن کے زمانہ میں اپنا ایک سنغقان بنا لیا تھا یہاں پر ہندوؤں کے نوجوان اور بوڑھے اپنی مذہبی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور یہیں سنغقان کی چھت پر کھڑے ہو کر ہندو باوے اور ان کے چیلے جو آپ رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ آپ کے ناپختہ مزار کی طرف ہاتھ باندھ کر پرنام کیا کرتے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا نہ کوئی حسب ضابطہ مجاور ہے اور نہ کوئی متولی ہے کیونکہ آپ اتنے جلالت مآب ہیں کہ آپ نے کبھی بھی اپنے روضہ مبارک پر کسی کو مستقل رہنے نہیں دیا اور جب بھی کسی دنیا دار آدمی نے دنیا داری کی لالچ کے لئے آپ کے روضہ مبارک سے چمٹنے کی کوشش کی آپ نے اپنے کشف و کرامات سے انہیں وہ سبق دیا کہ پھر کسی کو بھی آپ کا

مجاور بننے کی جرات نہ ہوسکی۔ آپ کو کچھی (کچہ) کا محافظ بھی کہا جاتا ہے۔ روایت کے امینوں نے روایت کی ہے اور تذکرہ نگاروں نے یوں لکھا ہے کہ صحرائے تھل کی طرف سے کچہ یعنی کچھ نشیب کو جانے والا راستہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس وقت صحرائے تھل میں نہری نظام نہیں تھا۔ لوگ بھوک وافلاس کے مارے ہوئے تھے ان کے مقابلہ پر دریائی علاقہ کچہ نشیب کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور خوشحال تھے۔ چنانچہ صحرائے تھل سے اکثر لوگ چوری چکاری کی نیت سے کچہ نشیب کی طرف نکل آتے اور وہ جب آپ کے مزار مبارک کے قریب سے گزرنے لگتے تو انہیں کالی ''بھڑوں'' کے غول کے غول چمٹ جاتے اور وہ الٹے پاؤں صحرا کی طرف بھاگ جاتے یا پھر بڑی تعداد میں سانپ ان کو گھیر لیتے اور بری نیت سے کچہ کی طرف آنے والے یہ لوگ اپنے ارادے سے باز آکر واپس صحرا کی طرف بھاگ جاتے، اس طرح آپ رحمۃ اللہ علیہ آج تک کچہ نشیب کے لوگوں کی پاسبانی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ شیر شاہ سوری کے دور میں لیہ میں وارد ہوئے تھے اور چند سالوں کے بعد ہی آپ اس دنیا سے پردہ پوش ہو گئے تھے۔ آپ کے عقیدت مندوں نے دریا کے کنارے پر ہی آپ کا ایک ناپختہ مزار مبارک تعمیر کر دیا تھا جو آج تک کچھی اور تھل دونوں کے لئے خیر و برکت کا باعث ہے۔ حضرت شاہ شرف بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے کشف و کرامات آپ کی زندگی میں اتنے سرزد نہیں ہوئے جتنے کشف کرامات آپ کی پردہ پوشی کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔ آپ کی پردہ پوشی کا ابتدائی دور تھا۔ آپ کے اردگرد تمام ویرانہ تھا۔ آپ کے مزار پر خوف و دہشت کی وجہ سے بلاضرورت کوئی شخص نہ جاتا تھا۔ آپ کا مزار مبارک ناپختہ اور اجاڑ تھا۔ روایت ہے کہ ایک رہزن نے جرات کر کے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک سے کپڑا اٹھا کر لے جانے کی کوشش کی اور وہ وہیں آنکھوں سے اندھا ہو گیا اس نے ہاتھوں سے تلاش کر کے آپ کے مزار مبارک پر دوبارہ غلاف چڑھایا اور رو رو کر معافی کا خواستگار ہوا اور پھر عرصہ دراز تک آپ کے مزار مبارک پر حاضری دیتا رہا اور چوری چکاری سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا۔ آج بھی اس کی اولاد خود کو ''ڈز'' چور کہلاتی ہے۔ ایک مقامی بوڑھی خاتون آپ کے مزار مبارک پر جاروب کشی کرتی تھی اب ان کی اولاد آپ کی جاروب کشی کرتی ہے۔ ہر سال آپ کا عرس مبارک مہر گل محمد لوہانچ مرحوم کی اولاد مناتی ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں انگریز افسر اکثر ہندوؤں کے حق میں فیصلہ کرتے آپ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک اسی وقت کے کمشنری آفس کے قریب تھا۔ اکثر مسلمان اپنے

خلاف ہونے والے فیصلے پر آپ کے مزار مبارک پر آ کر فریاد کرتے چنانچہ جب دوسرے دن فیصلہ سنایا جاتا تو ان مسلمانوں کے حق میں ہوتا تھا۔ راقم الحروف کے ایک دوست جو ابھی تک زندہ ہیں انہیں کشف القبور کا سودا سر میں سمایا اور انہوں نے حضرت شاہ شرف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کو اس کے لئے منتخب کر لیا۔

کسی بزرگ سے چلہ کشی کی ترکیب معلوم کر کے چلہ کشی شروع کر دی۔ سات دن چلہ کشی ہوتی تھی مگر دوسرے ہی دن آدھی رات کے وقت مزار مبارک کے گڑگڑاہٹ سے ٹوٹنے کی ہیبت ناک آواز آئی اور پھر آپ نے کروٹ بدل کر قبر مبارک سے اپنا وجیہ ہاتھ باہر نکالا ہی تھا کہ ہمارے دوست دہشت زدہ ہو کر چلاتے ہوئے مزار سے بھاگ نکلے اور سر پر پاؤں رکھ کر جو بھاگے تو گھر آ کر گر گئے اور کئی ماہ تک صاحب فراش رہے اور غیر حالت میں رہے۔ اس وقت کے ایک عامل سید صاحب نے انہیں سہارا دینے کی بڑی کوشش کی مگر ہمارے وہ دوست ابھی تک مجذوبی کیفیت میں ہیں۔ ایک عدالت کا چپڑاسی ابھی تک زندہ ہے۔ اسے ایک ایس ڈی ایم نے ایک نہایت اہم مثل سپرد کی کہ وہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔ دوسرے دن جب ایس ڈی ایم نے مثل طلب کی تو چپڑاسی کے پاس مثل نہیں تھی۔ اس چپڑاسی کا کہنا ہے کہ اس نے گھر میں جہاں مثل رکھی تھی اس نے اس جگہ کو ادھیڑ ڈالا مگر مثل نہ ملی حتیٰ کہ اسے ملازمت سے فارغ اور پولیس کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ چنانچہ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی اور وہ اس نیت سے کہ یہاں سے فرار ہو کر علاقہ غیر میں چلا جائے اور باقی زندگی مفرور کی حیثیت سے گزار دے۔ حضرت شاہ شرف بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے اندر چلا گیا اور گڑگڑا کر رو دیا۔ روتے روتے پریشانی کی وجہ سے اس کی آنکھ لگ گئی کہ اچانک کسی نے جھٹکے سے اٹھایا اور کہا کہ جاؤ تمہاری مثل مل گئی ہے چنانچہ وہ بھاگا بھاگا گھر آیا اور جس الماری کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا اسی الماری میں سامنے مثل پڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح آپ رحمۃ اللہ علیہ کی متعدد کرامات زبان زد خلائق ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک لیہ شہر کے مغربی کونے میں دریائے سندھ کے نالہ ہزاری کے کنارے پر ایک بہت پرانے برگد کے سایہ میں واقع ہے اور اب تو آپ کے مزار مبارک کو پختہ کر دیا گیا ہے اور آپ کا عرس مبارک ہر سال شوال کے مہینہ میں نہایت احترام و عقیدت سے منایا جاتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ درماندہ دلوں کے لئے سکون کا باعث ہے۔

حضرت خواجہ غلام حسن سواگ رحمۃ اللہ علیہ

طاہر لاہوری

عدالت میں قتل کا ایک ملزم کھڑا تھا۔ باریش، باشرع پیشانی سے سجدوں کا نور پھوٹ رہا تھا۔ چہرے پر نورِ ایمان کا نقاب جگمگا رہا تھا۔ عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عدالت کی کرسی پر ایک ہندو سیشن جج بیٹھا تھا۔ استغاثے کی جانب سے جو تھانیدار پیش ہوا وہ بھی ہندو تھا۔ اسی عدالت میں ایک ہندو تحصیلدار بھی موجود تھا۔ عدالت کا ریڈر بھی ہندو تھا۔ اتنے میں ہندوؤں نے ایک اور استغاثہ پیش کیا جس پر الزام لگایا گیا تھا کہ یہ شخص جادوگر ہے اور جادو کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنالیتا ہے۔ جب یہ الزامات پڑھ کر سنائے گئے تو ملزم کے نورانی چہرے پر جلال کی شعاعیں دہکنے لگیں، جوشِ ایمانی کی امواج نے جیسے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا ہو۔ قتل کے اس ملزم نے بڑے جوش اور جذبے سے ایک ایک عدالتی افسر کی جانب باری باری انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، کیا اس کو میں نے مسلمان کیا ہے؟ کیا اس کو میں نے کلمہ پڑھایا ہے؟ جس کی جانب انگشت شہادت اٹھی اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

تمام لوگ ورطہ حیرت میں ڈوب گئے اور اس ملزم کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ یہ قتل کا ملزم کون تھا؟ یہ تھے حضرت خواجہ غلام حسن پیر سواگ رحمۃ اللہ علیہ جن کے دستِ حق پرست پر ہزاروں ہندو اور سکھ مسلمان ہوئے۔ مقدمے کا پس منظر یہ تھا کہ ہندوؤں نے دھوکے سے انہیں نور پور تھل میں دعوت دی یا آپ ویسے ہی کسی کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ ہندوؤں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کے خلاف جھوٹا مقدمہ قتل کھڑا کر دیا تھا۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ عدالتوں میں اور بڑے بڑے ہجوموں میں کھڑے ہو کر لوگوں کو دعوت اسلام دیتے اور ان کے قلبِ مطہر سے نکلی ہوئی ہر صدائے حق مردہ دلوں کے اندھیروں میں نورِ اسلام کی کرنیں بکھیر دیتی اس معمول کے طفیل ہزاروں ہندو سکھ مسلمان ہوئے اور سینکڑوں حق پرست آپ کی نگاہ کرم سے عرفان الٰہی کے نور سے معمور ہوئے۔

آپ کے کشف و کرامات کے اور بھی بہت واقعات ہیں ایک مرتبہ چاون ضلع ملتان کے مقام پر مسجد میں وعظ فرما رہے تھے۔ وعظ کے دوران ایک شخص کھڑا ہوا اور اعتراض کیا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اگر اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ معراج پر تشریف لے گئے تو آسمان سے کیسے گزرے؟ حضرت خواجہ غلام حسن رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر جوش میں آ گئے۔ جوش سے بدن کا ایک ایک رونگٹہ کھڑا ہو گیا۔ جوش و جلال کا اتنا غلبہ ہوا کہ آپ نے عالمِ وارفتگی میں روحانی قوت سے منبر سے کھڑے ہو کر فرمایا میرے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تشریف لے گئے تھے اور اسی طرح واپس تشریف لائے تھے۔ یہ کہنے کے ساتھ ہی آپ ٹھوس دیوار میں سے گزر کر گئے اور پھر واپس آئے۔ یہ واقعہ ہزاروں افراد کے سامنے رو پذیر ہوا۔ اس کے کئی شاہد اب تک بھی موجود ہیں۔ خواجہ غلام حسن رحمتہ اللہ علیہ چالیس سال کی عمر تک اپنے شیخ کامل کی خدمت میں رہے۔ اکتسابِ فیض کے خزانے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی جھولی میں ڈال دیئے گئے۔ کشفِ قلوب کے اسرار کے دروازے آپ رحمۃ اللہ علیہ پر کھل گئے اور بہت سے رموزِ قلندرانہ آپ رحمۃ اللہ علیہ پر عملاً وارد ہوئے۔

حضرت خواجہ غلام حسن سواگ رحمتہ اللہ علیہ کا سن ولادت قریباً ۱۲۸۵ھ بتایا جاتا ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ موضع ڈگر سواگ علاقہ کروڑ لعل عیسن چاہ گاڑھے والا میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا اسم گرامی ملک علل تھا۔ بچپن ہی میں والدین کے سائے سے محروم ہو گئے۔ سواگ کے ساتھ بستی کے مویشی چراتے تھے۔ پھر توفیق رب جلیل سے علم کی روشنی کی کرن سینے میں پھوٹی تو تلاش علم دین میں نکل کھڑے ہوئے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان گئے۔ وہاں مختلف مدارس سے فیضِ علم سے سیراب ہوئے۔ پھر چکڑالہ ضلع میانوالی تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت مولانا نور خاں رحمتہ اللہ علیہ سے تکمیل علم کے مدارج طے کئے وہاں حضرت مولانا نور خاں، غوثِ زماں، حضرت خواجہ محمد عثمان کے خلیفہ تھے۔ آپ کو علم ظاہری کے ساتھ حصول علم باطنی کا ذوق سلیم بھی دل میں موجود تھا۔ ایک مرتبہ مولانا نور خاں رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ موسیٰ زئی گئے وہاں حضرت خواجہ محمد عثمان رحمتہ اللہ علیہ

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مشرف بہ زیارت ہوتے ہی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں داخل ہو گئے۔ دنیاوی مصروفیتوں کے باوصف اکثر اپنے شیخ کامل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ علم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ نے نو سال اپنے مرشد کامل کی خدمت میں گزارے اور راہ سلوک کی منازل طے کیں۔ مرشد کامل نے نسبت باطنی کی پختگی اور بلندی کی یہ حالت دیکھی تو طریق نقشبندیہ کی ترویج و اشاعت کے لئے خلافت عطا ہوئی حضرت خواجہ محمد عثمان رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کے بعد قطب عالم حضرت خواجہ محمد سراج الدین کو مسند خلافت عطا ہوئی تو بھی حضرت خواجہ غلام حسن رحمۃ اللہ علیہ والہانہ محبت کے ساتھ حاضری دیتے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ موسیٰ زئی کے لنگر شریف کی خدمت میں پیش پیش تھے۔ غلہ کے چالیس چالیس اونٹ خود لنگر شریف کے لئے لے کر حاضر ہوتے۔ حضرت خواجہ محمد سراج الدین رحمتہ اللہ علیہ سے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو تین طریقوں کی اجازت عطا ہوئی۔ وہ آپ کے حق میں ہمیشہ دعا فرماتے کہ رب ارض وسماوات آپ رحمۃ اللہ علیہ کو دین و دنیا کا بادشاہ بنا دے۔

آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آپ اپنے تمام مریدین کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ آپ کے حلقہ ارادت میں تمام خادم اور درویش آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلوص، اخلاص اور محبت کے معترف تھے۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ مجھ پر محبت و کرم فرماتے ہیں۔ آپ کے مریدین اور خلفاء ہزاروں کی تعداد میں اضلاع کیمبل پور میانوالی سرگودھا، ڈیرہ اسمعیل خان بنوں، کوہاٹ، مظفر گڑھ اور افغانستان میں ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت قبلہ محمد عبداللہ المعروف پیر بارو مدظلہ تحصیل لیّہ میں ہیں ان کی زیارتِ مبارکہ سے آج بھی حضرت خواجہ غلام حسن رحمتہ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

حضرت خواجہ غلام حسن رحمتہ اللہ علیہ کا وصال تیرہ جمادی الاول ۱۳۸۵ھ میں ہوا۔ تاریخ وصال مقام یافت در جنت زاہدۃ آپ کا عرس شریف ہر سال ۱۱۔۱۲۔۱۳ جمادی الاول کو حسن آباد (متصل کروڑ لعل عیسن) ضلع لیّہ میں پوری شان و شوکت اور عزت و احترام سے منعقد ہوتا ہے۔ عرس میں ہزاروں بندگان خدا شریک ہوتے ہیں۔

لیہ میں مائی ماتا کا مندر

ڈاکٹر مزمل حسین

لیہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے صحرائے تھل کا ایک اہم شہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی تہذیب کے قدیم مراکز کسی نہ کسی دریا کے کنارے قائم رہے ہیں۔ لیہ بھی انہی دریائی تہذیبوں کی ایک مثال ہے جو اپنی تاریخ میں بہت سے درخشاں آثار و نشان رکھتا ہے۔ ان آثار میں بالخصوص اولیائے کرام کی خانقاہیں، ان کے قائم کیے ہوئے علمی و دینی ادارے، بسائے گئے تکیے، تخلیق کیے گئے فرمودات، کلام اور ان سے وابستہ تہذیبی و ثقافتی روایات ہمارا عظیم تاریخی ورثہ ہیں۔ اس ضلع میں تقریباً 30 کے لگ بھگ اولیائے کرام کی خانقاہیں موجود ہیں جو اس بات کی غمازی ہیں کہ ان میں ابدی نیند سوئی وہ برگزیدہ اور مبارک ہستیاں ہیں جو ماضی میں راہ راست سے بھٹکی اور تاریکیوں میں گم عوام کو انسان دوستی، علم اور روحانی تجلیوں سے نوازتی رہی ہیں اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ لیہ میں روحانی اور تہذیبی سلسلے کی ایک توانا روایت موجود رہی ہے۔

لیہ میں موجود انہی مزاروں میں ایک مزار "مائی ماتا" کا بھی ہے جسے بوجوہ مورخین لیہ نے اپنے مطالعہ کا حصہ نہیں بنایا اور اہل اقتدار نے بھی کبھی اس کی خستگی، تباہی اور مٹتے ہوئے آثار کی جانب توجہ نہیں دی۔

مائی ماتا کا مزار شیخ جلال الدین المعروف، شیخ جلو رحمۃ اللہ علیہ کے قبرستان کے شمال، حضرت کموں کامل رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور ریلوے لائن کے مشرق اور لیہ مائنر کے مغرب میں واقع ہے۔ اردگرد کھیت اور آبادی ہے۔ بغل میں مندر اور مڑی ہے۔ (مڑی اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں ہندو

اپنے بزرگوں کی راکھ دفناتے ہیں) اسی مندر کی نسبت سے مائی ماتا کے مزار کو مزار کی بجائے مائی ماتا کا مندر کہا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ لیہ کی کثیر آبادی بھی اس بات سے واقف نہیں کہ یہاں پر ایک بزرگ خاتون کا مزار موجود ہے جہاں پر ماضی قدیم سے لوگ جسمانی امراض سے شفاء اور روحانی فیض پاتے آرہے ہیں۔ وہاں پر موجود مزار کی متولی خورشید مائی نے بتایا ہے کہ عرصہ دراز سے مائی ماتا اسے بشارتیں دیتی چلی آرہی ہیں کہ اس کے مزار کے مٹتے آثار کو بچایا جائے اور وہ مائی ماتا کا یہ پیغام ہر آنے جانے والے کو دے رہی تھیں لیکن کسی صاحب حیثیت نے اس جانب توجہ نہیں کی۔

مائی ماتا کون تھیں؟ کہاں کی باسی تھیں؟ ان کا مذہب کیا تھا؟۔

یہ تمام حقائق صرف سینہ گزٹ اور روایات کی صورت میں موجود ہیں۔ کسی ٹھوس تحریر میں اس کے شواہد نہیں ملتے۔ 1878ء کے محکمہ مال کے ریکارڈ کے مطابق مائی ماتا کے گردونواح کو ''چاہ ماتا والا'' کہا جاتا تھا۔ اس جگہ کے مالک باوا اور وداس چیلا باوا کنول داس قوم فقیر بیراگی تھا۔ 1921ء کے بندوبست کے مطابق ملکیت کا یہ سلسلہ باوا امرداس چیلا تلوکہ داس تک پہنچتا ہے۔ اس جگہ سے لوگوں کی عقیدت دیکھتے ہوئے اس وقت کی حکومت نے سارے ''کھوہ'' کا لگان تا قیامت معاف کر دیا تھا۔ اس مزار پر ایک سرائے اور مندر بھی تھا۔ مندر اور سرائے کے آثار آج تک موجود ہیں۔ یہ مندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں مذہبی رواداری کی غمازی بھی کرتا ہے کیونکہ یہاں پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی آیا کرتے تھے۔ اور اس بات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ مذہب اور دھرم سے بالاتر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا پسند کرتے تھے۔

مائی ماتا سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس بنیادی ماخذ صرف روایات کی شکل میں موجود ہیں۔ مزار کی متولی سمیت کئی بزرگوں سے مکالمے کیے گئے، جنہوں نے متفقہ طور پر بتایا کہ مائی ماتا، شیخ جلال الدین، حضرت کموں کامل رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت اشرف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی ہم عصر تھیں۔ وہ لیہ کے ایک ہندو گھرانے (تقریباً 1600ء) میں پیدا ہوئیں لیکن ان کی زبان پر ''رام رام'' کی بجائے ذکر الٰہی کا ورد رہتا تھا۔ ان کے خاندان کو یہ بات پسند نہ تھی، وہ انہیں ایسا کرنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے، لیکن عشق الٰہی سے سرشار وہ اپنی دھن میں

مگن رہیں۔ آخر ایک روز وہ انہیں قتل کرنے کیلئے آگے بڑھے تو انہوں نے حضرت شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ (بعض لوگوں کے نزدیک حضرت کموں کامل رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس پناہ لی۔ انہوں نے انہیں دائرہ اسلام میں داخل کیا اور مزار کی جگہ موجود بوہڑ (برگد) کے درخت کے نیچے ڈیرہ ڈالنے، عبادت کرنے اور چیچک کے مریضوں کا روحانی علاج کرنے کا اذن دیا (ان دنوں علاقے میں چیچک کی وبا پھیلی تھی، جس سے لوگ لقمۂ اجل بنتے جارہے تھے اس بیماری کا یہاں پر دیسی علاج فقط یہ تھا کہ مریض کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا، اور اس پر یہ پابندی ہوتی تھی کہ وہ لوگوں سے سامنا کرنے حتیٰ کہ ان کی آواز تک سننے سے بھی پرہیز کرے۔ مائی ماتا کی وجہ سے کمروں میں بند مریض باہر آگئے اور بفضل تعالیٰ شفایاب ہونے لگے۔ چیچک یا جلدی امراض میں مبتلا مریض آج بھی اس مزار پر حاضری دیتے ہیں اور وہاں کی متولی سے دم لے کر شفا پاتے ہیں) لہٰذا مائی ماتا نے یہیں اپنا ڈیرہ ڈالا اور سارا دن چرخہ کاتتی رہتیں اور چیچک کے مریضوں کو سوت کا دھاگہ دم کر کے عطا کرتیں اور حکم ربی سے مریض شفا پاتا۔ ایک دن کوئی نامحرم آیا اور اس نے مائی ماتا کی طرف بُری نگاہ ڈالی اور دست درازی کی کوشش کی، آپ نے اپنی عصمت کے تحفظ کیلئے خدا کو پکارا، خدا کے حکم سے زمین شق ہوگئی اور آپ وہیں پر غائب ہوگئیں، اسی جگہ مائی ماتا کی قبر بنائی گئی اور اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا جو آج آپ کا مزار ہے، کہتے ہیں کہ جب آپ زمین میں غائب ہوئیں تو آپ کے دوپٹے کا ایک پلو باہر رہ گیا تھا۔

مائی ماتا کا اصل نام بھی پردہ اخفا میں ہے، البتہ ان کو کالی ماتا بھی کہا جاتا ہے، اس حوالے سے دو روایات ہیں ایک یہ کہ ان کا رنگ کالا تھا اس لیے انہیں کالی ماتا کہا جاتا تھا، دوسری روایت یہ کہ مقامی زبان میں چیچک کو کالی ماتا کہا جاتا ہے۔ اسی رعایت سے ان کا نام کالی ماتا بھی ہے۔ لیکن یہ بات مستند اور مسلم ہے کہ ان کا نام چیچک کے علاج کے حوالے سے ''ماتا'' پڑا کیونکہ مقامی زبان میں ''ماتا''، جسم پر نکلے دانوں کو کہا جاتا ہے۔

مزار کے ساتھ موجود سرائے کا ایک کمرہ اپنی خستگی کے باوجود قائم ہے۔ اس کا منقش دروازہ، مزار کے گرد مختصر سی گیلری پر لگائے گئے لکڑی کے فریم پر نقش ونگار اور مزار کے دروازے کی محراب اپنے باطن میں صدیوں کے شب وروز کے حالات وواقعات کو سمیٹے ہوئے اپنے عہد کے اہل ہنر کی فنکارانہ صناعی کی عکاس ہے۔ ہر صاحب نظر اور صاحب ذوق اس مزار کے مٹتے آثار پر اشکبار

اپنے بزرگوں کی راکھ دفناتے ہیں) اسی مندر کی نسبت سے مائی ماتا کے مزار کو مزار کی بجائے مائی ماتا کا مندر کہا جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ لیہ کی کثیر آبادی بھی اس بات سے واقف نہیں کہ یہاں پر ایک بزرگ خاتون کا مزار موجود ہے جہاں پر ماضی قدیم سے لوگ جسمانی امراض سے شفاء اور روحانی فیض پاتے آرہے ہیں۔ وہاں پر موجود مزار کی متولی خورشید مائی نے بتایا ہے کہ عرصہ دراز سے مائی ماتا اسے بشارتیں دیتی چلی آرہی ہیں کہ اس کے مزار کے مٹتے آثار کو بچایا جائے اور وہ مائی ماتا کا یہ پیغام ہر آنے جانے والے کو دے رہی تھیں لیکن کسی صاحب حیثیت نے اس جانب توجہ نہیں کی۔

مائی ماتا کون تھیں؟ کہاں کی باسی تھیں؟ ان کا مذہب کیا تھا؟۔

یہ تمام حقائق صرف سینہ گزٹ اور روایات کی صورت میں موجود ہیں۔ کسی ٹھوس تحریر میں اس کے شواہد نہیں ملتے۔ 1878ء کے محکمہ مال کے ریکارڈ کے مطابق مائی ماتا کے گرد و نواح کو ''چاہ ماتا والا'' کہا جاتا تھا۔ اس جگہ کے مالک باوا اور وداس چیلا باوا کنول داس قوم فقیر بیراگی تھا۔ 1921ء کے بندوبست کے مطابق ملکیت کا یہ سلسلہ باوا امرداس چیلا تلوکہ داس تک پہنچتا ہے۔ اس جگہ سے لوگوں کی عقیدت دیکھتے ہوئے اس وقت کی حکومت نے سارے ''کھوہ'' کا لگان تا قیامت معاف کر دیا تھا۔ اس مزار پر ایک سرائے اور مندر بھی تھا۔ مندر اور سرائے کے آثار آج تک موجود ہیں۔ یہ مندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں مذہبی رواداری کی غمازی بھی کرتا ہے کیونکہ یہاں پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی آیا کرتے تھے۔ اور اس بات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ مذہب اور دھرم سے بالاتر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا پسند کرتے تھے۔

مائی ماتا سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس بنیادی ماخذ صرف روایات کی شکل میں موجود ہیں۔ مزار کی متولی سمیت کئی بزرگوں سے مکالمے کیے گئے، جنہوں نے متفقہ طور پر بتایا کہ مائی ماتا، شیخ جلال الدین، حضرت کموں کامل رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت اشرف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی ہم عصر تھیں۔ وہ لیہ کے ایک ہندو گھرانے (تقریباً 1600ء) میں پیدا ہوئیں لیکن ان کی زبان پر ''رام رام'' کی بجائے ذکر الٰہی کا ورد رہتا تھا۔ ان کے خاندان کو یہ بات پسند نہ تھی، وہ انہیں ایسا کرنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے، لیکن عشق الٰہی سے سرشار وہ اپنی دھن میں

مگن رہیں۔ آخر ایک روز وہ انہیں قتل کرنے کیلئے آگے بڑھے تو انہوں نے حضرت شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ (بعض لوگوں کے نزدیک حضرت کموں کامل رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس پناہ لی۔ انہوں نے انہیں دائرہ اسلام میں داخل کیا اور مزار کی جگہ موجود بوہڑ (برگد) کے درخت کے نیچے ڈیرہ ڈالنے، عبادت کرنے اور چیچک کے مریضوں کا روحانی علاج کرنے کا اذن دیا (ان دنوں علاقے میں چیچک کی وبا پھیلی تھی، جس سے لوگ لقمۂ اجل بنتے جا رہے تھے اس بیماری کا یہاں پر دیسی علاج فقط یہ تھا کہ مریض کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا، اور اس پر یہ پابندی ہوتی تھی کہ وہ لوگوں سے سامنا کرنے حتیٰ کہ ان کی آواز تک سننے سے بھی پرہیز کرے۔ مائی ماتا کی وجہ سے کمروں میں بند مریض باہر آگئے اور بفضل تعالیٰ شفایاب ہونے لگے۔ چیچک یا جلدی امراض میں مبتلا مریض آج بھی اس مزار پر حاضری دیتے ہیں اور وہاں کی متولی سے دم لے کر شفا پاتے ہیں) لہٰذا مائی ماتا نے یہیں اپنا ڈیرہ ڈالا اور سارا دن چرخہ کاتتی رہتیں اور چیچک کے مریضوں کو سوت کا دھاگہ دم کر کے عطا کرتیں اور حکم ربی سے مریض شفا پاتا۔ ایک دن کوئی نامحرم آیا اور اس نے مائی ماتا کی طرف بُری نگاہ ڈالی اور دست درازی کی کوشش کی، آپ نے اپنی عصمت کے تحفظ کیلئے خدا کو پکارا، خدا کے حکم سے زمین شق ہوگئی اور آپ وہیں پر غائب ہوگئیں، اسی جگہ مائی ماتا کی قبر بنائی گئی اور اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا جو آج آپ کا مزار ہے، کہتے ہیں کہ جب آپ زمین میں غائب ہوئیں تو آپ کے دوپٹے کا ایک پلو باہر رہ گیا تھا۔

مائی ماتا کا اصل نام بھی پردہ اخفا میں ہے، البتہ ان کو کالی ماتا بھی کہا جاتا ہے، اس حوالے سے دو روایات ہیں ایک یہ کہ ان کا رنگ کالا تھا اس لیے انہیں کالی ماتا کہا جاتا تھا، دوسری روایت یہ کہ مقامی زبان میں چیچک کو کالی ماتا کہا جاتا ہے۔ اسی رعایت سے ان کا نام کالی ماتا بھی ہے۔ لیکن یہ بات مستند اور مسلم ہے کہ ان کا نام چیچک کے علاج کے حوالے سے ''ماتا'' پڑا کیونکہ مقامی زبان میں ''ماتا''، جسم پر نکلے دانوں کو کہا جاتا ہے۔

مزار کے ساتھ موجود سرائے کا ایک کمرہ اپنی خستگی کے باوجود قائم ہے۔ اس کا منقش دروازہ، مزار کے گرد مختصر سی گیلری پر لگائے گئے لکڑی کے فریم پر نقش و نگار اور مزار کے دروازے کی محراب اپنے باطن میں صدیوں کے شب و روز کے حالات و واقعات کو سمیٹے ہوئے اپنے عہد کے اہل ہنر کی فنکارانہ صناعی کی عکاس ہے۔ ہر صاحب نظر اور صاحب ذوق اس مزار کے مٹتے آثار پر اشکبار

ہے۔شاید اس مزار کا جرم، مندر کی ہمسائیگی اور اس کے مکین کا عورت ہونا ہے کہ یہاں پر بھی میل شاؤنزم کے سفلی جذبات اپنا کام دکھا گئے ہیں۔ اگر یہ مزار کسی مرد بزرگ کا ہوتا تو شاید صورتحال مختلف ہوتی۔

لیہ میں مائی ماتا کا یہ مندر اور اپنے ماضی کے حالات وواقعات کے حوالے سے اِس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس شہر میں تصوف کی روایت نہایت توانا رہی ہے اور یہاں کے لوگ دین دھرم کی تفریق سے بالاتر ہو کر ایک دوسرے کا احترام کرنے والے رہے ہیں۔

زراعت وتجارت

آبپاشی وزراعت

ملک آفتاب احمد اعوان

نسل انسانی کی بقا اور اس کی سالمیت میں پانی کا اہم کردار رہا ہے۔ زراعت، کھیتی باڑی کرہ ارض پر انسان کے وجود کے ضامن ہیں۔ دونوں کے بغیر زمین پر زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ ہماری بنیادی ضرورت پانی اور زراعت کا کلیدی کردار ہے۔ زمین شروع ہی سے پانی کی مرہون منت رہی ہے۔ قدیمی یعنی پتھر کے دور میں انسانی زندگی اور زراعت دریاؤں، ندی نالوں اور چشموں کے قرب و جوار تک محدود رہی چونکہ انسانی فکر محدود اور جدید ذرائع آبپاشی نہیں تھے۔ انسانی سوچوں کے دائرے بڑھے۔ زیر زمین آبی ذخائز دریافت کیے۔ بہتے پانیوں اور جدید ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر زراعت کو دور دور تک پھیلا دیا گیا۔

زراعت کے پھیلاؤ اور ترقی کے باوجود موجودہ صدی میں بھی بہت سے دور افتادہ اور پس ماندہ علاقے ایسے ہیں جہاں نہ دریاؤں کا پانی ہے اور نہ زیر زمین آبی ذخائر۔ اس وقت ایک سروے کے مطابق وطن عزیز کا کل رقبہ تقریباً 47.22 ملین ایکٹر ہے جس میں 39.25 ملین ایکٹر زیر کاشت ہے جو کل رقبے کا 83% ہے 7.97 ملین ایکٹر زیر کاشت نہیں ہے۔ بعض صحرائی علاقے تھل زراعت پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور کسان ہماری زراعت کی جان ہیں۔ ہمارا مستقبل صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ زراعت سے وابستہ ہے۔ کامیاب زراعت کا دارومدار کاشت کاروں کی محنت اور فراہم کی جانے والی سہولتوں پر ہے۔ دوسرے ناگزیر عوامل کے علاوہ فصلوں کے لیے پانی کی اہمیت اور افادیت مسلمہ ہے۔ فصلوں کی روئیدگی اور نشو ونما کے لئے پانی کی مطلوبہ مقدار کی بروقت فراہمی کی انتہائی ضرورت ہے۔ پانی کی اہمیت کا اس بات سے لگایا جا

سکتا ہے کہ پودے جن پر ہر قسم کی زندگی کا دارومدار ہے تقریباً 95% تک پانی ہی سے نشوونما پاتے اور پروان چڑھتے ہیں۔

زرعی بینک کا کردار

زرعی ترقیاتی بینک ابتدائی تحقیق کے بعد اس نکتے پر پہنچا ہے کہ کاشتکار قرضے کا حقدار ہے۔ آسان قسطوں میں کھاد، بیج وغیرہ کے لیے قرضہ جاری کرتا ہے۔ زرعی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہر کاشتکار مطلوبہ پیداوار میں اضافے کا خواہاں ہوتا ہے۔ مقاصد حاصل کرنے کے بعد مروجہ بینک کے قوانین وضوابط کے تحت قرضہ کی واپسی ہوتی ہے۔ کاشتکار برادری کی بروقت مالی امداد میں زرعی بینک کا کردار نمایاں ہے۔

تھل منصوبہ اصلاح آبپاشی 1981ء

حکومت پاکستان نے آبپاشی کھالوں اور ناہموار کھیتوں میں ضائع ہونے والے بیش قیمت پانی کے تدارک کے لیے سال 77-1976ء میں منصوبے اصلاح آبپاشی کو بطور پائلٹ پروجیکٹ متعارف کرایا جو اپنی گوناگوں خوبیوں اور اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر تھوڑے ہی عرصے میں پنجاب کی سات تحصیلوں سے نکل کر اب پورے صوبے کی بشمول لیہ تمام تحصیلوں میں سرگرم عمل ہے۔ ذرائع آبپاشی کی اصلاح اور بہتری کے لیے مارچ ۱۹۸۸ء تک ایک کروڑ انتالیس لاکھ روپے خرچ کیے۔ سال ۸۸۔۱۹۸۷ء کے دوران محکمہ نے تقریباً ۱۰۰ نہری کھال مکمل کیے۔ نکہ جات اور پلیاں بھی نصب کی گئیں۔ محکمہ ہر مالی سال میں کھالہ جات کی پختگی کرتا رہا ہے۔ پختہ کھال کی تعمیر اور پلستر میں سیمنٹ اور ریت کا تناسب ایک اور تین رکھا گیا ہے۔ خرچ شدہ میٹریل 25% حصہ کھال کی تعمیر کے دوسال بعد 10 ششماہی اقساط میں حصہ داران کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

پاسکو

گندم کی کٹائی کے بعد پاسکو فیلڈ میں ہزاروں ٹن گندم اپنے خصوصی مراکز (چوک اعظم، فتح پور، کروڑ، لیہ) میں سٹوریج کرتی ہے۔ محکمہ خوراک ضرورت سے زائد غلہ اگر ضلع کے باہر لے جانے پر پابندی نہ ہو تو علاقائی فلور ملوں کو فراہم کرنے کے علاوہ صوبائی حکومت کی ہدایت پر دیگر

اضلاع کو بھی بھیجتا ہے۔ محکمہ کی خرید تقریباً ۹۵ ہزار ٹن سے زائد ہے جو گندم کا ہدف مقرر ہے۔

فصلات

خاص زرعی پیداوار گندم، کپاس، چنے، گنا، دالیں، جوار، مکی، جوالسی، سبزیاں، گوارا، باجرہ اور مونگ پھلی ہیں۔ اس ضلع کی پیداواری صلاحیت اتنی ہے کہ خوراک کے سلسلے میں خود کفیل ہے۔ اگر آسمانی آفات سے فصلیں محفوظ ہوں تو علاقائی فصلات کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ دریائے سندھ میں ہر سال سیلاب آنے کی وجہ سے فصلیں متاثر ہوتی ہیں

پاسکو نے ضلع لیہ سال میں ۹۴۔۱۹۹۳ء کے لئے ۲۳ ہزار مراکز برائے خریداری گندم قائم کیے تھے جہاں پر مقامی زمینداروں اور کاروباری حضرات کو مقامی بنکوں کے ذریعے بروقت ادائیگی کی جاتی رہی تا کہ باردانہ کی فراہمی میں بھی کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ضلع لیہ کا ماحولیاتی جائزہ

پروفیسر اکرم میرانی

جب سے زمین پر انسان نے ضرورت سے زیادہ مہربانیاں شروع کی ہیں اُسی دن سے اس کا ماحولیاتی نظام دباؤ کا شکار ہونا شروع ہوا ہے اور آج حالات اس قدر سنجیدہ شکل اختیار کر چکے ہیں کہ ماحولیاتی بگاڑ کی بدولت انسانی زندگی متاثر ہونا شروع ہو گئی ہے۔

زمین کے ماحولیاتی نظام کے چار بنیادی عناصر ہیں۔

1۔ پانی

2۔ حیوانات ونباتات

3۔ کرہ ہوائی

4۔ ریگستان وپہاڑ وغیرہ

انسانوں کی بڑھتی آبادی اور غیر ضروری خواہشات وضروریات نے زمین پر حالات اس قدر بدل دیئے ہیں کہ اب انسان خود بھی چونک گیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک ماحولیات کے بحران سے گزر رہے تھے مگر اب پاکستان، انڈیا اور چین جیسے ممالک بھی اس کی گرفت میں آ رہے ہیں۔ کسی ایک ضلع کا ماحولیاتی جائزہ اور اس میں تبدیلیوں کا جائزہ لینا آسان نہیں کیونکہ ماحولیاتی تبدیلی کو گلوبل تناظر میں جانچنا اور سمجھنا آسان اور ممکن ہے، اسے چھوٹے لیول پر محسوس کرنا تھوڑا مشکل ہے۔ مگر اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ سرائیکی علاقہ میں جدیدیت کے موجودہ

تصورات سے اُبھرنے والے ماحولیاتی مسائل کی ایک جھلک ضلع لیہ کے بدلتے حالات میں دیکھی جائے۔

لیہ اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے انوکھی ہیئت کا مالک ہے اس میں ایک طرف ایک بڑا ریگستان (تھل) ہے، درمیان میں عظیم دریا سندھ بہتا ہے جبکہ دوسرے کنارے کوہ سلیمان ہے۔ پہاڑ، دریا اور ریگستان کا یہ حسین سنگم جو اپنے موسموں کی شدت کے حوالے سے جانا جاتا ہے وہاں اس کے موسم کے ساتھ بدلتے رنگ شعراء، ادیبوں اور ماحولیات کے ماہرین کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لئے بے تاب کرتے تھے۔ دریائے سندھ کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کے وسیع دریائی جنگلات سے پرندوں اور مچھلیوں سے بھرے وسیع سیلابی ٹوبھے، کوہ سلیمان کی رودکوہیاں اور ان سے جنم لینے والی ہریالی اور زرخیزی کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ دوسو کلومیٹر سے زیادہ لمبائی اور سو کلومیٹر چوڑائی والا تھل کہ جس میں جنڈ اور جال کے وسیع جنگلات ہوا کرتے تھے، جہاں جانوروں اور پرندوں کی سینکڑوں قسمیں اپنا بسیرا کیا کرتی تھیں آج اُن کا خیال ذہن میں لائیں اور آج کے تھل، کچھی اور دامان پر نظر ڈالیں تو آنکھیں یقین ہی نہیں کرتیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ یہاں سینکڑوں میلوں پر پھیلے جنگلات ہوا کرتے ہوں گے۔ سندھ کے پانی میں مچھلی اور پرندوں کی بہتات رہی ہوگی۔ ماضی کے لیہ کے لینڈ سکیپ اور آج کی کیفیت میں نمایاں فرق ہے۔ ماضی کے لیہ کا ماحولیاتی نظام تھل، کچھی اور کوہِ سلیمان کے دامن سے رِستی ہوئی رودکوہیوں کے نمکیات سے پُر زندگی کے لئے خوشیوں کے پیغام بھرے پانی کی آماجگاہ تھا مگر آج اس کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ تھل کے جنگلات نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ صرف چوبارہ میں چند کلومیٹر پر مشتمل جال کے جنگلات ماضی کی یادگار کے طور پر موجود ہیں جن میں پرندوں اور جانوروں کا وجود شکاریوں کے مظالم کی نذر ہو گیا ہے۔ تھل کے مقابلے میں چولستان پھر بھی خوش قسمت ہے کہ سرحد پار ہندوستان سے جانور اور پرندے وہاں آ بستے ہیں جو شکاریوں کا شکار تو ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی وہاں کے باسی اُن کی چہچہاہٹ اور مستی کا سماں تو دیکھ پاتے ہیں مگر تھل میں تو خوشی کے چند دن بھی پرندوں اور جنگلی جانوروں کو میسر نہیں۔ ہر طرف زمین الاٹ کروانے کے

خواہش مندوں کی بھیڑ ہے جو چراگاہوں اور جنگلات پر قابض ہونے کے انتظار میں ہیں۔

دریائے سندھ پر مختلف ڈیموں کی تعمیر کی بدولت پانی اس قدر کم ہوگیا ہے کہ 20 کلومیٹر تک پھیلا ہوا دریا اب چند کلومیٹر کے بیٹ اور کمزور سی گزرگاہوں تک محدود ہو گیا ہے جس میں جنگلات نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ پرندوں کے بسیرا کرنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں بچی اور نہ جنگلی جانوروں کی افزائش کے امکانات بچے ہیں بلکہ اب تو سردیوں میں آبسنے والے پرندے بھی اس طرف کا رخ کرنے سے ہچکچانے لگے ہیں کیونکہ انہیں کھانے کو کچھ نہ کچھ مچھلی تو مل جاتی ہے مگر عارضی بسیرا میسر نہیں کہ جہاں شب بسری کرسکیں۔ اس ماحولیاتی تبدیلی کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا شکار تو جنگلی جانور، دریائی مچھلیاں، کچھوے اور دوسرے حشرات ہوئے ہیں مگر اب انسان کی غیر ضروری پہل کاری خود اُس کے لئے بھی مصائب لا رہی ہے۔ لیہ کا زیرزمین پانی نہ صرف کم ہو رہا ہے بلکہ سیوریج کا پانی ندی نالوں میں ڈالے جانے کی بدولت زیرزمین پانی مضر صحت ہو رہا ہے اور اس سے کئی طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں جو انسانوں، درختوں اور باغات کے لئے مصائب لا رہی ہیں۔ تھل مکمل بدل چکا ہے، ہر طرف انسان اور چھوٹے چھوٹے قصبے زمین پر پھوڑوں کی طرح اُگ رہے ہیں جبکہ فضائی آلودگی میں اضافہ ہو رہا ہے، سردی کم ہو رہی ہے اور گرمی بڑھ رہی ہے۔

انسان کی اس سوچ، کہ وہ اشرف المخلوق ہے، نے اسے اس قدر لاپرواہ اور خود غرض بنا دیا ہے کہ اس کے اعمال کی بدولت دوسرے ذی روح، پانی اور پہاڑ و ریگستان تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر زمین پر موجود ماحولیاتی نظام شکست و ریخت کا شکار ہے جس نے بنیادی اخلاقی مسائل کو جنم دیا ہے۔ ماضی کا یہ اخلاقی تصور کہ ہر وہ کام درست ہے جس سے انسان کو خوشی اور فائدہ حاصل ہو، ایسی ماحولیاتی تباہی کی بنیاد فراہم کر رہا ہے کہ اب انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس اخلاقی ضابطے میں وسعت لائے کہ جس میں تمام زندگی کو شامل کرے بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ انسانی کردار کو ماحولیاتی نظام کی تقویت کے حوالے سے جانچا جائے یعنی ہر وہ چیز اچھی ہے جو زمین پر موجود ماحولیاتی نظام کو تقویت فراہم کرے اور ہر وہ انسانی عمل غلط ہے جو

اس ماحولیاتی نظام کی شکست و ریخت کی وجہ بنے۔

لیہ کا ماحولیاتی نظام مکمل تباہی کی شکل اختیار کر رہا ہے کہ جس کے جنگلات خاتمے کے قریب ہیں، تھل کا ریگستان آباد ہو چکا ہے اور دریائے سندھ لاغر ہو چکا ہے۔ کوہ سلیمان کے پتھروں سے جنم لینے والا دامان کا رودکوہی سسٹم آخری سانسیں لے رہا ہے جبکہ یہاں کے باسیوں کو اس تباہی کا احساس تک نہیں، وہ اسے زرعی ترقی اور جدیدیت کے حوالے سے خوشی خوشی آگے بڑھا رہے ہیں۔

کرہ ہوائی، جانوروں، پرندوں، جنگلات، دریا، مچھلیوں اور چٹانوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو لیہ ماحولیاتی بحران کی طرف بڑھ رہا ہے اور اگر انسانی مفاد کے حوالے سے بغور جائزہ لیا جائے تب بھی آنے والے سالوں میں یہاں مشکلات میں اضافہ کا رجحان رہے گا کیونکہ تھل میں زیرزمین پانی کا بحران جنم لے رہا ہے جبکہ جنگلات میں کمی کی بدولت فضائی آلودگی اور گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے اور انسانی آبادی میں اضافہ کی بدولت پینے کے پانی میں خرابی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے پیٹ کی بیماریوں، فضا میں دھواں و گرد و غبار اور گرمی کی شدت میں اضافہ سانس کی بیماریوں کی وجہ بن رہا ہے۔ زرعی ادویات کے بے دریغ استعمال نے زندگی علیحدہ اجیرن کر رکھی ہے جبکہ لیہ کا زیرزمین چٹانوں کا نظام بھی انحطاط پذیر ہو رہا ہوگا کیونکہ جہاں ریگستان تھا وہاں زراعت ہو رہی ہے جبکہ جہاں دریا تھا وہ جگہ ریگستان میں بدل رہی ہے اور جنگلات ختم ہو رہے ہیں۔ ایسے میں ترقیاتی ایجنڈا کے پُرانے اندازِ فکر کو برقرار رکھنے پر ایک مرتبہ پھر غور کیا جانا چاہئے۔ ساتھ ہی عوام کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ضروری ہے کہ کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے چند بنیادی تقاضے ہیں جن میں کرہ ہوائی، جنگلات، دوسری زندہ مخلوق، صاف پانی اور زمین کی اوپری سطح کی موجودہ شکل کا برقرار رہنا انتہائی اہم ہیں۔ زمین کے قدرتی ماحولیاتی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے سے بڑے مصائب جنم لے سکتے ہیں جو اگر دوسری زندہ مخلوق کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے تو آخر کار انسان بھی ان کا شکار ہوگا۔ لیہ کے باسیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آبادی پر کنٹرول کرتے ہوئے کثرت کے مقابلے میں کوالٹی پر توجہ مرکوز کریں

اور اپنے ارد گرد کے ماحول کی مکمل حفاظت کریں۔ دریائے سندھ اور تھل کے جنگلات ان کے لئے خوشی اور خوشحالی کی نوید ہیں۔

حرف وخیال کا جمال

لیہ کی علمی وادبی روایت

ڈاکٹر مزمل حسین

لیہ کی معلومہ تاریخ کا آغاز 16 ویں صدی سے ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ 1550ء میں میرانی قبیلہ کے ایک مقامی سردار ''کمال خان'' نے لیہ کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے کی تاریخ کے بارے میں ابھی تک مربوط ہسٹریوگرافی کے اصولوں کی روشنی میں کوئی نیا نظریہ سامنے نہیں آیا۔ انفرادی کوششوں سے بعض لوگوں نے یہاں سے کچھ آثار قدیمہ اور نوادرات دریافت کیے ہیں، لیکن کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ اس ضلع کے لوگوں کا بنیادی ذریعہ معاش زراعت سے منسلک ہے، اس کے علاوہ اس کی جغرافیائی حیثیت بھی کوئی آئیڈیل نہیں۔ علمی وادبی اور تہذیبی مراکز سے بہت پرے بسا یہ دور افتادہ شہر ہے۔ یہاں صرف ایک شوگر انڈسٹری اور چند فلور ملز ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہاں معاشی خوشحالی کے مواقع ناپید ہیں اور تعلیمی ادارے بھی کسی بڑے معیار یا مقام پر فائز نہیں۔ علمی، ادبی اور تہذیبی مراکز کے لئے جو چیزیں ناگزیر ہوا کرتی ہیں ان میں خوشحالی، ریاستی سرپرستی اور اشرافیہ کا تعاون نمایاں ہوتا ہے لیکن لیہ اس حوالے سے محروم ضلع ہے کہ یہاں ریاست کی توجہ کسی بھی اعتبار سے حوصلہ افزا نہیں رہی لیکن ان تمام محرومیوں کے باوجود یہ شہر سرائیکی وسیب میں علم وادب اور تعلیمی حوالے سے ایک معتبر مقام پر فائز ہے۔ سرائیکی وسیب کے دو بڑے شہر ملتان اور بہاولپور تاریخی تناظر میں علمی وادبی ہر اعتبار سے درخشاں روایات رکھتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ صرف ریاستی سرپرستی اور سرکاری اداروں کا کردار ہی نہیں بلکہ یہاں کی اشرافیہ کی سرپرستی، تعاون اور حوصلہ افزائی نے ان شہروں کو ہمیشہ علم وادب اور تعلیم کے میدان میں مثالی رکھا۔ اس سلسلے میں بہاولپور کے عباسی اور ملتان کے گیلانی، قریشی اور

گردیزی خاندان بطور خاص تحسین کے مستحق ہیں پھر ان شہروں میں موجود جامعات، تعلیمی ادارے اور اخبارات، جرائد ورسائل کی اشاعت نے یہاں پر ایک خاص علمی ماحول کو قائم رکھا، لیکن لیہ کے بڑے زمیندار گھرانوں اور اشرافیہ میں ایسی حوصلہ افزائی کرنے کا تصور کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے زمیندار گھرانے یا تو ''نو دولتیے'' ہیں یا پھر ان کی کئی نسلیں تعلیم سے محروم چلی آرہی ہیں اس لئے انہیں فنون لطیفہ، علم وادب، تعلیم اور تہذیب ایسے نفیس اور روح پرور ثمرات کا ادراک ہی نہیں اور نہ ہی لیہ میں بڑے تعلیمی اور اشاعتی ادارے ہیں۔

اہل لیہ مزاجاً علم دوست اور جمہوریت پرست ہیں، ویسے بھی "Indus Sagar" کے مطابق وادیٔ سندھ کے لوگ جمہوریت پسند اور تعصبات سے پاک تصور ہوتے ہیں، اس لئے اہل لیہ کو وادیٔ سندھ کی تہذیب کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ قیام پاکستان سے قبل راجہ عبداللہ نیاز (1895ء-1971ء) فتح محمد کلاچی (م1901ء) ایسے شعراء نے یہاں شعری وادبی روایت کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ قیام پاکستان سے قبل تعلیمی حوالے سے ڈھینگڑا خاندان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اندر بھان ڈھینگڑا وغیرہ نے یہاں بھراتری ہائی سکول کی بنیاد رکھی اور ایک تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا اور قیام پاکستان کے بعد اسی ٹرسٹ کی بنیاد پر پانی پت (انڈیا) میں تعلیم کے فروغ کے حوالے سے اپنا کام جاری کیے ہوئے ہیں۔ دوسرے خاندان ''نارنگ'' اور ''گابا'' تھے، علم وادب اور تعلیم کے فروغ کے حوالے سے ان خاندانوں کا نام بھی تاریخ میں موجود ہے، نارنگ خاندان کے عظیم سپوت گوپی چند نارنگ کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کا شمار اس وقت اردو تحقیق وتنقید میں نمایاں ترین ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم لیہ سے حاصل کی، وہ آج بھی اپنی تحریر وتقریر میں اپنے عظیم استاد جناب مرید حسین ڈوگر کا نام لینا نہیں بھولتے۔ مرید حسین ڈوگر کا تعلق موضع ''سہووالا''، ضلع لیہ سے تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آباد ہونے والے شعراء میں ذاکر جگرانوی (1894ء-1970ء)، فرمان پٹالوی (م1970ء)، شارق انبالوی (م1986ء)، ارمان عثمانی (م1981ء)، پروفیسر ساقی الحسینی (م1974ء)، غافل کرنالی (پ1933ء)، عبدالغفار عابد (م1993ء)، شیدا گوڑیانوی (1904ء-1974ء)، قیصر عباس قیصر رضوی (م1978ء)،

فضل حق رضوی، خان عثمان خان اور ڈاکٹر خیال امروہوی (پ1930ء) نے یہاں پر اردو شاعری کے ارتقاء میں مہمیز کا کام کیا اور ایک ایسا سازگار شعری ماحول پیدا کیا جس میں نسیم لیہ ایسے خوبصورت شعراء سامنے آئے جن کی شاعری کی مہک سے پورا وسیب معطر ہے۔ نسیم لیہ کے علاوہ جعفر بلوچ (1947ء-2008ء)، شکستہ مشہدی، سنبل قریشی (م1986ء)، عدیم صراطی (پ1942ء)، شعیب جاذب (پ1942ء)، پروفیسر شہباز نقوی (پ1950ء)، عقیل رشید عاربی، ڈاکٹر فیاض قادری، پروفیسر نواز صدیقی، امان اللہ کاظم، سلیم گورمانی، احسن بٹ، لطیف فتح پوری، ناصر ملک، جمشید ساحل، ذکی تنہا، افضل صفی، پروفیسر ریاض راہی، طاہر مسعود مہار، وقار بخاری، فرح تحسین بخاری، موسیٰ کلیم، پروفیسر کاشف مجید، جنید سکندر، شاہد رضوان چاند، عمران عاشر، ڈاکٹر افتخار بیگ، اشرف درپن، یوسف حسنین نقوی، منور بلوچ، عبدالرحمٰن مانی، احسان اللہ محسن خلجی، نعمان اشتیاق، رابعہ نیازی، سلیم اختر ندیم، جسارت خیالی اور میاں شمشاد سرائی نے جدید اردو شاعری میں دلکش اضافے کیے ہیں۔ سرائیکی اور پنجابی شاعری میں نذیر چودھری (م1987ء)، نسیم لیہ، ڈاکٹر مہر عبدالحق، خاور تھلوچی، امان اللہ کاظم، ڈاکٹر اشولال، سلیمان سہو، پروفیسر شفقت بزدار، واصف قریشی، نادر قیصرانی، طارق گجر، ناصر ملک، حمید الفت ملغانی، ڈاکٹر گل عباس اعوان، مجید اعوان، اقبال نسیم صحرائی، منظور بھٹہ، فضل روکڑی، رفیق ہمراز، ریاض قیصر، ندیم سوہایا، منشی منظور، عباس واصفی، امین سہیل ملغانی، ساجد سواگی، بانو بلوچ، ڈاکٹر مزمل حسین، عبدالقدوس ساجد، جمعہ خان عاصی، صادق حسنی اور شفقت عابد وغیرہ اہم نام ہیں۔

لیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید میں بھی نمایاں کام ہوا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مہر عبدالحق ایک بڑا نام ہے۔ ان کا خاص حوالہ لسانیات اور فریدیات ہے۔ انہوں نے اردو زبان کے بارے میں نظریہ پیش کرتے ہوئے اردو اور سرائیکی زبان کے باہمی روابط پر بات کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، پروفیسر اکرم میرانی، جعفر بلوچ، پروفیسر اختر وہاب، ڈاکٹر افتخار بیگ، ڈاکٹر نذیر علوی، ڈاکٹر گل عباس اعوان، ڈاکٹر مزمل حسین (راقم)، پروفیسر ریاض راہی، جسارت خیالی، پروفیسر مظہر حسین شاہ، قاضی راشد، عاشق حسین بھٹی، پروفیسر شاہین مزمل، پروفیسر کاشف مجید، زبیدہ افضل، بانو بلوچ، عطیہ

یاسمین، پروفیسر مختار بلوچ، طارق گجر، نور محمد تھند، ناصر ملک، طاہر مسعود مہار اور افضل صفی نے بنیادی نوعیت کا کام کیا۔

سرائیکی نثر کے حوالے سے حمید الفت ملغانی کا نام وسیب کے لکھاریوں میں نہایت محترم ہے۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی کتب اب جامعات کی سطح پر اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ انہوں نے پاکستانی زبانوں کے ادب کے حوالے سے ایم فل کیا ہے۔ وہ سرائیکی میں سب سے پہلے ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے والے قرار پائے ہیں، گزشتہ کئی برسوں سے سرائیکی شعر وادب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ڈاکٹر مہر عبدالحق جنہیں بابائے سرائیکی کے لقب سے جانا پہچانا جاتا ہے پر انہوں نے سرائیکی لسانیات، قواعد اور تاریخ پر گراں قدر کام کیا ہے۔ اسی طرح سرائیکی کی تخلیقی نثر میں ڈاکٹر اشولال اور سلیمان سہو وغیرہ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر اکرم میرانی، نسیم لیہ، مظہر نواز، برکت اعوان، طاہر مسعود مہار اور ڈاکٹر مزمل حسین (راقم) نے بھی سرائیکی نثر میں کام کیا ہے۔

لیہ میں صحافت کا حوالہ بھی قابل توجہ ہے۔ ایم اے روحانی، امتیاز روحانی، ملک محمد حسین جھکڑ، نسیم لیہ، غافل کرنالی، ریاض روحانی، برکت اعوان، نثار عادل مرحوم، گلزار محجوب، خورشید ملک (مرحوم)، عبدالحکیم شوق، عبدالحمید سلیمی، انجم صحرائی، عابد فاروقی، طارق پہاڑ، طارق ملک، پروفیسر کریم درانی، ناصر ملک، فریداللہ چودھری، سعید باروی، ملک مقبول الٰہی، منیر عاطف، نذیر بھٹی، جمشید ساحل، یامین مغل، مرزا یعقوب، ظفر نثار، راجہ اعجاز (مرحوم)، راشد سمرا، عائشہ بخش، ثمن جاوید، خضر کلاسرہ، یوسف حسین نقوی، محسن عدیل، یاسین ملک، خالد شوق، عثمان خان، اکرم میرانی، سلیم اختر ندیم، کلثوم خالق اور رانا اعجاز محمود نامور صحافی ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت رکھنے والے صحافیوں میں واحد بخش بھٹی اور رؤف کلاسرہ لیہ کا مان ہیں۔

تراجم کے حوالے سے ڈاکٹر مہر عبدالحق نے قرآن مجید اور قصیدہ بردہ شریف کے کامیاب تراجم کئے۔ حمید الفت ملغانی نے سرائیکی میں 8 ناول اور دیگر تحریروں کے تراجم کیے۔ احسن بٹ نے پچاس سے زائد کتب کو اردو کا جامہ پہنایا اور اقبال نسیم صحرائی نے شیکسپیئر کے اہم ڈراموں کا سرائیکی زبان میں ترجمہ کیا۔ شعر وادب، تحقیق وتنقید، سماجی علوم اور صحافت کے میدان میں لیہ کے دانش وبینش کی خدمات کو کسی طور پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کے شعراء کے کئی اشعار ضرب

الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً

میں اسی خیال سے آج تک کبھی دل کی بات نہ کہہ سکا
کہ وہ درد وغم سے ہے بے خبر کہیں مسکرا کے نہ ٹال دے

(ارمان عثمانی)

اس تجسس میں رہا کرتا ہے نقاشِ خیال
رنگ مل جائے کہیں تو تری تصویر بنے

(پروفیسر ساقی الحسینی)

دیار مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو
ستم ظریف پیمبر خرید لیتی ہے

(نسیم لیہ)

ہم ہیں اس دور سے انسان کی صداقت کے نقیب
جب کسی حلقۂ زنجیر میں جھنکار نہ تھی !!!

(خیال امروہوی)

انساں سے محبت کی سزا کتنی کڑی تھی
نفرت کے طمانچے میرے رخسار تک آئے

(خیال امروہوی)

میرا اسراف ترے شہر کو افلاس نہ دے
آ مرے گھر سے یہ مٹی کا دیا بھی لے جا

(عدیم صراطی)

کشا۔ لب کے تذبذب میں کھو دیئے ہم نے
وہ چند لمحے جو ان سے ترس ترس کے لیے

(جعفر بلوچ)

اس سے پیمانِ ملاقات اگر لینا تھا
کوئی اندازۂ ہجراں بھی تو کر لینا تھا

(شہباز نقوی)

کون مجھ کو سمجھائے، کس طرح سمجھ پاؤں
چاندنی سے ڈرتا ہوں، چاند سے ارادت ہے

(نواز صدیقی)

لہجے بُرا کے گفتگو کرتے ہیں لوگ سب
اپنی زبان سے تو کوئی بولتا نہیں

(شعیب جاذب)

ساری رات ملوکھ ہتھاں دے نال نہ سانول سی بوچھن
مل دے بوچھن پھلدے کائینی بوچھن نال نہ تھی بوچھن

(شفقت بزدار)

اسے کہاں عظمت کے تفاخر سے فرصت ہے
کون افلاک سے افلاس کو جھک کے دیکھے

(ڈاکٹر افتخار بیگ)

اردو کی تخلیقی نثر میں ڈاکٹر افتخار بیگ، ناصر ملک، احمد اعجاز، کاشف مجید، جمشید ساحل اور احسان اللہ خلجی نے خوبصورت افسانے تخلیق کئے۔ احمد اعجاز کے اب تک دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے افسانے جدید لب و لہجے سے مملو ہوتے ہیں۔ انہوں نے علامتی اور بیانیہ، دونوں انداز کے افسانے تخلیق کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے افسانوی تنقید پر بھی اہم کام کیا ہے۔ اسی طرح ناصر ملک نے کئی شاہکار افسانے تخلیق کئے۔ ان کے بعض افسانوں کے دیگر زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق، تنقید، تخلیقی نثر اور دیگر سماجی علوم میں یہاں کے اہل قلم نے کئی رجحان ساز کام کیے ہیں مثلاً ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اردو زبان کے حوالے سے اپنا مستند نظریہ پیش کر کے اردو لسانیات کے مباحث میں نئے اضافے کئے۔ اسی طرح سرائیکی زبان کی تاریخ، تحقیق اور قواعد پر بنیادی نوعیت کا کام کیا۔ فریدیات، دینیات اور فلسفہ اس کے سوا ہیں۔ ادبی تحقیق میں جعفر بلوچ اور دیگر ریسرچ سکالرز نے اچھوتے موضوعات پر کام کر کے اس نظریہ کو باطل ثابت کر دیا کہ بڑا کام صرف مراکز میں بیٹھ کر ہو سکتا ہے۔ سماجی علوم میں پروفیسر اکرم میرانی نے بڑی بے کسی سے بعض مباحث کا آغاز کیا۔ پروفیسر نواز صدیقی بیک وقت شاعر، کالم نگار، دانشور اور تجزیہ نگار ہیں۔ ''مسلم سوسائٹی کا مخمصہ'' ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ہر اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔ انہوں نے پہلی بار اقبالیات اور اسلامی معاشرے کے اندرونی خدوخال کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ خیال امروہوی اور ڈاکٹر افتخار بیگ نے اپنی اپنی تحقیق کی بنیاد فلسفہ اور منطق پر رکھی اور ادب اور فلسفے کے امتزاج سے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے صحافت اور ادب کے باہمی روابط کو سمجھا۔ ڈاکٹر گل عباس اعوان نے شاعری میں انسان دوستی کے رویوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ حمید الفت ملغانی نے سرائیکی کتابیات، سرائیکی ادبی جائزے، تراجم اور سرائیکی تحقیق و تنقید کو نئے انداز سے دیکھا۔ ڈاکٹر اشولال اور پروفیسر شفقت بزدار نے سرائیکی نظم کو جدید اسالیب سے فروغ دیا۔ پروفیسر رامش خیالی نے اردو، براہوی، انگریزی اور سرائیکی ادبیات پر محققانہ نگاہ ڈالی۔ حمید الفت ملغانی، اشولال، احسن بٹ اور اقبال نسیم صحرائی نے تراجم کے ذریعے سرائیکی اور اردو زبان و ادب کو Rich کیا۔ نسیم لیہ، جعفر بلوچ، پروفیسر شہباز نقوی، سلیم گرمانی اور پروفیسر کاشف مجید نے جدید اردو غزل میں اپنا منفرد مقام بنایا۔ عبدالرحمٰن مانی، ڈاکٹر افتخار بیگ، ناصر ملک، جمشید ساحل

اور منور بلوچ نے جدید اردو نظم میں تخلیقات کیں۔ سلیمان سہو نے سرائیکی کافی کو نئے رنگ دیئے اور مظہر نواز (مزار خان) نے سرائیکی زبان میں سفر نامہ لکھا۔

اس تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو اہل لیہ اس حوالے سے خوش قسمت رہے ہیں کہ یہاں جس علمی و ادبی روایت کا آغاز قیام پاکستان سے قبل ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ اپنے سفر کی جانب رواں دواں ہے اور اسی توانا روایت کے یہ ثمرات ہیں کہ ضلع لیہ میں سیاسی اور سماجی شعور کا گراف بلند سے بلند تر ہو رہا ہے۔ شاید سرائیکی وسیب کا یہ واحد ضلع ہے جہاں خالصتاً جمہوری کلچر موجود ہے اور لوگ اپنے سیاسی نظریات کو کھلے بندوں استعمال کر کے ہی ووٹ دیتے ہیں اور یہ بات کہنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ اس سیاسی شعور کے عقب میں یہاں کے تخلیق کاروں، شعراء، ادباء اور دانش وروں کا نمایاں کردار ہے۔ تاہم علمی، ادبی اور تہذیبی مرکز بننے کے لئے جن عوامل کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے وہ لیہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ لیہ کے اہل قلم نے اپنی انفرادی مساعی سے اس شہر کو سرائیکی وسیب میں جس مقام پر پہنچایا ہے اگر یہاں پر ریاستی سطح پر سرپرستی کی جاتی یا معاشی خوشحالی کے مواقعے پیدا کیے جاتے تو اس شہر کی اتنی تہذیبی اور تخلیقی توانائی موجود ہے کہ یہ سرائیکی وسیب میں ایک اہم علمی، ادبی اور تہذیبی مرکز بن جائے گا۔

لیّہ کی جدید ادبی تنظیمیں......ایک جائزہ

میاں شمشاد حسین سرائی

جغرافیائی لحاظ سے لیہ پنجاب کا پسماندہ علاقہ ضرور ہے لیکن ادبی و علمی لحاظ سے کسی سے کم نہیں "لیہ" وہ صدف ہے جس کی کوکھ سے ایسے ایسے لعل و جواہر اور موتی نمودار ہوئے جن کی چمک نے برصغیر کے ادب کو روشن کر دیا۔ تھل کے ریگزاروں میں افق ادب پر ایسے آفتاب طلوع ہوئے جس کی سنہری کرنیں آج بھی جہانِ ادب کو منور کیے ہوئے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیب، ماہر تعلیم و مورخ جن کی تخلیقات کو ملک اور بیرون ملک ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے، ان کا تعلق سرزمین لیہ سے ہے۔ جن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (جو آج کل نہرو یونیورسٹی دہلی میں صدر شعبہ زبان و ادبیات ہیں) معروف ماہر تعلیم عبداللہ نیاز مرحوم، ڈاکٹر مہر عبدالحق سمرا اور مشہور مؤرخ و ادیب فقیر میاں الٰہی بخش لیکھی سرائی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں اور انہیں علمی ادبی پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔

لیہ کی جدید ادبی تاریخ و فضا پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس صحرائے تھل میں ۱۹۴۴ء سے قبل کسی ادبی انجمن یا اکیڈمی کا باضابطہ حوالہ نہیں ملتا۔ البتہ واقعات کربلا اور امام عالی مقام حضرت حسین علیہ السلام پر سرائیکی دوہڑے اور بندوں کی صورت میں منظوم خراج عقیدت دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل لیہ میں فروغ علم و ادب کے سلسلہ میں باضابطہ ادبی انجمنیں معرض وجود میں آئیں اور انہوں نے تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھائی۔ ان ادبی انجمنوں کا مختصر تعارف و ادبی خدمات درج ذیل ہیں۔

ا۔ بزم علم وادب

۱۹۴۴ء کے وسط میں اس بزم کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ادبی انجمن ہائی سکول کی سطح سے ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے سکول کے اندر اور باہر بہت جلد معروف ہو گئی اور بے مثال مشاعرے ہوئے۔ اس بزم کا سہرا جن کے سر تھا، ان میں برصغیر کے مشہور نقاد و دانشور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (بھارت) جو کہ اس وقت ہائی سکول لیہ میں میٹرک کے طالب علم تھے اور ان کے ساتھ اس ادبی سفر میں ان کے ساتھی معروف شاعر نسیم لیہ (جنرل سیکرٹری) ریاض انور بیدی، خادم حسین بھٹی اور دامن ابا سینی جیسے نابغہ روزگار لوگ شامل تھے۔ اس ادبی انجمن نے لوگوں میں ادبی شعور بیدار کیا، ادب سے روشناس کرایا اور ادب کی خدمت کا ذوق وشوق پیدا کیا۔

۲۔ بزم ارباب سخن لیہ

معروف سرائیکی شاعر حسن رضا گردیزی جو کہ لیہ میں بطور تحصیل دار تعینات ہوئے انہوں نے آتے ہی یہاں کے شعراء کے ساتھ مل کر ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی جو کہ ''بزم ارباب سخن لیہ'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ موصوف اس کے صدر منتخب ہوئے اور معروف نقاد سرائیکی اردو کے مشہور دانش ور ڈاکٹر مہر عبدالحق سمرا صاحب جنرل سیکرٹری۔

اراکین میں نسیم لیہ، رب نواز شکستہ، مولانا محمود الرحمٰن، محمد شفیع خان عامی، عبدالرحمٰن مونس اور خان عبدالرحمان خان رازی جیسے باذوق لوگ شامل تھے۔ ڈاکٹر قیصر عباس رضوی کے ہاں اس بزم کے عظیم الشان مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ بزم ارباب سخن لیہ کا مقصد ادب کو فروغ دینا تھا۔ نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور تعمیری ادب اور سوچ کو فروغ دینا تھا۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام لیہ کی سرزمین پر بہت بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوئے جن میں اردو، سرائیکی کے نامور شعراء کو مدعو کیا گیا اور اس بزم نے لیہ کی ادبی فضا میں دھوم مچا دی۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ جناب حسن رضا گردیزی کے جانے کے بعد یہ بزم اپنا دم توڑ گئی۔

۳۔ مجلس لیہ

اس بزم کی بنیاد ۱۹۵۴ء میں رکھی گئی۔ اس کے بانی جناب مرزا رفیق عنایت صاحب (ایس

ڈی۔ ایم) تھے جو کہ نہایت زندہ دل اور باذوق آدمی تھے۔ لیہ کی ادبی تاریخ میں اس انجمن کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ اس بزم کے زیر اہتمام آل پاکستان مشاعروں کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس بزم نے فروغ ادب کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ ''مجلس لیہ'' کے مشاعروں میں ملک کے نامور اور اردو کے قادر الکلام شعراء نے حصہ لیا۔ جن میں جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور مصطفیٰ زیدی وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ لیہ میں مصطفیٰ زیدی نے اپنی شریک حیات ''ویرا'' کے اعزاز میں ۱۹۵۸ء میں آل پاکستان مشاعرہ منعقد کرایا تھا۔

۴۔ قصر ادب لیہ

اس انجمن کی بنیاد ۱۹۵۲ء میں شاعر شباب حضرت نسیم لیہ نے رکھی۔ اس انجمن کے مقاصد میں عوام اور سرکاری حکام سے شعراء کرام اور ادباء عظام کے روابط قائم کرنا اور ان کی مالی امداد سے کتابیں شائع کروانا شامل تھے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام مشاعرے اور ادبی نشستیں بھی منعقد ہوتی رہی ہیں جو کہ تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ ملک کے نامور دانشور اور شعراء کرام حصہ لیتے تھے۔ اس تنظیم کو کئی شعراء کے مجموعہ کلام شائع کروانے کا شرف بھی حاصل ہے۔ الغرض تاریخ ادب لیہ میں قصر ادب کا ایک منفرد مقام ہے۔

۵۔ نیرنگ ادب لیہ

''نیرنگ ادب لیہ'' کی بنیاد ۱۹۶۰ء میں رکھی گئی۔ اس بزم کے بانی سید فضل حق رضوی تھے۔ جنہوں نے اس بزم کے زیر اہتمام کافی مشاعرے کرائے اور ادب کو ایک نیا شعور دیا۔ شاہ صاحب کے کلام پر مشتمل ایک کتاب ''دھوپ چھاؤں'' بھی شائع کی گئی ہے۔

۶۔ بزمِ تخلیق نو

بزم تخلیق نو ۱۹۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بانیان میں ڈاکٹر فیاض قادری اور شعیب جاذب ہیں۔ جبکہ پروفیسر تحسین فراقی، منظور حسین اختر اور شہباز نقوی اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اس بزم کا مقصد نئے لکھنے والے احباب کی کاوشوں کی پذیرائی کرنا اور نئی تخلیقات نظم ونثر کی اشاعت وترویج کا اہتمام کرنا تھا۔ اس بزم کے زیر اہتمام پاکستان کی سطح پر بڑے بڑے

مشاعرے منعقد ہوئے جس کے روح ورواں شعیب جاذب ہیں۔اس بزم کے تحت ۱۹۸۵ء میں
آل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت عبدالرؤف (اے۔سی لیہ) نے فرمائی۔مہمان
خصوصی بسمل صابری صاحبہ تھیں اور نظامت کے فرائض نسیم لیہ نے انجام دیئے۔ملک کے نامور
شعراء نے حصہ لیا جن میں جمیل جالبی، پروفیسر ساتی الحسینی' حافظ قمر لدھیانوی' کوثر حجازی' شاکر
نظامی' فراز صدیقی' ارشد ملتانی' حسین سحر' قمر صدیقی' وحشت انبالوی' وقار انبالوی' غلام محمد قاصر'
ابراہیم رسا پانی پتی' بیدل حیدری اور افضل جعفری کے اسمائے گرامی شامل ہیں ادب لیہ کے فروغ
کے سلسلہ میں ہر ماہ ۵ تاریخ کو شعیب جاذب مشاعرے کا اہتمام فرماتے تھے۔

۷۔بزم سرائیکی چمن

یہ بزم ۱۹۶۴ء میں قائم ہوئی ڈاکٹر مہر عبدالحق (پی۔ایچ۔ڈی) اس کے سرپرست اعلیٰ
مقرر ہوئے۔اس بزم کے مقاصد میں سرائیکی زبان وادب کی ترویج وترقی اور سرائیکی شعراء کی
حوصلہ افزائی' سرائیکی اصناف سخن لکھنے والے لکھاری حضرات کی تحریروں پر تحقیق وتبصرے اور
سرائیکی تحقیقی کام وغیرہ شامل تھا۔اس بزم کے زیراہتمام مشاعرے، مذاکرے اور سیمینارز منعقد
ہوتے رہے ہیں۔سرائیکی ادب کے فروغ کے لئے اس بزم کی خدمات نمایاں ہیں۔عہدیداران
میں نسیم لیہ، شعیب جاذب، میاں الٰہی بخش سرائی شامل ہیں۔

۸۔خیال اکیڈمی ضلع لیہ

یہ بزم ۱۹۷۴ء میں قائم کی گئی۔شاعر فکر وانقلاب ڈاکٹر خیال امروہوی اس کے بانی ہیں۔
اس اکیڈمی کے عہدیدار نہیں ہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو اس نہج یا ترقی پسندانہ سوچ رکھتے ہیں اس
کے ارکان میں شمار ہوتے ہیں۔یہ تنظیم ادب کو خالصتاً انقلابی سوچ اور ترقی پسند نظریات کے لئے
استعمال کرتی ہے۔اس بزم کے مقاصد میں ترقی پسندانہ سوچ کی ترویج اکیڈمی کے تعلیمی شعبے کی
تعمیر' بین الاقوامی ترقی پسند تحریکات اکیڈمی کی مختلف شاخیں ہیں جو کہ دوسرے شہروں میں ان
نظریات کی ترویج کے لئے شب وروز کوشاں ہیں۔اس اکیڈمی کے زیراہتمام ہر ماہ ۲ تاریخ کو
مذاکرے۔سیمینارز، اور مشاعرے منعقد ہوتے ہیں جن میں مقالات' مضامین اور غزلیات
پڑھے جاتے ہیں۔یہ اکیڈمی خیال صاحب کی زیرسرپرستی نئے ذہن وافکار پیدا کرنے میں شب و

روز مصروف کار ہے۔جدید سکالر اور اہل قلم پیدا کر رہی ہے اور پھر ان کی تخلیقات کو مختلف رسائل
کے ذریعے پورے ملک میں متعارف کرایا جاتا ہے۔اکیڈمی نے نئے لکھنے والوں کی سوچوں اور
تحریروں کو نئی روح اور نیا رخ دیا ہے۔اس اکیڈمی نے نئے لکھاریوں کی کاوشوں کو جلا بخشی ہے۔
ڈاکٹر خیال امروہوی جو کہ آج بھی اپنے نام کے ساتھ ''بوڑھے'' کا لفظ پسند نہیں کرتے فرماتے
ہیں ''میری سوچیں بلند وجوان ہیں۔میں بھی جوان ہوں''۔انہوں نے اپنے نظریات کا اثر بہت
سے لوگوں پر چھوڑا ہے جن میں گفتار خیالی' پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین، جسارت خیالی، ریاض راہی'
عابد منہاس اور آفتاب اعوان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

۹۔تھل ادبی اکادمی ضلع لیہ

یہ ادبی تنظیم یوں تو کافی عرصہ سے ادب کی آبیاری کا کام سرانجام دے رہی تھی، لیکن اس
کا باقاعدہ آغاز ۱۷ اپریل ۱۹۹۳ء کو ہوا۔اس تنظیم کے محرک فقیر میاں الٰہی بخش سرائی اور ان کے
بھتیجے میاں شمشاد حسین سرائی (راقم الحروف) ہیں جنھوں نے مسلسل تگ ودو کے بعد اس تنظیم کو
فعال بنایا۔اس تھل اکادمی کے مقاصد کا ذکر کچھ یوں ہے کہ نوجوان قلم کاروں کے لئے ادبی
ماحول پیدا کرنا، ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کی ترویج واشاعت کا اہتمام کرنا، ادبی تقاریب کا
انتظام کرنا، اہم قومی ومقامی مواقع پر مختلف ادبی مذاکرے' سیمینارز اور مشاعرے وغیرہ کا انعقاد
کرانا، ادیبوں اور دیگر اہل قلم حضرات میں اتحاد ویکجہتی کی فضا پیدا کرنا اور لیہ سے ایک ماہانہ ادبی
مجلہ کا اجراء کرنا وغیرہ۔

تھل ادبی اکادمی لیہ کے بانی عہدیداران میں چیئرمین اکادمی محمد عثمان خان' سرپرست اعلیٰ
' میاں الٰہی بخش سرائی۔صدر' میاں شمشاد حسین سرائی نائب صدر' اسحاق انجم مرحوم جنرل سیکرٹری
ذکی تنہا' جوائنٹ سیکرٹری جمشید ساحل' فنانس سیکرٹری ونشر واشاعت سہیل انجم خان ومیاں امداد
حسین سرائی آفس سیکرٹری سید کلیم شاہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔اس ادبی اکادمی کے زیر
اہتمام آل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جو کہ ضلع کونسل ہال میں مشہور دانشور وشاعر حضرت
سرور بدایونی مرحوم آف فیصل آباد کی زیرصدارت ہوا۔جس میں ملک بھر کے شہروں مثلاً
سرگودھا' ملتان' لاہور، فیصل آباد' بھکر' کروڑ' تونسہ' ڈیرہ غازیخان اور لیہ کے شعراء کرام نے

شرکت کی۔ تھل اکادمی کے زیر اہتمام ضلع لیہ کی سطح پر پہلی بار کسی تنقیدی و شعری نشست کی بنیاد ڈالی گئی اور ہر ماہ کی 7 تاریخ کو اکادمی کا اجلاس اور شعری نشست کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اکادمی مستقبل قریب میں نوجوان شعراء لیہ پر ایک کتاب ''نئی آوازیں'' مرتب کر رہی ہے۔

۱۰۔ بزم اخوت لیہ

یہ ''بزم اخوت لیہ'' ایک اصلاحی اور ادبی قسم کی بزم تھی' اس کے بانیان میں فقیر میاں الٰہی بخش سرائی' پروفیسر اکرم میرانی، پروفیسر نواز صدیقی اور محمد عثمان خان شامل ہیں۔ اس بزم کے مقاصد میں ادبی گروہ بندی کا خاتمہ خصوصاً اس وقت کے نسیم لیہ گروپ اور چوہدری نذیر گروپ میں باہمی اخوت پیدا کرنا، پیام محبت کو عام کرنا، تمام قلمکاروں کی تخلیقات کو شائع کرانا اور سرکاری فنڈز سے اہل قلم حضرات کی مالی اعانت کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس بزم کے عہدیداران میں بانی بزم فقیر میاں الٰہی بخش سرائی' سرپرست پروفیسر نواز صدیقی' صدر پروفیسر محمد اکرم میرانی' جنرل سیکرٹری' محمد عثمان خان، اعزازی فنانس سیکرٹری میاں الٰہی بخش سرائی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس بزم نے بڑے بڑے مشاعرے کرائے جن میں ملک بھر کے معروف شعراء نے شرکت کی۔ ماہانہ مشاعرہ عثمان خان کی جگہ پر منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس بزم نے فروغ ادب کے سلسلہ میں تاریخی کردار ادا کیا۔

۱۱۔ نادر سرائیکی سنگت لیہ

یہ بزم ۱۹۸۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی سرائیکی کے مشہور شاعر محمد صدیق نادر قیصرانی مرحوم ہیں اور صدر واصف حسین قریشی ہیں۔ اس بزم کا مقصد خالصتاً ادبی خدمات سرانجام دینا اور مظلوم عوام کی خدمت کرنا ہے۔ نادر سرائیکی سنگت نے لیہ کے سرائیکی ادب میں نمایاں تبدیلی دکھائی ہے۔ سرائیکی شعراء کی حوصلہ افزائی اور نئے لکھنے والے نوجوانوں کی راہنمائی و اصلاح سخن جیسے کام یہ ادبی سنگت ادا کر رہی ہے۔ لیہ میں ماہانہ مشاعرے کا انعقاد اور سرائیکی شعراء میں طرحی مشاعروں کا اہتمام بھی اسی سنگت کے نمایاں کاموں میں شامل ہے۔

۱۲۔ بزم اردو ضلع لیہ

بزم اردو لیہ ۱۷ مارچ ۱۹۸۴ء میں قائم ہوئی۔ ضلع لیہ کے معروف شاعر جناب الٰہی بخش اور

عدیم صراطی اس کے بانی ہیں' قومی زبان کے تحفظ اور تشخص کے لئے بے لوث خدمات دینا اور قومی زبان کی ترویج و احیاء کے لئے اس بزم کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے عہدیداران میں سرپرست اعلیٰ عدیم صراطی' صدر محمد عثمان خان' فنانس سیکرٹری میاں الٰہی بخش سرائی، جنرل سیکرٹری محمد اسحاق اسد مجلس عاملہ میں پروفیسر نواز صدیقی' عدیم صراطی' امان اللہ کاظم' کیف شکوری مرحوم' منظور سیال' سعید احمد باروی کے اسمائے گرامی شامل تھے۔ بزم نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۴ء کو تھل ہال لیہ میں پہلا عظیم الشان مشاعرہ کرایا۔ جس میں ملک بھر کے عظیم شعراء کرام نے شرکت کی۔ اسی بزم نے جولائی ۱۹۸۵ء میں نئی دنیا کے نام پر ایک ادبی رسالہ شائع کیا۔ الغرض' بزم اردو لیہ نے ادب کی ترقی و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۱۳۔ تھل دمان سرائیکی سنگت لیہ

اس سرائیکی سنگت کی بنیاد ۱۰ نومبر ۱۹۹۰ء میں رکھی گئی۔ تھل اور دمان دو ایسے علاقے ہیں جو تہذیبی' ثقافتی' معاشی' علمی' معاشرتی' ادبی' روایتی' رسم و رواج اور تجارتی لحاظ سے بڑے پختہ یعنی کہ نہ ٹوٹنے والے رشتوں میں باہم مربوط ہیں۔ چونکہ لیہ ان دونوں کے سنگم پر واقع ہے اس لئے تھل اور دمان کے لوگوں کا رشتہ ہر لحاظ سے عہد قدیم سے مستحکم ہے۔ ماضی بعید اور ماضی قریب میں تھل کے باسی دمان میں اجناس مثلاً جوار اور باجرہ لینے جاتے تھے جو کہ وہاں کا خاص غلہ ہے اور دمان کے باشندے تھل میں گنوار چنا اور گندم کی خرید کے لئے آتے جاتے تھے۔ اس طرح ان دونوں علاقوں کے باہمی رشتے جذباتی اور خونی رشتوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ یہ وہ عوامل تھے جنہیں بنیاد بنا کر تھل دمان سرائیکی سنگت لیہ کی بنیاد رکھی گئی سنگت کے بانیان میں ریاض قیصر قیصرانی' شفقت بزدار' امجد کلاچی' راول بلوچ' زرغام شاہ جی' شاکر حسین کاشف' مظہر حسین یاسر شامل ہیں سنگت کے موجودہ عہدیداران میں چیئرمین حمید الفت ملغانی' سرپرست اعلیٰ پروفیسر شفقت بزدار، صدر ریاض قیصر قیصرانی' نائب صدر امجد کلاچی جنرل سیکرٹری عبدالقدوس ساجد' پریس اینڈ فنانس سیکرٹری امین سہیل ملغانی (ابن ملغ بلوچ) رابطہ سیکرٹری منیر بلوچ اور چیئرمین ثقافتی کمیٹی یامین راول بلوچ ہیں۔ سنگت خالصتاً ادبی اور ثقافتی ہے' سرائیکی ادب و زبان اور ثقافت کی ترویج و اشاعت اور ترقی کا کام سرانجام دے رہی ہے۔ اس ادبی سنگت نے اب تک کتاب ''لوی سرت'' کے چار شمارے شائع کیئے ہیں جن میں خصوصی مزاحیہ نمبر ''بٹ کھڑاک

نمبر" ہے۔ اس کے علاوہ "گل گلانواں ریت دا"، از حمید الفت ملغانی، ریاض قیصر قیصرانی کا مجموعہ کلام "باکروال" شائع ہو چکے ہیں۔ ثقافتی حوالے سے تھل دمان سرائیکی سنگت نے فنکار راول بلوچ کی آواز میں کئی آڈیو کیسٹ بھی نکالے ہیں۔ ہر ماہ کی 25 تاریخ کو ماہانہ ادبی نشست منعقد کی جاتی ہے، اس کے علاوہ سالانہ مشاعرہ ہر سال دسمبر میں ہر عید الضحیٰ پر دامان میں بیٹ لدھا ٹبی قیصرانی تحصیل تونسہ شریف میں عید ملن مشاعرہ منعقد ہوا کرتا ہے۔ الغرض تھل دامان سرائیکی سنگت نے لیہ میں سرائیکی ادب کو تحریک عطا کی اور اس طرح لیہ میں علاقائی زبان سرائیکی کو کافی حد تک پذیرائی حاصل ہوئی۔ تھل دمان سرائیکی سنگت کے ادبی رسالہ کی وساطت سے پورے سرائیکی علاقے میں ضلع ڈیرہ غازیخان و ضلع لیہ کی ثقافت و ادب کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی اعزازی نشستوں میں سندھ کے پروفیسر لائق زرداری کے اعزاز میں منعقدہ نشست ناقابل فراموش تھی۔

۱۴۔ بزم اہل قلم لیہ

یہ بزم لیہ کے اہل قلم حضرات پر مشتمل ہے۔ جس کا مقصد لیہ کے ادباء معروف ادبی تنظیموں کے صدور کو ضلعی سطح پر نمائندگی دلوانا ہے تاکہ بیرون شہر اگر جانا ہو تو لیہ کے معروف اہل قلم کی نمائندہ تنظیم کے پلیٹ فارم سے شرکت کی جائے۔ اس کے نمایاں عہدیداران میں چیئرمین ڈاکٹر خیال امروہوی (صدر خیال اکیڈمی) سرپرست، فقیر میاں الٰہی بخش سرائی لیکھی، صدر میاں شمشاد حسین سرائی لیکھی (صدر تھل ادبی اکادمی)، نائب صدر حکیم عبدالقدوس ساجد (تھل دامان سرائیکی سنگت)، جنرل سیکرٹری سلیم اختر ندیم (صدر بزم علم وفن) آفس سیکرٹری میاں امداد حسین سرائی، سیکرٹری نشرواشاعت سید کلیم شاہ گیلانی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس بزم کے تحت ہر ماہ ۱۴ تاریخ کو ادبی نشست کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جنوبی پنجاب اہل قلم کانفرنس ملتان میں بھی اس کے عہدیدار شرکت کر چکے ہیں یہ بزم میاں شمشاد سرائی کی ادبی تحقیق پر مبنی F.M ریڈیو لیہ کے مقبول پروگرام، صدائے ریگزار، کو کتابی شکل میں مرتب کر رہی ہے۔

۱۵۔ لیہ ادبی ثقافتی سنگت لیہ

یہ سنگت لیہ کے شعراء اور گلوکاروں فنکاروں پر مشتمل سنگت ہے جس کے مقاصد میں لیہ

کے شعراء اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور ان کے فن کی پذیرائی کرنا ہے۔ سنگت کے نمایاں عہدیداران میں چیئرمین سلیم اختر جونی، صدر شاکر حسین کاشف، جنرل سیکرٹری مظہر یاسر، فنانس سیکرٹری عاقب حسین عاقب، آفس سیکرٹری عباس واصفی شامل ہیں۔ سنگت ہر ماہ کی ۹ تاریخ کو ماہانہ نشست کا اہتمام کرتی ہے اور کئی آل پاکستان سرائیکی مشاعرے کرا چکی ہے۔

۱۶۔ سانول سنگت لیہ

اس سنگت کی بنیاد حال ہی میں رکھی گئی ہے۔ اس سنگت کے بانی پاکستان کے مشہور لوک گلوکار جناب عطاء اللہ خان نیازی عیسیٰ خیلوی ہیں۔ یہ سنگت مکمل طور پر ثقافتی اور ادبی ہے۔ لیہ میں تنویر شاہد محمد زئی، اختر کاشف، واحد ربانی بھٹی، منیر گل...... ایسے نام ہیں جنھوں نے اس سرائیکی سنگت کی بنیاد رکھی ہے۔ جو کہ اس کے تحت مشاعرے اور ثقافتی شو کراتے رہتے ہیں۔ بہرحال "سانول سنگت" بھی ادب لیہ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

۱۷۔ باھو رحمۃ اللہ علیہ سرائیکی سنگت لیہ

اس سرائیکی سنگت کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن مختصر عرصہ میں اس کی ادبی و ثقافتی کارکردگی تسلی بخش ہے۔ باھو سرائیکی سنگت کی بنیاد فروری ۱۹۹۶ء میں رکھی گئی۔ اس کا نام پاکستان کے مشہور صوفی شاعر سلطان العارفین حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ کے اسم مبارک کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس سرائیکی سنگت کے مقاصد میں صوفی شعراء کے کلام کے ذریعے اصلاح معاشرہ، ظلم کے خلاف مسلسل جہاد اور نعرہ حق بلند کرنا، معاشرے میں نفرت کی بجائے محبت کے پیغام کو بڑھانا، سرائیکی زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے شب و روز محنت کرنا، پسماندہ لوگوں کے مسائل سرائیکی شاعری کی وساطت سے حکومت وقت کی سکرین پر لانا' کمزور ناتواں اور دکھی انسانوں کی خدمت کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا شامل ہیں۔ اس سرائیکی ادبی سنگت کے عہدیداران میں سرپرست اعلیٰ ڈاکٹر ملک محمد اسلم بھلر' چیئرمین اللہ بخش بھلر' وائس چیئرمین اختر حسین اختر' نائب صدر مظہر یاسر' جنرل سیکرٹری شاکر حسین کاشف' سیکرٹری نشرواشاعت ضرغام شاہ جی' رابطہ سیکرٹری حق نواز ساجد سواگی' فنانس سیکرٹری شیخ مختیار حسین مختیار کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ باھو سرائیکی ادبی سنگت ہر ماہ تین تاریخ کو ادبی نشست کراتی ہے۔ اس کے زیر

انتظام دو کتابچے شائع ہو چکے ہیں جن میں باھو سرائیکی سنگت دے چونٹرویں دوہڑے اور منظور بھٹہ دے چونٹرویں دوہڑے شامل ہیں۔ یہ سنگت سہ ماہی رسالہ شائع کرانے کی خواہش مند ہے۔ پچاس (50,000) ہزار الفاظ پر مشتمل ایک سرائیکی لغت زیر طباعت ہے، سنگت نے ماضی قریب میں آل پاکستان سرائیکی اردو پنجابی مشاعرہ منعقد کرایا تھا جس میں ملک بھر کے نامور شاعر، ادیب اور دانشوروں نے حصہ لیا۔

۱۸۔ تھل بیٹ سرائیکی ادبی سنگت جمن شاہ لیہ

یہ سرائیکی ادبی سنگت ادب میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کے بانی سرائیکی کے معروف شاعر امام بخش منصور ہیں جو کہ اس کے تحت مشاعرے اور ثقافتی شو کراتے رہتے ہے۔ لیہ کی ادبی تاریخ میں اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ماہ ادبی نشست کا اہتمام کرتے ہیں۔ دیہات میں یہ سنگت کافی مقبول ہے۔

۱۹۔ بزمِ شعورِ نو

نوجوان شعراء اور لکھنے والوں پر مشتمل یہ بزم جس کی بنیاد پروفیسر افتخار بیگ صاحب نے کچھ عرصہ قبل رکھی تھی، بڑی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ اس بزم کے مقاصد میں نوجوان نسل کی تخلیقات کو منظر عام پر لانا، ان کی پذیرائی، فکر اور شعور کی باہمی کاوش سے ادب کو نیا لباس عطا کرنا، مروجہ قدیم ڈگر سے ہٹ کر جدید اور نئے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ادب تخلیق کرنا شامل ہیں۔ اس بزم میں پروفیسر افتخار بیگ، سلیم گرمانی، احسن بٹ، امجد کلاچی، ذکی تنہا، مبشر بیگ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے کوئی بڑا مشاعرہ یا فنکشن تو نہیں کرایا البتہ گاہے بگاہے ادبی نشستوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

۲۰۔ قلم قبیلہ (لیہ شاخ)

بیگم ثاقبہ رحیم الدین کوئٹہ اس بزم کی بانی ہیں۔ لیہ شاخ میں چیئرمین شعیب جاذب اور جنرل سیکرٹری سلیم اختر ندیم ہیں جو ہر ماہ 15 تاریخ کو ادبی نشست کرا کے لیہ کے ادب میں نئی روح پھونکتے ہیں۔ یہ ادبی شاخ بھی فروغ ادب و زبان میں نمایاں کام سرانجام دے رہی ہے۔

اسی شاخ کے زیر اہتمام مشاعروں کی رپورٹیں قومی پریس کے ذریعے پاکستان بھر میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

۲۱۔ بزمِ علم و فن (لیہ شاخ)

بزم علم و فن اسلام آباد کے بانی معروف قلمکار واسطی ہیں۔ یہاں لیہ شاخ میں صدر سلیم اختر ندیم، جنرل سیکرٹری شعیب جاذب ہیں جو کہ ہر ماہ ادبی نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح بیسیوں تنظیمیں ہیں جو ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں مثلاً بزمِ لطیف فتح پور، جعفر اکیڈیمی جمن شاہ، بزمِ شفق شاہ پور، بزمِ مشتاقان ادب وغیرہ جو دن رات ادبی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

۲۲۔ لیہ ادبی فورم لیہ

لیہ کی نمائندہ ادبی اور علمی تنظیم ہے۔ اس کا قیام ۲۰۰۴ء میں عمل میں آیا اس تنظیم کے بانی صدر ڈاکٹر مزمل حسین ہیں جبکہ جنرل سیکرٹری حمید الفت ملغانی ہیں۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد لیہ میں علم و ادب کی ترویج و فروغ ہے اس تنظیم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے ارکان میں لیہ کے تمام اہم شعراء ادبا اور دانشور شامل ہیں۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام کئی تقریبات اور مشاعرے ہو چکے ہیں جن میں جون ۲۰۰۷ء کو ڈاکٹر فیاض قادری ادبی کانفرنس اور کل پاکستان مشاعرہ قابل ذکر ہے۔

لیّہ کا سرائیکی ادبی منظر نامہ

حمید اُلفت ملغانی

ادبی مراکز سے پرے ہونے کے باوجود ادبی دنیا میں لیہ کی منفرد پہچان ہے۔ سرائیکی ادب کے حوالہ سے لیہ کے لیے یہ اعزاز بھی کم نہیں ہے کہ حکومت پاکستان کے اعلیٰ اعزاز ''تمغہ حسن کارکردگی'' حاصل کرنے والے سرائیکی زبان کے معروف محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اسی شہر میں آنکھ کھولی۔ اُردو اور سرائیکی زبان کے معروف شاعر نسیم لیہ نے اپنے نام کے ساتھ اپنے شہر کا نام بھی روشن کیا ہے۔ حکیم الٰہی بخش سرائی، پروفیسر نواز صدیقی، پروفیسر اکرم میرانی، اشولال، پروفیسر مہر اختر وہاب، برکت اعوان، ڈاکٹر مزمل حسین، مظہر نواز لاشاری، ملک مشتاق احمد سامیٹہ، ڈاکٹر جاوید اقبال کنجال، ڈاکٹر گل عباس اعوان اور منور اقبال بلوچ جیسے احباب کے نام سرائیکی ادب کی سرپرستی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے حوالہ سے سرائیکی زبان و ادب کی آبیاری کرنے والوں میں ملک عزیز الرحمان اولکھ (موجودہ اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان ڈیرہ اسماعیل خان) خورشید احمد ملک (موجودہ اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان ملتان) اور آصف خان کھتران (موجودہ پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان لورالائی) کا تعلق بھی لیہ ہی سے ہے۔ علاوہ ازیں ڈھیروں اہلِ قلم سرائیکی ادب کے فروغ میں اہم کردار کے حامل ہیں۔ تفصیل کے لیے الگ الگ موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔

دینی ادب

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے قرآن حکیم کا سرائیکی ترجمہ شائع کرانے کے علاوہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر بعنوان ''الحمدللہ'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے نیز ''کونین دا والیؐ'' کے عنوان سے ڈاکٹر

مہر عبدالحق کی سیرت النبیؐ کے سلسلہ کی کتاب بھی دینی ادب میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ ادبی سلسلہ کے طور پر منفرد لہجہ کے شاعر نسیم لیہ کی خدمات کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ شہادتِ حضرت امام حسینؓ کے واقعات کو نسیم لیہ نے ''وکھرے ڈکھ حسینؓ دے'' کے عنوان سے منظوم خراج عقیدت کے طور پر کتابی شکل میں پیش کیا ہے جس میں قافلہ حسینؓ کے حوالہ سے ۲۷ دوہڑے شامل کیے گئے۔ غلام حیدر فدا، ذاکر حسین ذاکر، امام علی شاہ شفیق، مرید حسین راز، شعیب جاذب، فیض سندھڑ اور سلیم اختر ندیم کا نام بھی مذہبی شاعری کے حوالہ سے جانا جاتا ہے۔ فیض سندھڑ کے درجنوں کتابچے بسلسلہ نعت و منقبت شائع ہو چکے ہیں۔ حمید اُلفت ملغانی (راقم) کی نعتیہ کاوش ''میم دے اولے'' میں اسما النبیؐ کو منظوم طور پر پیش کیا گیا ہے۔

شاعری

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اُس میں شاعری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ لیہ کی سرائیکی شاعری میں روایتی اور جدید شاعری کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق کی گئی جدید شاعری میں منفرد مقام رکھنے والے شاعر اشولال فقیر کی کتابیں ''چھیڑو ہتھ نہ مرلی''، ''گوتم نال جھیڑا'' اور ''کاں وسوں دا پکھی اے'' اور ''ہندو ساگر نال ہمیشاں'' داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اسی طرح شفقت بزدار کی کتابیں ''گریہہ دا قرض''، ''نکھیڑے'' اور ''ریشم رستے'' بھی عہدِ حاضر کی نمائندہ کتب ہیں جنہیں خواص کے ساتھ ساتھ عوام کی پذیرائی بھی حاصل ہے۔ فتح پور سے تعلق رکھنے والے سلمان سہو کی کتاب ''کُن توں پہلے'' اور مجید اعوان کی کتاب ''انہد'' میں تصوف کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتاب ''لاٹریاں'' میں تھل کی ثقافت کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ امان اللہ کاظم کا شعری مجموعہ ''پپلیں ہنجھ نہ ماوے'' سرائیکی غزل اور سندھی شاعری کی صنف وائی کی نمائندگی کرتا ہے۔ واصف قریشی کے روایتی شعری مجموعے ''گاج'' اور ''ہجر فراق دا بھوگ''، رفیق ہمراز سنجرانی کی شعری تصانیف ''سوچ سولی'' اور ''خواب کنوارے''، ریاض قیصر قیصرانی کی کتاب ''باکروال'' اور فیض سندھڑ کے بیسیوں شعری کتابچے لیہ کے سرائیکی شعری منظر نامہ کے عکاس ہیں۔ محمد اشرف درپن کی کتاب ''درپن'' اور محمد اسلم کنجال کی کتاب ''ورثہ'' میں اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ سرائیکی حصہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ حمید اُلفت ملغانی (راقم) کے

شعری مجموعہ ''سک سوجھل'' میں سرائیکی غزل اور آزاد نظم کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سرائیکی کے اہم شعراء نسیم لیہ، نادر قیصرانی اور کیف شکوری کے مسودہ جات اُن کی وفات کے باعث اشاعت کے مراحل طے نہ کر سکے۔

شعیب جاذب، منظور بھٹہ، مظہر حسین یاسر، موسیٰ کلیم، اظہر زیدی، شاکر حسین کاشف، سلیم اختر ندیم، شوکت علی شائق، منشی منظور، جمعہ خان عاصی، امام بخش منصور، ساجد سواگی، شمشاد سرائی، عبدالقدوس ساجد، اقبال نسیم صحرائی اور صابر عطاء جیسے شعراء کے شعری مجموعے چھپ جانے چاہئیں۔ بہر حال ان میں سے کچھ مجموعہ جات جلد شائع ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر افتخار بیگ، کاشف مجید، ڈاکٹر مزمل حسین، رفیق خاور تھلوچی، جسارت خیالی، سلیم گورمانی، طاہر مسعود مہار، محمد عثمان خان، شہباز نقوی اور ریاض حسین راہی جیسے متعدد شعراء اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ سرائیکی شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔

مشتاق ثمر، امام بخش اَسیر، نذیر عنبر، محمد حسین قنبر، محمد بخش راقم، عارف دستی، امین سہیل ملغانی، صادق حسنی، ثقلین نجمی، انجم بلوچ، منظور حسین شاکر، سجاد حسین شاہ صابر، غلام عباس واصفی، سونا خان بلوچ، راول بلوچ، یونس بُزدار، مبین سمل، امجد کلاچی، عظیم تائب اور دیگر کئی شعراء سرائیکی شاعری میں اپنا حصہ شامل کر رہے ہیں۔

سرائیکی شاعرات میں سے فرح تحسین بخاری اور بانو بلوچ کے نام سرائیکی شاعری کی نمائندگی کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ فرح تحسین بخاری کی غزل اور بانو بلوچ کی مزاحیہ نظمیں خاص طور پر معروف ہیں۔ بانو بلوچ کی مرتبہ کتاب ''ملوکھ ہتھاں دا پورھیا'' ترتیب کے مراحل میں ہے، جس میں سرائیکی شاعرات کا منتخب کلام شامل ہے۔

لسانیات

ماہر لسانیات ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتابیں سرائیکی زبان کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُن کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق'' ۱۹۶۷ء میں اُردو اکادمی بہاولپور سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتب میں ''سرائیکی اور اُس کی ہمسایہ علاقائی زبانیں''، ''سرائیکی دے قاعدے قانون'' اور ''سرائیکی دیاں مزید لسانی تحقیقاں'' سرائیکی لسانیات کی بنیادی کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔ امان اللہ کاظم کی کتاب ''کن بُر'' میں سرائیکی ضرب الامثال اور

اُن کی اُردو شرح پیش کی گئی ہے نیز وہ ''سرائیکی لغت'' کے سلسلہ میں بھی کام کر رہے ہیں۔ منظور بھٹہ کے مرتب کردہ ''سرائیکی اکھان''، منور اقبال بلوچ کی تحریر ''کچھ سرائیکی اصطلاحات'' اور پروفیسر نواز صدیقی کی تحریر ''شاعری وچ ماں بولی دی اہمیت'' لیہ سے شائع ہونے والے کتابی سلسلہ ''سُرت'' میں شامل اشاعت رہی ہیں۔

فریدیات

لسانیات کی طرح فریدیات بھی ڈاکٹر مہر عبدالحق کا خاص موضوع رہا ہے۔ اُنہوں نے ''پیامِ فرید'' میں خواجہ غلام فرید کی کافیوں کو موضوع کی مناسبت سے ترتیب دے کر پیش کیا۔ اس طرح کا کام فریدیات میں پہلی بار ہوا ہے کیونکہ اس سے قبل شائع ہونے والے مجموعہ جات کو ردیف کی ترتیب سے سامنے لایا گیا۔ ''لغاتِ فریدی'' کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کی کافیوں میں شامل الفاظ کے معنی پیش کیے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی معروف کتاب ''فردِ فرید'' میں فریدیات کے حوالہ سے مختلف مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح انگریزی زبان میں پیش کی جانے والی کتاب The Vision of Khawja Farid میں بھی ڈاکٹر مہر عبدالحق نے خواجہ فرید کے فکر و فن کے متعلق مضامین پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ فریدیات کے موضوع پر حمید اُلفت ملغانی (راقم) کتاب ''سلک سلوک فریدی'' میں اہم لکھاریوں کے مضامین ترتیب دیے گئے ہیں۔

تحقیق و تنقید

حضرت حافظ جمال ملتانی کے متعلق سرائیکی میں لکھی گئی ڈاکٹر مہر عبدالحق کی تحقیقی کتاب ''نورِ جمال'' میں حافظ جمال کے حالات زندگی کے علاوہ اُن کی شعری تصنیف ''چرخہ نامہ'' کو بھی تلاش و جستجو کے بعد شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مزمل حسین کی کتاب ''فن بلاغت تے سرائیکی شاعری'' کی طباعت سرائیکی ریسرچ سنٹر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان نے کی ہے جو اپنے موضوع کے حوالہ سے انفرادیت کی حامل ہے۔ قبل ازیں اُن کی دو کتب ''نئے زاویے'' اور ''لطافت اسلوب'' میں اُردو ادب کے ساتھ ساتھ سرائیکی ادب کے حوالہ سے تنقیدی و تحقیقی تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

جعفر بلوچ کی کتاب ''آیات ادب'' میں لیہ اور مظفر گڑھ کے شعراء کے تذکرہ میں سرائیکی شعراء کے احوال بھی شامل ہیں۔

حمید اُلفت ملغانی (راقم) کی کتابوں میں ''لکھت تے لکھاری'' اور ''پاکستانی زبانوں کا ادب''، تحقیق وتنقید کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی جانب سے شائع ہونے والی ''لکھت تے لکھاری'' میں سرائیکی ادب اور ادباء کے حوالہ سے اور ''جانباز جنید اناں ہے'' میں جانباز جتوئی کی شخصیت اور فن کے متعلق تحقیقی وتنقیدی مواد پایا جاتا ہے جبکہ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب ''جانباز جتوئی: شخصیت اور فن'' پاکستانی ادب کے معمار کے حوالہ سے شروع کیے گئے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ بیکن بکس لاہور نے ''پاکستانی زبانوں کا ادب'' کو خوبصورتی سے شائع کیا ہے جس میں پاکستانی زبانوں میں سے براہوی، بلوچی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، سندھی اور شمالی علاقہ جات کی زبانوں کے ادب کے بارے میں تجزیہ شامل ہے۔ علاوہ ازیں سرائیکی ادب کے سالانہ جائزہ کے سلسلہ میں حمید اُلفت ملغانی کی تحریریں ۱۹۹۳ء سے اب تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ جائزہ اخبارات میں شائع ہونے کے ساتھ ساتھ کتابی شکل میں بھی ہر سال سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی اشاعت کے طور پر سامنے آتا رہا۔ کتابی شکل میں شائع ہونے والے جائزوں کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔ سرائیکی ادبی ٹور ۱۹۹۳ء، سرائیکی ادبی پندھ ۱۹۹۴ء، سرائیکی ادبی رُت ۱۹۹۵ء، سرائیکی ادبی سمل ۱۹۹۶ء سرائیکی ادبی وگ ۱۹۹۷ء، سرائیکی ادبی چنگ ۱۹۹۸ء، سرائیکی ادبی اُڈار ۱۹۹۹ء، سرائیکی ادبی جھات ۲۰۰۰ء، سرائیکی ادبی سونہہ ۲۰۰۱ء، سرائیکی ادبی نجوک ۲۰۰۲ء، سرائیکی ادبی پورھیا ۲۰۰۳ء، سرائیکی ادبی وونت ۲۰۰۴ء، سرائیکی ادبی راند ۲۰۰۵ء سرائیکی ادبی بار ۲۰۰۶ء، سرائیکی ادبی سرت ۲۰۰۷ء۔

تاریخ وثقافت

سرائیکی ادبی سلسلہ میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی پہلی کتاب ''سرائیکی لوک گیت'' ہے۔ بزم ثقافت ملتان سے شائع ہونے والی اس کتاب کو لوک ادب کے موضوع پر ابتدائی کاوش کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے ''ملتان'' کے عنوان سے ملتان کی تاریخ وثقافت اور ''تھل'' کے عنوان سے تھل کے تہذیبی خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیکن بکس ملتان سے شائع ہونے

والی ڈاکٹر مہر عبدالحق کی کتب The Soomras، اور ''ملتان کے بادشاہ، گورنر اور حملہ آور'' بھی سرائیکی وسیب کی تاریخی وتہذیبی روایات کی علمبردار ہیں۔

پروفیسر اکرم میرانی نے تاریخ وثقافت کے موضوع پر خاصا کام کیا ہے۔ اس حوالہ سے اُن کی کتب ''سرائیکی ڈیس''، ''تھل اج تے کل''، ''گریٹر تھل''، ''ملتان کے بالمیکی'' اور ''لیہ کی ہندو برادری'' ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ مزمل حسین اور اکرم میرانی کے اشتراک سے مرتب ہونے والی فدا حسین گاڈی کی کتاب ''سرائیکی کلچر'' میں سرائیکی ثقافت کو اجاگر کرنے والی تحریریں شامل ہیں۔

سرائیکی تاریخ وثقافت کے سلسلہ میں برکت اعوان کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیہ کی ادبی دنیا میں برکت اعوان کی اس موضوع کی کتاب کا شدت سے انتظار ہے۔ لیہ کی تاریخ کے سلسلہ میں مہر نور محمد تھند کی کتاب ''تاریخ لیہ'' اور خدا بخش ناصر کی کتب ''انسائیکلوپیڈیا آف لیہ'' اور ''لیہ دی تاریخ'' میں جہاں لیہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے وہاں لیہ میں سرائیکی ادب کے فروغ کے سلسلہ میں بھی معلومات پائی جاتی ہیں۔ مہر نور محمد تھند نے ''اولیائے لیہ'' اور ''اولیائے بھکر'' کے عنوانات سے بھی کتابیں چھپوائی ہیں۔ جن سے تھل کی مذہبی روایات اجاگر ہوئی ہیں۔

سرائیکی تہذیب وثقافت کے متعلق لکھی جانے والی ڈاکٹر گل عباس اعوان کی کتاب ''سرائیکی ثقافت دے رنگ'' چھپ کر سامنے آچکی ہے۔ حمید اُلفت ملغانی کی کتاب ''دھرتی قائد محابیو'' تاریخ پاکستان اور قائداعظم کے حوالہ سے ہے۔ جبکہ ''سرائیکی لوک ریت'' سرائیکی وسیب میں پائی جانے والی رسومات کی ترجمانی کرتی ہے۔

سفرنامہ

مزار خان (مظہر نواز لاشاری) نے بھارت کا سفرنامہ ''لکھ دی کہانی'' کے عنوان سے پیش کیا ہے جس میں دلی میں گزارے گئے دو دنوں کے احوال کو سیاق وسباق سے پیش کیا گیا ہے۔ حمید اُلفت ملغانی کا سفرنامہ ''پاندھی پچھاں واتیں تکاں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جس میں سرائیکی وسیب کے سفر کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

تراجم

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے قصیدہ بُردہ کا ترجمہ سرائیکی کے علاوہ اُردو، انگریزی اور فارسی میں کیا۔

رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ ''مئے گلفام'' اور علامہ اقبال کی کتاب ''جاوید نامہ'' کا اُسی بحر میں کیا گیا منظوم سرائیکی ترجمہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کی زبردست کاوش ہے۔

نسیم لیہ نے علامہ اقبال کی کتاب بال جبریل سے غزلیات کے انتخاب کا منظوم سرائیکی ترجمہ بعنوان ''بال جبریل'' کتابی شکل میں پیش کیا جسے وسیب میں خوب سراہا گیا۔

حمید اُلفت ملغانی کی ترجمہ کے سلسلہ کی دو کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب ''گل گلانواں ریت دا'' ممتاز مفتی کے اُردو ڈرامہ کا سرائیکی ترجمہ ہے جبکہ دوسری کتاب ''نازو'' ظفر لاشاری کے تحریر کردہ اولین سرائیکی ناول کا اُردو ترجمہ ہے جسے اکادمی ادبیات پاکستان کی اشاعت کے طور پر پیش کیا گیا۔

بچوں کا ادب

بانو بلوچ نے سرائیکی میں بچوں کے ادب کے متعلق کتابچے مرتب کیے ہیں۔ جن میں پہیلیوں پر مشتمل کتابچہ ''بجھ میڈی بجھارت'' اور لطائف کے چار مجموعے بعنوان ''مٹھڑی مُسکار''، ''گھوٹ کنوار دے لطیفے''، ''نرساں دے لطیفے'' اور ''ڈاکٹراں دے لطیفے'' شامل ہیں۔ یہ کتابچے سلیمان برادرز ملتان کی اشاعت کے طور پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

کتابی سلسلے

لیہ میں متعدد کتابی سلسلے شروع ہوئے جن میں سے اُردو اور سرائیکی ادب پر مشتمل جسارت خیالی کا مرتبہ ''نیا قدم'' پہاڑ پور سے تسلسل سے جاری ہے۔ تھل دمان سرائیکی سنگت لیہ کا سرائیکی کتابی سلسلہ ''نُسرت'' کا طنز و مزاح نمبر اور تین دیگر شمارے ابن ملغ بلوچ (امین سہیل ملغانی) نے ترتیب دیئے تھے۔ طاہر مسعود مہار نے ''غزل'' کے عنوان سے خوبصورت شمارہ کوٹ سلطان سے شائع کیا جس میں اُردو کے علاوہ سرائیکی مواد بھی شامل تھا۔ کروڑ سے اشولال نے ''بیڑی'' کے عنوان سے کتابی سلسلے کا کہانی نمبر شائع کیا۔ ''کتاب''، ''بصارتیں'' اور ''پیام ادب'' کے عنوانات سے شائع ہونے والے کتابی سلسلے بھی سرائیکی ادب کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر خیال امروہوی...... تھل کا مفکر شاعر

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

دور افتادہ صحرائی علاقوں کی خاک بسری کرنے والا سخن ور، لیہ کے ریگزاروں میں رہنے والا سکالر ڈاکٹر خیال امروہوی ایک معروف شاعر بھی ہے اور کہنہ مشق نقاد بھی۔ خطہ سرائیکی میں واقع لیہ کا جل تھل راجہ محمد عبداللہ نیاز، کشفی ملتانی، غافل کرنالی اور حضرت نسیم لیہ جیسے خوش فکر شعراء کی جولاں گاہ رہا ہے۔ ادب اور شعر کے میدان میں ڈاکٹر خیال امروہوی ایک قد آور شخصیت نظر آتی ہے۔ تھل کا یہ مفکر شاعر نہ صرف اپنے دیس میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر امن و آشتی کا داعی اور متمنی ہے۔ بے ضمیر لوگوں، منافق لیڈروں، لٹیروں، رہزنوں اور اونچے اونچے ڈیروں میں رہنے والے وڈیروں سے ایک چٹان بن کر ٹکراتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخ اسلام کے ایک سکالر کی حیثیت سے وہ امام حسینؓ جیسے شہیدان رنگین قبا کو حق گوئی کا پیکر اور آئیڈیل سمجھتا ہے۔ وہ تھل کی تیز و تند ہواؤں کی طرح آزاد نظر آتا ہے اور آزادی رائے کو ہر اہل قلم کا بنیادی اور فطری حق سمجھتا ہے۔ وہ جرات اور ایثار کا داعی ہے اور انقلاب آفرین افکار کا حامل ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرتا ہے اور ان لوگوں سے بھی پیار کرتا ہے جو تھل کے ٹیلوں اور ان دھندلے رہن بسیروں اور جھوکوں میں رہتے ہیں۔ شعری و فکری تشخص، بلند آہنگ اسلوب، سنجیدہ فکر اور حق گوئی ان کے کلام کی خوبیاں ہیں۔ زندگی کے دلخراش واقعات ڈاکٹر خیال امروہوی کے کلام میں جگہ جگہ منعکس نظر آتے ہیں۔ ان کے افکار کی ترجمانی حضرت نسیم لیہ کے ان اشعار میں ملتی ہے:

ہم نے ہر دور میں اصنام تراشے ہیں نسیم

ہم نے ہر دور میں پتھر کو خدا سمجھا ہے

ڈاکٹر خیال امروہوی بڑے قلندرانہ انداز میں معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر کرتے ہیں۔آپ کے الفاظ جچے تلے ہوتے ہیں۔افکار کے لحاظ سے آپ ایک انقلاب پسند شاعر نظر آتے ہیں۔آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خنکیِ اخگرِ چقماق کا رونا کیسا

رغبتِ سوز ہی کب ہیزمِ نمناک میں تھا

جعفر بلوچ اپنی کتاب ''آیات ادب'' مطبوعہ مکتبہ عالیہ۔لاہور (1988ء) کے صفحہ نمبر 189 پر رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر خیال امروہوی کی قوس فکر وشعور میں متذکرہ رنگوں کے علاوہ کچھ اور بھی رنگ ہیں مثلاً ان کی زوردارانا کی کرشمہ کاریوں اور مسلسل غزل کی رشتہ بافیوں نے ان کے کلام میں طرح طرح کے جادو جگائے ہیں۔ان کے فکری نظام کے پس آہنگ میں تشکیک وارتیاب کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں۔اپنے موقف کے دھاگوں کو کبھی ادھیڑتے ہیں کبھی سیتے ہیں۔کبھی صفِ تسلیم ورضا میں نظر آتے ہیں کبھی انکار کی چھان پر چڑھ جاتے ہیں۔ان کے جہاد فکر میں پیش قدمی اور مراجعت ملے جلے نظر آتے ہیں۔''

صحرا کے خار مغیلاں چبھتے ہیں تو آپ چلا اٹھتے ہیں۔آپ کے کلام میں اسی بے زاری اور درد کی عکاسی ہے:

گل کدہ تمثال تھا وقتِ سفر صحنِ چمن

لوٹ کر آیا تو صحرا کے سوا کچھ بھی نہ تھا

مظفر گڑھ کے شاعر بیاض سونی پتی نے کہا تھا:

آؤ ان کانٹوں سے کرتے ہیں بہاریں پیدا

پھول تو اپنے مقدر میں نہیں ہیں یارو

ڈاکٹر خیال امروہوی 1930ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے 1947ء میں بی اے اور 1949 میں ایم اے کیا۔آپ 1955ء میں پاکستان پہنچے۔لاہور قیام کے دوران روح العین یزدک سے کسب فیض کیا۔

1964ء میں آپ نے ہڑتال کی۔چنانچہ آپ کو لیکچرر شپ ملی۔شکر گڑھ، ملتان اور لیہ کے کالجوں میں پڑھاتے رہے۔1969ء میں آرسی ڈی کے زیر اہتمام تہران گئے اور تہران میں آپ کا یہ مقالہ ایران سے چھپ چکا ہے۔1976ء میں آپ کو این ڈی وی پی کے تحت دوبارہ فارسی کی لیکچرر شپ ملی۔عرصہ دراز تک گورنمنٹ کالج لیہ پڑھاتے رہے۔آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔آپ کی تصانیف کی تعداد کافی ہے۔چند ایک حسب ذیل ہیں:

(i) عقائدِ مزدک (مقالہ ڈاکٹریٹ)

(ii) مقتلِ جان

(iii) گنبدِ بے در

(iv) لمحوں کی آنچ

(v) عصرِ بے چہرہ

(vi) نئے افق نئی کرنیں (یہ آپ کے شعری مجموعوں کا انتخاب ہے)

(vii) ملوکیت شکن (کربلا کے حوالے سے)

(viii) حضرت علیؓ کا طرز حکومت

میری ڈاکٹر خیال امروہوی سے پہلی ملاقات 1979ء میں ہوئی جب میری تعیناتی لیہ میں ہوئی۔لیہ کے جل تھل میں ایک مفکر سے مل کر بڑا جی خوش ہوا۔آپ کو نہ صرف فارسی کا کہنہ مشق استاد پایا بلکہ ایک قادر الکلام شاعر محقق اور ادیب بھی۔آپ لیہ کے ادیبوں اور شاعروں میں ممتاز ہیں۔آپ کو میں نے اکثر لیہ کے مشاعروں میں بلایا تو آپ بڑے شوق سے تشریف لائے۔آپ کو خلیق اور حلیم الطبع بھی پایا۔ظاہر ہے درخت پر جتنا پھل لگتا ہے وہ درخت اتنا زیادہ جھکتا ہے۔ایک بلند پایہ سکالر کی حیثیت سے آپ کو میں نے ہمیشہ سنجیدہ اور پروقار پایا۔

آپ انسان سے بیزار نظر آتے ہیں۔بعض جگہ اسے عقرب کہا تو بعض جگہ سفاک اور بعض جگہ نہنگ ناخن دراز کہا۔اس میں حقیقت بھی ہے۔انسان جب پستیوں پر اتر آتا ہے تو

اسفل السافلین بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مری بصیرت کا تجزیہ بھی عجیب زہرہ گداز نکلا
جسے میں انساں سمجھ رہا تھا نہنگ ناخن دراز نکلا
شعاعِ مہرِ زوال اوچھے افق سے یوں بے لگام پھوٹی
کہ میری بالا قدی کی نسبت سے میرا سایہ دراز نکلا
علامتوں سے جمالِ فن نے تو بے تحاشا فروغ پایا
مگر یہ لفظوں کا شعبدہ بھی اسیرِ ذوقِ مجاز نکلا

مذہب کے بارے میں بعض دفعہ اُن لوگوں کا شکوہ کرتے ہیں جو کردار سے عاری ہیں اور جنہوں نے منافقت کے خول چہروں پر چڑھائے ہوتے ہیں۔ یزداں کے بارے ان کا یہ عقیدہ کہ وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اپنی جگہ درست ہے لیکن اس کے ساتھ تسخیر کائنات کا عمل قابل داد ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس پر بھی معترض ہیں:

لوگ مریخ میں کرتے ہیں خدا کی تحقیق
وہ تو شہ رگ سے بھی نزدیک رہا کرتا ہے
ریگِ اوہام سے دیوار بنانے والو!
سیلِ حالات کہیں ایسے رکا کرتا ہے؟

''ریگِ اوہام سے دیوار بنانا'' بہت خوبصورت تشبیہ ہے۔

آپ اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہیں جو استحصالی ہو۔ جہاں نہ انصاف ہو اور نہ ہی عادلانہ تقسیم۔ آپ کا یہ جذبہ انقلاب آپ کے اشعار سے عیاں ہے۔ معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف آپ آوازِ حق اٹھاتے ہیں:

جوازِ فاقہ کشی بھی تو کچھ مدلل ہو
خدا کے قبضہ میں آب و دانہ سہی
برہنہ تیغ کمر میں رہے تو بہتر ہے

مصالحت میں بھی طرز مدافعانہ سہی

آپ کائنات کے نظام میں بھی ایک مفکر کی طرح تدبر کرتے ہیں اور سامعین کو بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں:

ہر سامعین میری بات غور سے سنے
کائنات کی ہر شے عجائب و غرائب ہے

بعض دفعہ آپ کی تشبیہات نادر ہوتی ہیں۔ مثلاً ایسی تشبیہات کا استعمال دیگر شعراء کے ہاں کم ہے:

چراغِ مہرِ تفکر کی تابناکی میں
ترے تصورِ باطل کا کیا دیا جلتا

آپ معاشرتی اور سماجی برائیوں پر بھی تنقید کرتے ہیں اور قوم کی زبوں حالی کا بھی رونا روتے ہیں۔ پاکستان کی طرح پسماندہ ممالک اپنے لئے معاشی مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اس صورت حال کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

مخلوق نے تو اپنے غموں کی دھائی دی
لیکن امیر شہر کو سازش دکھائی دی
تم نے درآمداتِ تعیش میں کھو دیا
بدحال قوم نے تو تمہیں پائی پائی دی

ترقی یافتہ ممالک نے ستاروں پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں۔ چاند، زحل، مریخ اور مشتری کی طرف رخ کیا۔ اربوں ڈالر تسخیر کائنات میں صرف کر ڈالے جبکہ اہل زمین ان گنت مسائل سے نبرد آزما ہیں مثلاً افریقہ میں فاقہ کشی زوروں پر ہے۔ یہ مسائل انسان کو دعوت فکر دیتے ہیں:

بساطِ عیش زحل پر تو لے گیا انسان
زمین پہ نسل کو اپنی اداس چھوڑ گیا

جعفر بلوچ......صحرا کا پھول

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

صحراؤں میں پھول کھلتے ہیں، اُودے اُودے پھول' نیلے نیلے پھول' کرمچی رنگوں کے پھول۔ وہ پھول اپنی خوشبوئیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ افسوس! ان پھولوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ تھل میں پھولوں کے رنگین خیام کتنے حسین ہوتے ہیں۔ ایسے صدہا گل ہائے رنگین اپنا حسن دکھا دکھا کر پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح صحراؤں میں واقع کئی کچے گھروں کے طاقوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں۔ صحرا کے ایسے چراغ خاموش جھلملاتے رہتے ہیں۔ چند تھکے ہارے مسافر ہی ان کی ضو میں چند قدم چلتے ہیں۔

لیہ کے وسیع و عریض صحرا میں جعفر بلوچ وہ لالہ صحرائی ہے جو ہر سو شعر و ادب کی خوشبو بکھیر رہا ہے۔ وہ بیابان میں جلتا ہوا ایک چراغ ہے۔ اس کی شاعری وہ خیمہ گل ہے جو ہر سو مشامِ جان کو معطر کر رہی ہے۔ بیاباں میں رہتے ہوئے اس نے اپنا نام پیدا کیا۔ وہ لیہ کے صحرا میں محورقصاں بگولوں سے نبرد آزما ہوتا رہا۔ اسے خار مغیلاں بھی چھبتے رہے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک صحرا نشین ہونے کے ناطے سے اس کی شاعری میں نقشِ صحرائی بھی ہے' دشتِ صحرا بھی ہے' وہ سوچ کے لالہ زاروں میں گم بھی رہتا ہے' تھلوں کے آوارہ بگولوں کا تعاقب بھی کرتا ہے' اس کے کلام میں حسن کی نیرنگیوں کی عکاسی عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ وہ سکوتِ شامِ صحرا کی بھی عکس ریزی کرتا ہے۔ وہ صحرا کی تنہائی میں بھی خوش رہتا ہے اور ایک مفکر کی طرح ریت کے ٹیلوں' بے برگ زمین' صحرا میں مخمل نشینوں تھل کی حسن پاشیوں میں غور و فکر کرتا رہتا ہے۔

نہیں ضبط نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستان میں
کہ اس محفل سے خوش تر ہے کسی صحرا کی تنہائی
"ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی!"

(اقبال)

اس کی آواز صحرا کی صدا نہیں۔ اس کی آواز اب دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ اس آواز میں پیغام بھی ہے اور دعوتِ غور و فکر بھی! اب وہ صحرا کا چراغ خاموش نہیں۔ اس کی ضو اب شہروں کی گلیوں کو بھی روشن کرتی ہے۔ یہ چراغ تھل کی تیز و تند ہواؤں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کی بجھی بجھی سی روشنی اب ایک قندیل فروزاں ہے:

کون گزرا ہے دل کے صحرا سے
دور تک چاندنی سی لگتی ہے

(عبدالغفار عابد)

بڑی مدت سے میں نے جعفر بلوچ کا نام سن رکھا تھا۔ اگست 1994ء میں میں ان سے ملنے ان کے گھر واقع غزالی پارک لاہور گیا۔ وضع قطع سے ایک صوفی منش' گفتگو سے ایک سکالر اور ادیب جبکہ طبیعت کے لحاظ سے انہیں بہت خلیق اور اوصافِ حمیدہ کا مرقع پایا۔ میں تاریخ لیہ کی تدوین کے سلسلے میں ان سے رہنمائی لینے گیا تھا۔ انہوں نے مجھے کافی کتب ادب کے موضوع پر دیں۔

کتنے ہی چمک دمک والے ہیرے سمندروں کے تاریک غاروں میں پڑے رہتے ہیں! کتنے ہی پھول ہیں جن کی رعنائیاں اور گل پاشیاں کوئی نہیں دیکھ سکتا اور ان کی عطر بیز خوشبوئیں صحرا کی ہواؤں میں دم توڑ دیتی ہیں۔

جعفر بلوچ سے الوداع ہوا تو گھر آ کر ان کی کتاب "آیاتِ ادب" کھولی جس میں لیہ اور مظفر گڑھ کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کے سرِمتن میں تھامس گرے کے مندرجہ بالا اشعار

کا ترجمہ درج تھا جو جعفر بلوچ نے کیا ہے:

ہیں سمندر کی تہوں میں ایسے کتنے ہی گوہر
جن کی منظر تابیوں کو جانتا کوئی نہیں
ایسی کتنی ہی بہاریں آئی ہیں صحراؤں میں
جن کے حسن رنگ و بو سے آشنا کوئی نہیں

یہ اشعار جعفر بلوچ کے حال کی عکاسی کرتے ہیں۔اس نے صحرا میں رہ کر نام پیدا کیا اور یہ کارنامہ کچھ کم نہیں ۔ یہ خالق حقیقی کے خصوصی کرم اور اس کی نظر التفات کا ہی نتیجہ ہے ۔ وگرنہ نواب جلال میرزا خانی کے الفاظ میں:

بھڑک اُٹھا شرر لالہ قلب صحرا میں
کہیں کوئی راہ بھی تو نہیں!

پروفیسر محمد منور کے الفاظ میں:

''ہمیں معلوم ہے کہ بڑے بڑے شہروں یا بڑے علمی مراکز سے دور بھی بڑے با کمال لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں لیکن بد قسمتی سے وہ صحراؤں کے پھول اپنے اِرد گرد خوشبو پھیلاتے رہے ہیں اور مرکز میں نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شعاعیں ،خوشبوئیں اور ان کا فیض دور دور تک نہ پہنچا۔''

پروفیسر مذکور ''آیات ادب'' مصنفہ جعفر بلوچ میں لکھتے ہیں:

''راجہ محمد عبداللہ نیاز، کشفی ملتانی، جلال مرزا خانی، مہر عبدالحق، خیال امروہوی، غافل کرنالی، نسیم لیہ اور اسی طرح بہت سے خوش فکر شعراء اس چھوٹی سی کتاب میں شامل ہو گئے ۔خود جعفر بلوچ بھی جنہیں اللہ میاں نے ذوقِ شعر و ادب سے مالا مال فرمایا ہے اور جنہوں نے شاعر کی حیثیت سے اچھا خاصا نام کمایا ہے' اس تذکرہ میں ازرہ انکسار مختصراً مذکور ہیں۔''

پروفیسر جعفر بلوچ 27 جنوری 1947ء کو لیہ میں پیدا ہوئے ۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لیہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے حضرت نسیم لیہ رحمت اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمیذ ہوئے اور مشورہ سخن کرتے رہے۔ آپ نے 1968ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی

ایڈ کیا۔ایم اے اُردو کرنے کے بعد آپ لیہ میں پڑھاتے رہے۔1975ء میں آپ کو لیکچر رشپ ملی ۔گورنمنٹ سائنس کالج لاہور میں اُردو کے پروفیسر تعینات رہے۔ ریٹائر ہوئے اور راہِ عدم کو سُدھار گئے ۔ یہ تھا ان کا سفر حیات۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(i) مطلعین: (علامہ راجہ محمد عبداللہ نیاز اور اسد ملتانی کا تعارف اور انتخاب' مظفر گڑھ 1974ء

(ii) اقبالیات اسد ملتانی۔لاہور 1984ء

(iii) اقلیم: (مجموعہ کلام)۔لاہور 1986ء

(iv) ارمغان نیاز: (راجہ محمد عبداللہ نیاز کے فکر و فن پر مجموعہ مقالات) ترتیب از جعفر بلوچ۔ دارالکتاب ۔لیہ 1988ء

(v) بیعت: یہ آپ کا مجموعہ نعت ہے۔آپ کی تصنیف ''آیاتِ ادب'' 1988ء میں شائع ہوئی۔اس میں مظفر گڑھ اور لیہ کے شعراء کا تذکرہ ہے۔

آپ گورنمنٹ کالج لیہ کے مجلّہ تھل کے ایڈیٹر (65-1964ء) رہے۔گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' کے بھی (85-1982ء) معاون نگران رہے۔

آپ کا ایک عمدہ شعر ملاحظہ ہو:

جلوتوں کی رونق افزائی میں ہیں سارے شریک
خلوتِ دل کے لئے ہر آدمی موزوں نہیں

جعفر بلوچ نے اپنے ہم عصر شعراء سے انوکھا لکھا ہے۔ان کے کلام میں ندرت، شگفتگی اور تازگی ہے۔ان کے کلام میں توانائی بھی ہے اور حرارتِ زندگی بھی:

ہم اپنے ضبط سے تطہیر کے امکان کھو بیٹھے
اگر آنکھیں چھلکتیں چہرہ ہستی نکھر آتا
تماشا کون بنتا، لوگ پتھر پھینکتے کس پر
گر سطحِ عوام الناس پر میں بھی اُتر آتا

آپ غزل اور نظم دونوں میں یکساں طور پر ماہر ہیں۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا:

''وہ غزل اور نظم دونوں اصناف کی تخلیق میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے الفاظ کے مناسب اور برمحل استعمال سے مولانا ظفر علی خان کی شعری روایت زندہ کردی ہے۔''

بقول پروفیسر فرخ درانی:

''بین السطور مزاح کا رنگ' دلچسپ ہنگامی و مقامی حوالے کا اسلوب میں داخل و خارج کا خوبصورت امتزاج' زبان و بیان پر اُستادانہ عبور' مغلق و مغلط مشکل تراکیب سے احتراز' نظموں میں موضوعات کی جدت وحدت' لب ولہجہ کی تازگی و شگفتگی' اردگرد کی رواں دواں زندگی کا تیز دھڑکتا ہوا شعور، غرض سب خوبیاں قابل داد ہیں۔''

جعفر بلوچ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بادہ کش خوش ہیں کہ پھیلا ہے پیالہ ٹوٹ کر
وسعتِ مشرب کے امکاں کچھ زیادہ ہو گئے

جعفر خفا ہو تم ہم سے اچھا
تم اپنے گھر خوش ' ہم اپنے گھر خوش

ایک اور شعر لکھتے ہیں:

زندگی موت کا تعاقب ہے
زندگی موت سے گریز نہیں

اس شعر کا مطلب غور طلب ہے۔ اس میں معنویت ہے اور زندگی کی بے ثباتی کی عکس ریزی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ

''تم جہاں کہیں بھی ہو موت تمہیں آلے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔'' (سورہ النساء - آیت 78)

سید محمد قاسم اپنی تالیف (پاکستان کے نعت گو شعراء، جلد اول مطبوعہ ہارون اکیڈمی، کراچی 1993ء ایڈیشن) کے صفحہ 103 پر رقمطراز ہیں:

''ان کی نعتوں میں سیرت پاک کی جلوہ گری نمایاں ہے۔ ان کا مجموعہ نعت ''بیعت'' اہل نظر کے لئے خاصہ کی چیز ہے''۔

جعفر بلوچ شاہ لولاک ﷺ کے ثناء خواں بھی ہیں۔ آپ کے نعتیہ اشعار میں سیرت محمد ﷺ کی عکاسی اور آپ ﷺ کے پیغام کی عالمگیریت اور آفاقیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً:

تا عرش ہے اعلانِ رفعنا لک ذکرک
اللہ غنی شانِ رفعنا لک ذکرک
آقا ہیں، مرے فخرِ مرسل، مرجعِ لولاک
ما زاغ مشرف، جان رفعنا لک ذکرک

جعفر بلوچ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں انتہائی باادب ہو کر حاضری دیتے ہیں۔ آپ نعت کے تقدس سے بخوبی واقف ہیں۔ ان اشعار میں آپ سرور کونین ﷺ کی مبارک چوکھٹ پر کتنے ادب سے کھڑے نظر آرہے ہیں اور یہی آپ کی نعتیہ شاعری کا کمال ہے:

ادب شرط ہے، یہ سخن عامیانہ نہیں ہے
یہ ہے نعت، کوئی غزل یا فسانہ نہیں ہے
قلم سر جھکاتا ہے اپنا درِ مصطفےٰ ﷺ پر
یہاں بات کوئی سخن گسترانہ نہیں ہے

آپ کا کلام دلوں کو موہ لیتا ہے۔ آپ کا کلام سادہ لیکن پُرکشش ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قصہِ صبح، افسانہ شام اب یاد نہیں
یاد نہیں یارانِ کرم، اب یاد نہیں
دھبوں پہ دھبے جو لگے یہ رنگ ہوا
ہم پر تھے کیا کیا الزام اب یاد نہیں
کیا کیا لوگ ملے تھے میلوں ٹھیلوں میں

چہرے تو کچھ یاد ہیں نام اب یاد نہیں
لٹنے اور جلنے سے پہلے کیسے تھے
پھولوں کے رنگین خیام اب یاد نہیں

آپ کی تشبیہات میں ندرت ہے۔ زندگی کو برف کی ڈلی سے تشبیہ دینا ایک انوکھا اور نادر خیال ہے۔ ایسی تشبیہات ادب میں خال خال ملتی ہیں:

زشت رو توڑتے ہیں آئینے
آئینوں کی ہنسی نہیں رُکتی
محسوس بارہا یہ ہوا ہے کہ زندگی
اک برف کی ڈلی ہے کفِ برشگال پر

چراغِ صحرا......نسیمِ لیّہ

ڈاکٹر خیال امروہوی

قدیم فلسفیوں کا خیال تھا کہ کائنات چار حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ کرہ کہلاتا ہے، جیسے کرہ ہوا، کرہ آب و آتش اور کرہ خاک۔ ہوا سب پر غالب ہے۔ چونکہ ہوا ہی کی بدولت تمام عناصر کام کرتے ہیں، کرہ ہوا ہی عناصر کو منظم کرتا ہے اور یہی بکھیر بھی دیتا ہے اور تولید و تخلیق ذی روح بھی اسی کی بدولت ہے۔

کرہ ہوا کی تاثیر سمجھیئے کہ خاکسار کے اجزائے ترکیبی حیدر آباد دکن (انڈیا) سے اُڑ کر لاہور اور پھر لیّہ پہنچے اور اسی کرّے کی تاثیر تھی کہ مولانا و مقتدانا حضرت عبدالسمیع نسیم آف لیّہ اس خاکدان میں پیدا ہوئے۔ راقم بہ سلسلہ ملازمت ۱۹۶۶ء میں لیّہ وارد ہوا۔ یہاں صرف دو ہی اجزاء نظر آئے تھے۔ ایک لیّہ دوسرے نسیمِ لیّہ۔ یہ اجزاء لائینف تھے۔ ان کے علاوہ ٹوٹی ہوئی سڑکیں، کھجور کے فلک بوس درخت، دریائے سندھ کی ریت، سورج کی گرمی، غربت و بے روزگاری۔ مستزاد، یہاں نہ پھل تھا نہ سبزی۔ سیدھے سادے پر خلوص لوگ تھے۔ مکر و فریب سے عاری شرافت کے پجاری۔ اہل ہند جو مسلمان نہیں تھے اور جنھیں ہندو کہا گیا، لیّہ کے گلی کوچوں میں (جو کوٹھڑیاں کھرلیاں چھوڑ گئے تھے) ان میں مہاجر حضرات آبسے تھے۔ دو چار گھر ایسے ضرور تھے جن میں بلاشبہ مالدار ہندو رہتے ہوں گے۔

۱۹۴۷ء میں جب یہاں سے ہندو بھاگے تو نسیم لیّہ کو یہ خیال تک نہ آیا کہ ایک دو مکان ہی قابو کر لیں تاہم یہ خیال تب آیا جب مالِ غنیمت تقسیم ہو چکا تھا۔ لیّہ میں چند بزرگوار اور بھی تھے

جن کے پیشے بہر حال شاعری سے مختلف تھے۔ ان اکابرین میں ڈاکٹر قیصر رضوی اور فضل حق رضوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ارمان عثمانی صاحب جو پیدائشی شاعر تھے بعد میں آئے۔ نذیر چودھری پنجابی اور اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ افسوس کہ اب ان کے لئے نگاہیں ترستی ہیں۔ غافل کرنالی ان دنوں نوجوان تھے، آج بھی ہنستے بولتے ہیں لیکن اب وہ دور کہاں۔

نسیم لیہ ایک ایسے شخص کا نام ہے جسے فطرت نے نکتہ آفرینی‘ بذلہ سنجی‘ علم پروری، جمال نوازی اور کمال دانی کے لئے پیدا کیا تھا۔ نسیم ایک عالم گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیہ میں تاحال ایسا ہمہ جہت اور جمیل المناقب بچہ دوبارہ پیدا نہ ہوسکا۔ حضرت نسیم لیہ مرحوم ومغفور نے دسویں جماعت تک گورنمنٹ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ بقول موصوف تقسیم پاک وہند سے قبل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی ان کے ہم جماعت تھے‘ جس کی تصدیق لیہ کے معروف محقق میاں الٰہی بخش سرائی نے بھی فرمائی۔ نسیم لیہ کو اگر حالات اجازت دیتے اور شاعری کی جونک جان چھوڑتی‘ آزاد منشی سے نجات حاصل ہو جاتی تو وہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر سکتے تھے اور اپنے عہد کے ابوالکلام ضرور ہوتے۔ لیکن افسوس! ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال؟

البتہ مسجد کے تدریسی نصاب اور اس دور کی تعلیم‘ ماحول وغیرہ نے ان کے مزاج اور کتاب بینی کے شوق کو دو آتشہ کر دیا تھا اور وہ کسی بھی علمی محفل میں علمی اظہار رائے کے سلسلے میں پیچھے نہیں تھے۔

آج جبکہ نسیم جسمانی طور پر اوجھل ہے اس کی آواز‘ لہجے کی کھنک‘ مباحث اور شاعری کی دھنک‘ لطائف پر طلائی اور نقرئی قہقہے‘ علمی اصطلاحات‘ ادبی نکات سبھی کچھ سماعت میں گونج رہے ہیں لیکن اس کا احساس صرف انھی کو ہوسکتا ہے جنہیں علم وادب سے کچھ لگاؤ ہے وگرنہ آج کی نسل کو کیا خبر کہ علم کس چڑیا کا نام ہے؟ نسیم لیہ بے حد خوبصورت اور وجیہہ انسان تھے۔ نسیم پر تسلمان ساوجی‘ زید بن سروجی‘ خلیل جبران اور ابوالعلیٰ زخری کی باتوں اور گھاتوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ ایسے انا پسند شاعر تھے جن کے سامنے بڑے بڑے ابدی سکندر چلمیں بھرنے کے بھی لائق نہ تھے۔

نسیم نے شادی بھی میری طرح رچائی تھی۔ فرق یہ تھا کہ میں نے روایت شکنی کرتے ہوئے ولیمہ کو عصرانہ میں تبدیل کر ڈالا تھا لیکن نسیم نے ولیمہ میں چاول کچھ اس قماش کے کھلائے کہ ہر مہمان کو خشک پلاؤ کے ہمراہ ایک عدد پانی بھرا گلاس بھی دیا گیا تا کہ خوراک آسانی سے نیچے اتر

جائے۔ تاہم مخصوص شعراء کے لئے سالن اور دہی بازار سے منگوا کر دیا گیا تھا! شادی کے بعد مشاعرہ ہوا اور شرکاء نے ایک من چائے کی دیگ پیٹوں میں انڈیل لی تھی۔ نسیم صاحب کی چائے نوشی مشہور ہے۔ کئی درجن پیالیاں روز کا معمول تھا۔ پروفیسر جعفر بلوچ سے میں نے کہا تھا کہ نسیم اس قدر چائے کیسے ہضم کر جاتا ہے اور یہ جاتی کہاں ہے تو ہم نے مل کر سراغ لگایا کہ چائے کا دودھ ان کے سفید بالوں میں آ گیا ہے۔ چائے کی پتی کا اثر ان کی کتاب ’’برگِ لرزاں‘‘ میں اور پانی وہیں گیا جہاں اسے جانا چاہیے تھا۔ یوں تو نسیم شاعر شباب تھے لیکن مرحوم نے زندگی بھر کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا البتہ چائے کے معاملے میں ابوالکلام آزاد کے پیرو تھے۔ چائے کی گرمی اور چاشنی ارتجالی شعر گوئی اور محفل آرائی یہ سب باتیں انہی کی زندگی تک تھیں۔ اب یہاں نہ کوئی شاعر رہا ہے نہ شعر فہمی‘ جہالت کی حکمرانی ہے اور بے مقصد زندگی کی راجدھانی ہے، ویران دن ہیں اور خوفناک راتیں۔ حیرت یہ ہے کہ موجودہ حالات کے بارے میں نسیم لیہ نے قبل از وقت پیش گوئی بھی کر دی تھی اور مجھ سے کئی بار کہا تھا کہ آپ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں ہی کہہ دیا تھا کہ خیال صاحب! اس ملک پر انجانے مہیب سائے اور بربادی کے آسیب نظر آ رہے ہیں۔ ان کے اسی انجانے خوف نے ان کے مجموعہ کلام کا نام ’’برگِ لرزاں‘‘ رکھوا دیا۔ یعنی ایک ایسا تمدن جو اپنی شاخ پر پتے کی طرح لرز رہا ہے جسے صرصر حوادث زمین پر پٹخ دے گی۔ علامتی طور پر ’’برگِ لرزاں‘‘ نہ صرف اس زوال پذیر عہد کا ترجمان ثابت ہوا بلکہ نسیم خود بھی حادثاتی طور پر شاخِ حیات سے ٹوٹ کر گر پڑا اور ان کے ساتھ پورا عہد ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔

حضرت نسیم لیہ کسی باقاعدہ سیاسی تحریک سے منسلک نہیں رہے۔ ان کے شعری تجربات مخصوص نظریئے کے بغیر انسانی ارتقا اور زوال کے آئینہ دار رہے ہیں۔ علم وادب کے لئے علاقے کی تخصیص بے معنی سی بات ہے کیونکہ ادب علاقے کو زندہ رکھتا ہے نہ کہ علاقہ ادب کو۔

اس اعتبار سے نسیم لیہ مسلسل چالیس برس سے اُردو شاعری کے ذریعے سماجی تنقید کا فرض ادا کرتے چلے آ رہے تھے۔ نسیم صاحب نہ روسی تھے نہ امریکی بلکہ خالص پاکستانی تھے۔ لیہ انہی کی تخلیق ہے اور وہ لیہ کی تخلیق! لیہ جیسے دور افتادہ علاقے کے باوجود پاکستان کے ہر علاقے میں نسیم کی آواز سنی جا سکتی ہے کیونکہ وہ اس قلم قبیلے کے فرد تھے جن کا موضوع ’’انسان‘‘ تھا۔ نسیم کی

شاعری اس لئے بھی زندہ ہے کہ انہوں نے اظہار خیال کے لئے جو راہ اختیار کی جو لہجہ اختیار کیا اور جن جدید اصطلاحات سے کام لیا۔ وہ ادبی اعتبار سے ''وقت کی راکھ میں اب تک دبی چنگاری ہے جو بھڑک جائے تو گلزارِ ابراہیم بنے''۔ بے حد اہم ہے:

خونِ چراغ، قتلِ سحر، ذبحِ آفتاب
جلاد ظلمتوں کا ذرا دل تو دیکھیے

ان کے یہاں دیگر ہمعصر شعراء کی نسبت تفکر اور تفقہ کی گیرائی اور گہرائی زیادہ ہے:

وقت کی راکھ میں اب تک وہی چنگاری ہے
جو بھڑک جائے تو گلزارِ ابراہیم بنے

نسیم کے یہاں قنوطیت نہیں، رجائیت ہے اور اس رجائیت نے مستقل طور پر امید کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ اگر ظہیر کاشمیری یقین سے کہہ سکتے ہیں:

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب

تو نسیم لیہ کو بھی یقین تھا کہ:

صبحِ مرحوم کی ٹیسوں کو سلگنے دو نسیم
جل اٹھا جب یہ الاؤ تو اجالا ہو گا

تجریدیت زیادہ ہو جائے تو شاعری کا ابلاغ کم ہو جاتا ہے۔ تجرید کی یہ صورت اکثر جدید ابہام نگاروں کے یہاں ہے تاہم نسیم لیہ کی تجرید مبہم نہیں یعنی وہ اپنے کلام میں درد کا چاند، قفلِ غم، پیڑ کا رونا، بارش درد یا اسی قسم کی غیر مانوس علامات استعمال نہیں کرتے بلکہ تجرید کو واضح معروض سے ہم آہنگ بناتے ہیں۔ نسیم لیہ مزاحمتی شعراء کے اس گروپ سے تعلق نہیں رکھتے جن پر سیاسی چھاپ ہے تاہم انہیں سماجی نقاد شاعروں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ شاعرانہ تنقید کے لئے باقاعدہ جماعت (پارٹی) یا کسی لابی سے متعلق ہونا لازمی نہیں ہے۔

میرے ذاتی خیال میں سیاسی اور سماجی شعور سے جدا ہو کر بہترین شاعری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نسیم صاحب سماجی تبدیلیوں اور ارتقائی نزولی میلانات سے بھی آشنا تھے اور وہ اپنے ان رجحانات کے اظہار پر پوری دسترس رکھتے تھے۔

مرگِ امروز پہ ہم آپ ہی ماتم کر لیں

صبحِ فردا کفِ افسوس ملے یا نہ ملے

نسیم لیہ کا مجموعہ کلام ''برگِ لرزاں'' ادب میں نہایت قابل قدر اضافہ ہے۔ نسیم نے صنف غزل میں وسیع اور عمیق تجربات کئے ہیں۔ سماج کے ہر طبقے کی نفسیات و کردار کو کھنگالا ہے۔ لفظوں کے دروبست کا خیال رکھتے ہوئے انسانی سوچ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ ''برگِ لرزاں'' کا خالق اگرچہ دور افتادہ علاقے کا باشندہ ہے لیکن اس کے محسوسات علاقائی نہیں بلکہ آفاقی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے درست کہا:

''نسیم لیہ نے ہوسِ زر کی برملا مخالفت کی ہے۔ اسے جاہ پرستی سے نفرت ہے۔ وہ چڑھتے سورج کو سلام کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ زمین کو خود اپنی جریب سے ناپتا ہے، اس لئے اپنی خودی اور خودداری پر نازاں ہے''۔

مسکرا کر نئی تہذیب نے یوں گھیر لیا
اک زنِ فاحشہ رستے میں کھڑی ہو جیسے

جہلِ حاکم کو بھی لبیک کہے جاتے ہیں
لوگ سادہ ہیں بہت میرے گھرانے کی طرح

لپٹ لپٹ کے حقوق العباد کہتے ہیں
جناب شیخ نہ حج جسکا ابھی ارادہ کریں

نئی تحریک، نیا دام بھی جاری رکھنا
نغمۂ حق، لب منقار بھی آ جائے گا

بہر حال جب بھی سر شام ہو یہ وقت سحر ایک ایسے دوست کی صدا ہمہ وقت گونجتی رہتی ہے جس کی مفارقت نے مجھے بیحد صدمہ پہنچایا۔ مرحوم کو جدا ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ اپنی تخلیقات کسے سناؤں، کس سے علمی گفتگو کروں، غالباً یہ احساس صرف مجھی کو نہیں ہے بلکہ سبھی اہل علم کو ہے۔ اب تو مخالف بھی کہتے ہیں کہ:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

جاذبیت اور انوکھی تاثیر ہے۔لیہ سے تبدیل ہوئے مجھے کئی سال ہو چکے ہیں لیکن ملک آفتاب احمد اعوان نے لیہ کے حالات سے ہر لحظہ مجھے باخبر رکھا۔ جب میں نے لیہ کا یہ ادبی منظر نامہ قلم بند کرنا چاہا تو ملک صاحب نے مجھے بڑے دکھی انداز میں بتایا کہ چند بزرگ شعراء جو لیہ کے اسی ہاؤس میں مشاعروں میں رونق افزا ہوتے تھے وہ آج اس جہان فانی میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً نسیم لیہ صاحب، نذیر چوھدری صاحب، کوٹ سلطان کے سرائیکی شاعر کیف شکوری صاحب، جناب فضل حق رضوی صاحب اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ شاعر قوم کی آنکھ ہوتا ہے۔لیہ کے شعراء اس جل تھل کی خوشبوؤں کا ذکر کرتے ہوئے سماجی اقدار پر گفتگو کرتے اور ہر فرعون اور شداد پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ میری وہاں تعیناتی کے دور میں گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل پروفیسر اشفاق علی خان نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ پاکستانی بیوروکریٹ نے اپنے علاقے اور اپنی دھرتی کے علماء شعراء اور اہل قلم حضرات سے اپنا تعلق توڑ دیا ہے۔اس کے برعکس میں نے ہمیشہ ان سے رشتہ جوڑا۔ جب میں اے سی ہاؤس لیہ میں مشاعرہ کرواتا تو لیہ کے ادیب برکت اعوان، گلزار مجبوب، جناب فضل حق رضوی، پروفیسر شہباز نقوی، غافل کرنالی، پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی، حضرت نسیم لیہ، ملک آفتاب احمد اعوان، میاں الٰہی بخش سرائی، نسیم لیہ کے بھتیجے سلیم اختر ندیم، عبدالحکیم شوق، انجم صحرائی، عثمان خان اور دیگر صحافی اور شعراء کرام ان ادبی محفلوں کو رونق بخشتے۔ پروفیسر خیال امروہوی پایہ کے شاعر تھے۔ فرماتے ہیں۔

عطر کو چوس گئی موج صبا کی تتلی
کاغذی ہو گئے سب پھول مہکنے والے
میں نے تاریخ تو لکھ دی ہے کھرے لفظوں میں
حاشیے بعد میں لکھیں گے پرکھنے والے

فضل حق رضوی بھی کہنہ مشق شاعر تھے:

منٹ، پل بھر، گھڑیاں، دن، مہینے، سال بن بن کر
گزرتا جا رہا ہے وقت، غافل ہے کہ سوتا ہے

ریگزارِ لیّہ کے شعراء

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

لیہ ادبی لحاظ سے بڑا زرخیز خطہ ہے۔ ریگ زار لیہ کے شعراء کا کلام منفرد ہے۔ سرائیکی خطہ ویسے بھی ادب و شاعری سے مالا مال ہے۔لیہ میں اُردو پنجابی اور سرائیکی شعراء فضا کو معطر کرتے رہے ہیں۔ ویسے بھی لیہ کے جل تھل کے ہر خس و خاشاک سے ادب کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔
بقول ڈاکٹر خیال امروہوی:

''لیہ ایک شہر بھی ہے اور ایک انجمن بھی''۔

لیہ کا تھل، لق ودق صحرا بھی ہے اور ایسا خطہ بھی جہاں تیز و تند آندھیاں چلتیں۔ لو کے گرم بگولے بھی رقص کرتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر سو گل و گلزار بھی کھلنا شروع ہوئے۔ دریائے سندھ لیہ کے کناروں کو چومتا ہوا گزرتا ہے اور اسی نے یہاں رونقیں بھی پیدا کیں۔ اس شہر کو کمال خان میرانی نے 1550ء میں آباد کیا تھا۔ یہ شہر یہاں کی مخصوص نباتات ''لئیاں'' کی مناسبت سے مشہور ہوا۔ بقول ڈاکٹر خیال امروہوی ''لیہ'' نے راجہ داہر، محمد بن قاسم، بلوچ قبائل، احمد شاہ ابدالی، رنجیت سنگھ اور برطانوی سامراج کا دور دیکھا ہے اور پھر تحریک پاکستان میں بھی اپنا کردار ادا کیا ہے''۔

میرے دور میں لیہ ادب کے لحاظ سے زرخیز تھا اور اب بھی ہے۔ روزنامہ ''سنگ میل''، ''نوائے تھل''، ''صبح پاکستان'' قابل ذکر ہیں۔ میرے دور میں آفتاب احمد اعوان ایک ایسے صحافی اور اہل قلم تھے جنہوں نے مجھے کبھی نہ بھلایا۔ ان کی گفتگو میں مٹھاس اور قلم میں بڑی

پروفیسر شہباز نقوی کے اشعار ابھی تک ذہنوں میں گونجتے ہیں:

میں حرفوں کے قبرستان میں تنہا ہوں
میری آرزوؤں کے سائے واپس کر دے

غافل کرنالی صحافی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے اعلیٰ کردار نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے ملتے تھے اور انتہائی خود دار تھے۔

کٹے جو سر بھی تو فرعونِ وقت کے آگے
قلندروں کی طرح رحم کی اپیل نہ کر

مجھے شعراء کرام نے بتایا کہ اے سی ہاؤس لیہ میں ایک دفعہ کل پاکستان مشاعرہ کے دوران 'جو لیہ میں ہوا' کئی نامور شعراء یہاں ٹھہرے مثلاً جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی بھی یہاں آئے۔ مصطفیٰ زیدی کے دور میں تو لیہ شعروادب کے لحاظ سے عروج پر تھا۔

میں لیہ کے اہل قلم کی تنگدستی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ نہ صرف لیہ میں بلکہ پاکستان میں یہی کیفیت ہے کہ صحافی اور اہل فکر ودانش بالعموم تنگدستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بعض دفعہ اس سے قباحتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور بعض اہل قلم ضمیر فروشی پر بھی اتر آتے ہیں۔ لیہ میں تو یہ فضا میرے زمانے میں نہیں تھی۔ صحافیوں اور اہل قلم سے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے اور ان سے انتظامی امور میں مدد ملتی تھی۔ ظاہر ہے حالات اور واقعات کی نبض پر ان کا ہاتھ ہوتا تھا۔ اس طرح وہ انتظامیہ کو ہر معاملے سے بروقت آگاہ کر دیتے۔ لیہ کے صحافیوں' شاعروں اور اہل قلم کی ننھی منی پارلیمنٹ ہر وقت موجود رہتی' جائز تنقید بھی کرتی' رہنمائی بھی کرتی اور احتساب بھی کرتی۔ یہ پارلیمنٹ محتسب بھی تھی۔ گورنمنٹ کو چاہیے کہ تنگدست اہلِ قلم کی سرپرستی ضرور کرے۔ اگر کوئی صحافی یا اہل قلم فوت ہو جائے تو اس کے یتیم بچوں اور بیوہ کی سرپرستی کرے اور ان کے خاطر خواہ وظائف مقرر کرے۔ اگر حضرت عمرؓ کو دریائے فرات کے کنارے کسی جانور کے مرجانے کا فکر تھا تو لیہ میں دریائے سندھ کے کنارے پر رہنے والے ہر مفلوک الحال شہری کی کفالت حکومت کے ذمے ہے۔ جب تک ہم اہلِ علم اور اہلِ دانش کی کفالت نہیں کریں گے ہماری سوچ نہیں بدل سکے گی۔ ہر ضلع میں اہلِ قلم فنڈ ہونا چاہیے جس سے ان کی کفالت ہو۔

میں جب لیہ سے تبدیل ہوا تو بے شمار دوستوں نے الوداعی دعوتیں دیں۔ پریس کلب نے بھی الوداعی دعوت کا اہتمام کیا۔ لیہ کے مرحوم شاعر نسیم لیہ جنہیں تاجدار شعرائے لیہ کا بھی خطاب دیا گیا تھا، وہ بھی اس الوداعی تقریب میں شامل تھے۔ لیہ کے قیام کے دوران میں شعراء' ادیبوں اور صحافیوں کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں ان سے ڈرتا تھا کہ کہیں میرے خلاف خبریں نہ چھاپیں بلکہ اس لئے کہ وہ نازک دل ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض بھی ہو جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش بھی ہو جاتے ہیں۔ قلم کے رشتے کے ناطے سے ہمیشہ میں ان کی عزت کرتا تھا۔ ان میں جناب نسیم لیہ کو میں نے کئی دفعہ اپنے گھر بھی دعوت دی اور وہاں محفلوں میں ان کا کلام بھی سنا۔ طبعاً خود دار تھے۔ میں بلدیہ کا ناظم تھا اور آپ بلدیہ کی لائبریری کے انچارج تھے۔ میری الوداعی تقریب میں جناب نسیم لیہ نے جو الوداعی اشعار پڑھے وہ درج ذیل ہیں:

اور کچھ اس لئے گرفتار تعلق ہونا؟
تری زنجیر کے حلقے میرے پاؤں میں رہے
یہ غنیمت ہے کہ بکھرے ہوئے اجزائے قلم
ترے اخلاق و مروت کی فضاؤں میں رہے

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں دیگر صحافیوں' شعراء اور ادیبوں کے ہمراہ جناب نسیم لیہ صاحب اکثر میری رہائش گاہ پر تشریف لاتے۔ ہم وہیں مشاعرے کراتے اور چائے کے دور چلتے۔ انہیں اپنا ایک بزرگ اور اہل علم شخصیت سمجھتے ہوئے میں نے ہمیشہ ان کی عزت وتکریم کی۔ ان کی بھی شفقت تھی کہ میری دعوت قبول فرماتے اور اس طرح اسسٹنٹ کمشنر ہاؤس نابغہ روزگار شعراء اور ادباء کی مہک سے اور زیادہ خوشبودار چمن بن جاتا۔ غالباً اسی تعلق کے پیش نظر نسیم لیہ صاحب فرماتے ہیں:

تجھ کو یہ زعم ترے ہاتھ رہی پیار کی ڈور
ہم کو یہ فخر کہ اونچی ہواؤں میں رہے
ہم شب غم کو اجالیں گے تری کرنوں سے

تو ہے مہتاب تو پھر کیوں نہ خلاؤں میں رہے

علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آ گیا:

محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا

یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

میں تمام ادیبوں سے بطور ایک بیوروکریٹ نہیں بلکہ بطور ایک بھائی، دوست اور عزیز بن کر ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے نازک دلوں میں میرے لئے محبت تھی، یہی وجہ ہے کہ جناب نسیم صاحب نے میرے لئے کبھی پیار کی ڈور، کبھی زنجیر کے حلقے، کبھی مہتاب، کبھی یاد کی دھوپ اور کبھی قرب کی چھاؤں جیسی خوبصورت تشبیہات استعمال کیں۔

اس الوداعی تقریب کے بعد میری نسیم لیہ صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ 1991ء میں سلیم اختر ندیم کی معرفت چکوال میں معلوم ہوا کہ جناب نسیم لیہ طویل علالت کے بعد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

اس طرح لیہ اپنے ایک عظیم شاعر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ نسیم لیہ صاحب کے اشعار میں ان کونجوں جیسی کرلاہٹ تھی جو کھلی بہار کے آخر میں قطار اندر قطار روہی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔

مشہور مقامات

ضلع لیہ کے مشہور مقامات

سید محمد عامل شاہ

ڈسٹرکٹ آفیسر (ریونیو) لیہ

ضلع لیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ لیہ کئی ادوار میں بامِ عروج پر پہنچا اور کئی بار لی دریائے سندھ کے عتاب کا شکار ہوا، (لیہ شہر کی مکمل تاریخ ''صدیوں کا سفر'' از ناصر ملک میں پڑھی جا سکتی ہے)۔ یہ شہر پہلے قلعہ کے اندر آباد تھا۔ یہ قلعہ لیہ پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سید خضر خان (والیِ ملتان) نے تعمیر کرایا تھا اور زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ لیہ بارہا صدر مقام رہا ہے۔ مختلف ادوار میں تحصیل، ضلع اور ڈویژن کے درجے اسے ملے۔ کمشنر بنگلہ، کمشنر آفس اور انگریز کمشنرز کی قبریں آج بھی ہزاری پل کے قریب خستہ حالت میں موجود ہیں۔ یہاں بہت سی عہد قدیم کی نشانیاں موجود تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی گئیں۔ کچھ دریائے سندھ کی نذر ہو گئیں۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں بنوایا ہوا ''کوس مینارہ'' اور سید خضر خان (والیِ ملتان) کا تعمیر ہوا ''قلعہ لیہ'' معدوم ہو چکا ہے۔ پل ہزاری کے قریب دو مندر، دیوان کرم زائرئن کا بنوایا ہوا کالی دیوی کا مندر (پرانی سبزی منڈی کی جگہ پر) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں تیار کیا جانے والا دھرم سال۔ مندر گوسائیں، پریم مندر، ماتا مائی کا مندر، گؤشالہ اور شمشان بھومی وغیرہ سب یادِ ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ لیہ کو انگریز دورِ حکومت میں پنجاب ایکٹ کے تحت 1887ء کو میونسپل کمیٹی کا درجہ دیا گیا جبکہ یکم جولائی 1982ء کو اسے ضلع کا درجہ دیا گیا۔ کروڑ لعل عیسن اور چوبارہ کو تحصیلوں کا درجہ دیا گیا۔ لیہ ضلع کے پہلے ڈپٹی کمشنر فیصل تحسین میمن تھے۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع لیہ کی کل آبادی 6,64,000 افراد پر مشتمل تھی اور لیہ شہر کی آبادی

51,564افراد پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع لیہ کی کل آبادی تحصیل سطح پر اس طرح تقسیم کی گئی ہے۔

تحصیل لیہ: 6,23,834افراد

تحصیل کروڑ: 3,84,168افراد

تحصیل چوبارہ: 1,71,562افراد

جبکہ لیہ شہر کی کل آبادی تقریباً 76,724افراد پر مشتمل ہے اور شہر سے منسلک منڈی ٹاؤن کی آبادی 30,026افراد پر مشتمل ہے۔ اس طرح ضلع لیہ کی اکثریت دیہاتوں میں آباد ہے۔ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن انتہائی سادہ ہے۔ لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے۔ جبکہ لیہ شہر میں ایک شوگر مل بھی قائم ہے۔ یہاں پر کئی اولیاء کرام کے مزارات ہیں جن میں سے حضرت سخی شاہ حبیب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ اشرف بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ اور سید جہان شاہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے مزارات اہم ہیں۔ لوگوں کی اکثریت مسلم آبادی پر مشتمل ہے۔ تاہم دیگر مذاہب میں عیسائی مذہب کے لوگ بھی یہاں آباد ہیں۔ جن کی تعداد بہت قلیل ہے۔ یہاں پر زیادہ تر سرائیکی زبان بولی جاتی ہے۔ تاہم دیگر زبانوں میں پنجابی، اُردو اور پشتو زبانیں بھی بولی جاتی ہے۔

ضلع لیہ کے اہم قصبات

ضلع لیہ کے اہم قصبات درج ذیل ہیں۔

1۔ چوک اعظم

چوک اعظم لیہ کا سب سے اہم تجارتی مرکز ہے اور اپنی منفرد اہمیت کے لحاظ سے تھل کا مرکزی شہر کہلاتا ہے۔ نہایت بارونق شہر ہے جو دن رات اپنی گہما گہمی کے اعتبار سے "تھل کا دل" کہلاتا ہے۔ یہ شہر پنجاب کے وسیع تر علاقے تھل میں اہم شہروں کو ملانے والی شاہراہ (ایم ایم روڈ) کے سنگم پر واقع ہے۔ چوک اعظم لیہ شہر سے مشرق کی طرف صرف 26 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر سیاست، تجارت، دینی اور مذہبی اعتبار سے کافی اہم ہے۔

اس کا ابتدائی نام "چوک خونی" تھا۔ 1970ء میں سابق گورنر مشرقی پاکستان محمد اعظم خان

نے یہاں آمد پر اس کا نام تبدیل کر کے چوک اعظم رکھا۔ جبکہ 1983ء میں اس کو ٹاؤن کمیٹی کا درجہ دیا گیا۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی 11,250 افراد پر مشتمل تھی۔ جبکہ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق چوک اعظم شہر کی کل آبادی 35,583افراد پر مشتمل ہے۔

2۔ کوٹ سلطان

لیہ سے جنوب کی طرف تقریباً 26 کلومیٹر دور ملتان روڈ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ قدیم روایتوں کا امین ہے اور شروع سے خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ 1403ء تا 1407ء میں یہاں ایک قلعہ سید خضر خان نے تعمیر کرایا تھا۔ 1470ء کے لگ بھگ یہ قلعہ سلطان حسین لنگاہ نے دریائے سندھ پار سے آنے والے حملہ آوروں کے سدِ باب کے لیے فتح کیا۔ بعد میں یہ قلعہ اس سلطان حسین لنگاہ کے نام کی نسبت کوٹ سلطان کہلایا۔ 1550ء میں شیر شاہ سوری نے لیہ کے ساتھ یہاں کوٹ سلطان میں "کوس مینارہ" تعمیر کروایا تھا۔ انگریز دور حکومت میں کوٹ سلطان کو 1914ء میں میونسپل کمیٹی کا درجہ دیا گیا۔ اس وقت اس یونین کونسل کی کل آبادی 26,909افراد پر مشتمل ہے۔

کوٹ سلطان کے علاقہ میں تربوز اور خربوزہ بکثرت پائے جاتے ہیں اور سیزن میں ٹرکوں کے ذریعے یہاں سے دوسرے شہروں میں بھیجے جاتے ہیں۔

3۔ پہاڑ پور

لیہ سے جنوب کی طرف تقریباً 30 کلومیٹر دور کوٹ سلطان سے آگے ضلع لیہ کا آخری شہر پہاڑ پور ملتان روڈ پر واقع ہے۔ روایات کے مطابق اس کی بنیاد 17 ویں صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی۔ اس قصبہ کا قدیمی نام "سوہیہ پور" تھا۔ اس قصبہ کے اطراف میں سوہیہ قوم کافی تعداد میں آباد ہے اور اس قوم نے اس قصبہ کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اس شہر میں بسنے والے مشہور شخص "پہاڑ خان" کے نام پر اس کا نام پہاڑ پور رکھا گیا۔ پہاڑ پور کو یونین کونسل کا درجہ ایوبی دور میں بنیادی جمہوری نظام کے سلسلہ میں 1966ء میں دیا گیا۔ 1981ء کی مردم شماری میں اس کی آبادی 16,100 تھی۔ جبکہ موجودہ کل آبادی 26,280افراد پر مشتمل ہے۔

4۔جمن شاہ

لیہ سے جنوب کی طرف ملتان روڈ تقریباً 12 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع قدیمی قصبہ ہے۔اس قصبہ کی وجہ شہرت اور وجہ تسمیہ ''حضرت جمن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ'' کی ذات مبارکہ ہے۔آپ سمرقند بخارہ سے تبلیغ اسلام کی غرض سے یہاں تشریف لائے۔ان کا مزار اسی قصبہ میں واقع ہے۔اس کی آبادی تقریباً 9,000 افراد پر مشتمل ہے۔جمن شاہ کو 1960ء میں یونین کونسل کا درجہ دیا گیا ہے۔اس وقت یونین کونسل جمن شاہ 25,028 افراد پر مشتمل ہے۔

ضلع لیہ میں PTV کی نشریات دکھانے کے لیے جمن شاہ میں TV بوسٹر کام کر رہا ہے۔ملک نیاز احمد جکھڑ MNA کی ذاتی کوششوں سے اس کی ٹرانسمیشن کا آغاز 1994ء میں اس وقت کی وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے کیا۔اس بوسٹر کی وجہ سے PTV کی نشریات ضلع لیہ میں دیکھی جاتی ہیں۔

5۔پیر جگی

پیر جگی ضلع لیہ کا اہم تاریخی قصبہ ہے۔تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ باور ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا قصبہ چوتھی صدی عیسوی میں معرض وجود میں آیا۔1664ء میں مہلب بن ابی سفیرہ اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ تھل کے علاقہ کو فتح کرتا ہوا آیا۔دریائے سندھ کے نزدیک اس علاقہ میں اس نے کچھ عرصہ قیام کیا۔یہاں اس کے کچھ ساتھیوں کی قبریں بھی موجود ہیں۔جنہیں ''پیر اصحاب'' کی قبروں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

1746ء کے لگ بھگ گڑھ مہاراجہ کے علاقہ سے اپنے ساتھیوں کی معیت میں سید جعفر شاہ بخاری نے محمود خان میرانی پر حملہ کیا اور لیہ کے علاقہ جات پر قبضہ کر لیا۔جب جعفر شاہ بخاری نے ملتان کی مرکزی حکومت کو زرِ مالیہ ادا نہ کیا تو ''کوڑا مل'' نے اس پر حملہ کر کے لیہ کی حکومت سید جعفر شاہ بخاری سے چھین کر خود قابض ہو گیا اور سید جعفر شاہ بخاری ''پیر جگی'' کے مقام پر مقیم ہوئے۔وہ ایک نیک اور صالح آدمی تھے۔انہوں نے بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔انہوں نے جگی نامی ایک غیر مسلم عورت کو مسلمان کیا تو اس کے عزیز و اقارب نے اس پر بہت مظالم ڈھائے۔لیکن وہ ثابت قدم رہی۔اسی نو مسلم خاتون کے نام پر اس بستی کا نام

''جگی'' کہلانے لگا۔جو بعد ازاں پیر جگی شریف کہلایا۔یہیں سید جعفر شاہ بخاری کا مزار واقع ہے۔اسی بستی کی وجہ شہرت بخاری خاندان میں کئی پشتوں سے آنے والے نیک اور روحانی طاقتوں کے مالک ولی اللہ ہیں۔پیر سید خورشید احمد شاہ بخاری نہ صرف MNA تھے بلکہ نیک صفت و نیک سیرت انسان تھے۔اس وقت اُن کے فرزند پیر سید ثقلین شاہ بخاری M.N.A ہیں اور پیر سید محمد اقبال شاہ بخاری موجودہ گدی نشین ہیں۔2001ء کی مردم شماری کے مطابق اس قصبہ کی آبادی تقریباً 3,000 افراد پر مشتمل ہے۔یہاں سے جمن شاہ، لدھانہ، پہاڑ پور اور دھوری اڈہ کو سڑکیں نکلتی ہیں۔

6۔کروڑ لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ

کروڑ لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ لیہ سے 29 کلومیٹر دور شمال کی طرف لیہ بھکر روڈ پر واقع ہے۔یہ قدیم قصبوں میں ایک مشہور قصبہ ہے۔دریائے سندھ کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے شروع ہی سے سرسبز و شاداب رہا ہے۔یہاں دریائی کٹاؤ کی وجہ سے قدیمی بستیوں کے نام و نشان نہیں ملتے۔دوسری بار اسے راجہ دیو پال نے آباد کیا۔اس نے 1870ء میں کابل کے راجہ للیہ شاہ کے خاندان کے راجہ ''دیو پال'' نے تھل میں حملہ آوروں سے نبٹنے کے لیے دریائے سندھ کے کنارے مشرقی طرف ایک قلعہ تعمیر کرایا۔جو قلعہ دیو پال کے نام سے مشہور ہوا اور اس سے وابستہ شہر ''کوٹ دیو پال گڑھ'' زبان زدِ عام ہوا۔بعد میں دیو پال گڑھ سے دیپال گڑھ مشہور ہوا۔پورے علاقہ تھل میں قائم راجہ دیو پال کی حکومت کا یہ مرکزی شہر تھا۔بعد میں جب حضرت محمد یوسف لعل عیسن رحمۃ اللہ علیہ یہاں آئے تو کوٹ کروڑ سے کروڑ لعل عیسن کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا۔انگریز دورِ حکومت میں یہ ایک اہم شہر کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔1887ء میں پنجاب ایکٹ کے تحت لیہ کے ساتھ اسے بھی میونسپل کمیٹی کا درجہ دیا گیا۔جبکہ یکم جولائی 1982ء سے ضلع لیہ کی تحصیل کا درجہ حاصل ہوا۔1981ء کی مردم شماری کے مطابق کروڑ شہر کی آبادی 11,280 افراد پر مشتمل تھی۔جبکہ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق اس شہر کی آبادی 23,971 افراد پر مشتمل ہے۔اس شہر میں سبزی منڈی، غلہ منڈی، منڈی مویشیاں اور کئی تجارتی مراکز قائم ہیں۔جہاں ضروریات زندگی کی ہر چیز دستیاب ہے۔یہ شہر فتح پور، بھکر اور لیہ سے براہ راست

7۔ فتح پور

فتح پور ضلع لیہ کا اہم تجارتی شہر ہے۔ لیہ سے شمال مشرق کی جانب سے چوک اعظم سے 26 کلومیٹر کے فاصلے پر مشہور ترین شاہراہ (ایم ایم روڈ) پر واقع ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں تھل کے علاقہ پر مقرر میرانی خاندان کے دور حکومت میں بلوچ قبیلے کے ایک سردار ''فتح خان'' نے اسے آباد کیا اور اسی کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا۔ پاکستان بننے سے قبل یہاں کافی تعداد میں ہندو آباد تھے۔ یہاں ہندوؤں کا ایک مندر انگریز دور حکومت کے ابتدائی سالوں میں تعمیر کیا گیا۔ (اس مندر کی جگہ اب ہائی سکول قائم ہے)۔ قیام پاکستان کے بعد یہ گاؤں ترقی کرتا ہوا اچھے خاصے شہر کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس میں باضابطہ طور پر بازار رفتہ رفتہ تعمیر کیے گئے۔ آج ضلع لیہ میں بازاروں، مارکیٹوں اور دکانوں کی ترتیب کے لحاظ سے فتح پور کو ایک انفرادی اہمیت حاصل ہے۔

1981ء کی مردم شماری کے مطابق اس شہر کی آبادی 7,835 افراد پر مشتمل تھی۔ جنوری 1983ء میں اسے ٹاؤن کمیٹی کا درجہ دیا گیا اور اس کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔

8۔ شاہ پور دورٹہ

شاہ پور دورٹہ تحصیل کروڑ لعل عیسن کا اہم قصبہ ہے۔ یہ اپنے جلو میں طویل تاریخی سفر رکھتا ہے۔ اس کے قریب ہی ''دورٹہ'' واقع ہے۔ دورٹہ کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ یہاں دو عدد رہٹ چلا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے دو رہٹہ اور بعد ازاں دورٹہ مشہور ہوا۔ (سرائیکی زبان میں رہٹ کنویں کی چرخی کو کہتے ہیں)۔ مغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں یہاں حضرت محی الدین المعروف قادر شیر کاظمی (جو سابق وزیراعظم پاکستان میر ظفر اللہ خان جمالی کے پیر ہیں اور وہ ہر سال یہاں آ کر حاضری بھی دیتے ہیں) نے ڈیرہ غازیخان سے علیانی، دستی اور ٹھگیانی قبیلوں کے ہمراہ آ کر رہائش اختیار کی۔ انہوں نے یہاں آ کر بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا۔ ان کا خاندان یہیں آباد ہے اور وسیع رقبوں کا مالک ہے۔ حضرت سید قادر شیر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے اس قصبہ کا نام شاہ پور رکھا گیا۔ ان کا مزار یہاں مرجع خلائق ہے۔

1960ء میں اس قصبہ کو یونین کونسل کا درجہ دیا گیا۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق اس

یونین کونسل کی کل آبادی 27,980 افراد پر مشتمل ہے۔

9۔ چوبارہ

چوبارہ چوک اعظم سے مشرقی جانب 28 کلومیٹر دور مرکزی شاہراہ چوک اعظم، جھنگ روڈ پر واقع ہے۔ تھل کے قدیم ترین قصبوں میں سے ایک ہے اور اپنے اندر طویل تاریخی سفر لیے ہوئے ہے۔ اس کے نواحی علاقوں سے ملنے والی مورتیاں، سکے اور برتن اس کی قدامت کے گواہ ہیں۔ خاندان سادات کے پہلے حکمران سید خضر خان نے یہاں مٹی کا قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ جسے بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مسمار کرا دیا۔ اب بھی اس قلعہ کے ملبہ سے اس کی ہیئت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ روایات میں ہے کہ عہد قدیم میں دو منزلہ مکان کی موجودگی کی وجہ سے اس بستی کا نام چوبارہ معروف ہوا جو تب سے چلا آ رہا ہے۔ صدر ایوب کے دور میں 1960ء میں اسے یونین کونسل کا درجہ دیا گیا۔ جبکہ یکم جولائی 1982ء سے ضلع لیہ کی تحصیل کا درجہ حاصل ہوا۔ اس یونین کونسل کی موجودہ آبادی 22,115 افراد پر مشتمل ہے۔ جبکہ چوبارہ شہر کی آبادی اس وقت تقریباً 6,000 افراد کے لگ بھگ ہے۔ تحصیل چوبارہ میں ''انگورہ گوٹ فارم'' اپنی نوعیت کا علاقے بھر میں واحد فارم ہے جو بکریوں کی افزائش نسل اور بیماریوں کی روک تھام پر ریسرچ کرتا ہے۔

10۔ رفیق آباد

چوک اعظم سے 12 کلومیٹر کے فاصلے پر مشرقی سمت چوبارہ روڈ پر ایک قصبہ رفیق آباد کے نام سے آباد ہے۔ 1952ء میں پشاور سے رفیق احمد خان (ریٹائرڈ ڈپٹی رجسٹرار) یہاں آئے اور انہوں نے آباد کاری کے سلسلے میں رقبہ خریدا۔ جہاں آج رفیق آباد قصبہ آباد ہے۔ یہاں انہوں نے چھوٹا سا کچا مکان بنوایا۔ یہاں پہلے پختہ سڑک نہ تھی۔ انہوں نے اپنے مکان کے سامنے ایک دیوار پر رفیق آباد لکھوا دیا۔ بعد میں جب یہاں سے پختہ سڑک تعمیر ہوئی تو محکمہ ہائی ویز نے اس دیوار پر لکھے ہوئے نام رفیق آباد کو دیکھ کر یہاں اسی نام کا بورڈ ایستادہ کر دیا۔ اس قصبہ نے کم آبادی کے باوجود جلد شہرت حاصل کر لی۔ یہ تحصیل چوبارہ کی اہم یونین کونسل ہے۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق اس یونین کونسل کی کل آبادی 25,821 افراد پر مشتمل ہے۔

11۔نواں کوٹ

کم آبادی پر مشتمل صحرائی قصبہ ہے۔ چوبارہ سے شمال کی طرف 18 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں سے براستہ 18 ہزاری جھنگ اور براستہ جمال چھپری، فتح پور تک سڑکیں بچھی ہوئی ہیں۔عہد قدیم میں اسے نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ منکیرہ، بھکر سے براہ راست متصل ہونے کی وجہ سے یہاں قلعہ تعمیر کیا گیا۔ یہ دریائے سندھ کے کنارے قبل از مسیح آباد ہوا تھا۔ یہاں سکندر اعظم اور اس سے قبل کے بادشاہوں کے ادوار کے سکے اور مورتیاں دستیاب ہونا اس کی قدامت کا مظہر ہیں۔نواں کوٹ کو 1960ء میں یونین کونسل کا درجہ دیا گیا۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق یونین کونسل کی کل آبادی 23,405 افراد پر مشتمل ہے۔

12۔شیر گڑھ

شیر گڑھ تحصیل چوبارہ میں واقع اہم تاریخی قصبہ ہے۔ 1983ء میں اسے یونین کونسل کا درجہ دیا گیا۔قلعہ شیر گڑھ ملتان کی لنگاہ حکومت کے عہد میں شیر خان سردار نے بنوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں محمد خان سدوزئی کی فوجیں ستایا کرتی تھیں اور دشمنوں کے حملے سے بچاؤ کے لیے اس پر توجہ دیتے ہوئے از سر نو تعمیر کیا گیا۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق اس یونین کونسل کی آبادی 24,448 افراد پر مشتمل ہے۔

اوراق پارینہ

میرے لیہ کو ثقافت کا مدینہ کہیے

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی

قدیم تاریخی عمارتیں، مساجد، مزارات، قلعے، مصوری، خطاطی، شاعری، مذہبی روایات، موسیقی، زبان، طرزِ زندگی، لباس، نظامِ آبپاشی، زراعت، سکہ جات، نوادرات، ذرائع آمدورفت، میلے ٹھیلے، تہوار اور حکومتی ادارے ثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ لیہ کی ثقافت کی جھلکیاں تصاویر کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اوراقِ پارینہ کو دیکھ کر ہم بقول نسیم لیہ یہ کہہ سکتے ہیں:

میرا لیہ ہے فقیہانِ ادب کا کعبہ
جس کے انگ انگ سے پھوٹا ہے میرا چشمۂ فکر
میرے لیہ کو تمدن کا خزینہ کہیے
جس کے ماحول کی نُزہت سے پشیاں ہیں چمن
میرے لیہ کو ثقافت کا مدینہ کہیے
جس کی تہذیب بری صبح تغزل کی کرن

فہرست کتب

۱۔ آر۔بی۔ ہتورام، تاریخ بلوچستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1985ء
۲۔ آفتاب احمد ملک، آفتابیات، لیہ: پاسبان تھل پبلی کیشنز، 1999ء
۳۔ ابن حنیف، سات دریاؤں کی سرزمین، لاہور: سنگ میل، 1985ء
۴۔ ابوالفضل، اکبرنامہ، لکھنو: 1284ھ
۵۔ ایضاً آئین اکبری، کلکتہ، 77-1872ء
۶۔ ابوالقاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، لاہور: شیخ غلام علی۔
۷۔ ارشاد احمد عباسی، میرانی بلوچوں کی تاریخ، بہاول پور: اُردو اکیڈمی
۸۔ احمد غزالی، ساندل بار، لاہور: فیروز سنز، 1987ء
۹۔ اکرم میرانی، سرائیکی دیس، لاہور: نگارشات، 1987ء
۱۰۔ اقبال صلاح الدین، تاریخ پنجاب، لاہور: عزیز پبلشرز، 1981ء
۱۱۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر، پنجاب کا تمدنی و معاشرتی جائزہ، لاہور: الفیصل پبلی کیشنز
۱۲۔ انور رومان، پروفیسر، (مترجم) بلوچستان کے قبائل، کوئٹہ: مطبوعات نساء
۱۳۔ ایم۔جے۔ اعوان، تحریک آزادی میں پنجاب کا کردار، اسلام آباد: ماڈرن بک ڈپو، 1993ء
۱۴۔ بھکری، محمد معصوم، سید، تاریخ سندھ المعروف بہ تاریخ معصومی، بمبئی، 1939ء
۱۵۔ بلال زبیری، تاریخ جھنگ، جھنگ، ادبی اکیڈمی 1976ء
۱۶ تھل میگزین (ادبی مجلہ) لیہ: گورنمنٹ ڈگری کالج، 1980ء
۱۷۔ جعفر بلوچ، آیات ادب، لاہور: مکتبہ عالیہ، 1988ء
۱۸۔ ایضاً، ارمغان نیاز، لیہ: دارلکتاب، کالج روڈ، 1991ء
۱۹۔ گلزار محبوب، چوک اعظم تاریخ کے آئینے میں، چوک اعظم، 1987ء
۲۰۔ عباس، سید گردیزی، تاریخ ملتان، ملتان: قصر الادب رائٹرز کالونی
۲۱۔ عبدالحق، مہر، ڈاکٹر، ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق، بہاولپور: اُردو اکیڈمی، 1969ء

۲۲۔ عبدالحق، مہر، ڈاکٹر، تھل، اسلام آباد: لوک ورثہ
۲۳۔ غلام سرور قریشی لاہوری، مفتی، تاریخ مخزن پنجاب، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، 1996ء
۲۴۔ عبدالرحمٰن، منشی، تاریخ ملتان ذیشان، ملتان: عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ
۲۵۔ عمر کمال خان، نواب مظفر خان شہید اور اُس کا عہد، ملتان: فاروقی کتب خانہ
۲۶۔ عزت اللہ شیخ، ہمارا پنجاب، لاہور، 1941ء
۲۷۔ غلام علی خان لغاری، مرقع ڈیرہ غازیخان، تونسہ، جمہوری کتاب گھر، 1988ء
۲۸۔ ملغانی، جمید الفت، پاکستانی زبانوں کا ادب، ملتان، بیکن بکس، 2007ء
۲۹۔ مزمل حسین، پروفیسر، نئے زاویے، لاہور: التحریر، 1999ء
۳۰۔ ایضاً نگارشات، ملتان: بیکن بکس، 2009ء
۳۱۔ لیاقت علی خان نیازی ڈاکٹر، تاریخ میانوالی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء
۳۲۔ ناصر، پرنس خدا بخش، انسائیکلوپیڈیا آف لیہ، چوک اعظم، لیہ: آرٹ لینڈ، 2002ء
۳۳۔ ناصر ملک، لیہ دی تاریخ (پنجابی) لاہور: لہراں ادبی بورڈ، 2008ء
۳۴۔ نور احمد فریدی، بلوچ قوم اور اُس کی تاریخ، شجاع آباد: قصر الادب، 1967
۳۵۔ نور محمد تھند، اولیائے لیہ، لیہ: دارلکتاب، 1988ء
۳۶۔ نور محمد تھند، تاریخ لیہ، لیہ: لوک پنجاب پبلشرز، 1994ء
۳۷۔ یحییٰ امجد، تاریخ پاکستان، قدیم دور، زمانہ قبل از تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1997ء

گزیٹیرز

۱۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ڈیرہ غازی خان، 1884ء
۲۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، شاہ پور، 1897ء
۳۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، میانوالی، 1915ء
۴۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، تحصیل لیہ، 1916ء
۵۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، مظفرگڑھ، 1929ء
۶۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، جھنگ، 1929ء
۷۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ڈیرہ اسماعیل خان، 1990ء
۸۔ لیہ سیٹلمنٹ رپورٹ 1865ء

ENGLISH BOOKS

1. Abdul Aziz, The Mansabdari System and the Mughal Army, Lahore, 1945,
2. Badayuni, Abdul Qadir, Muntakhib-ut-Tawarikh,Eng. Tr. by T,Wolseley Haig, Reprint, Delhi, 1973,

3. Beal Samuel Si-Yu-Ki, Buddhist Records of the Western World, London.
4. Bealce Thomas William, Ed. An Oriental Bibliographical Dictionary, Calcutta, 1881.
5. I.H Qureshi, A Short History of Pakistan (4 - Volumes).
6. Sir Edward Maclagon and H.A.Rose, A Glossary of the tribes and castes of Punjab and North West Frontier Province (N.W.F.P) (3-Volumes).

یادداشتیں

۱۔ الٰہی بخش میاں (معروف روحانی شخصیت)
۲۔ برکت اعوان (معروف صحافی)
۳۔ خاور تھلوچی (معروف صحافی)
۴۔ ممتاز رسول خان (معروف وکیل اور سیاست دان)

لغات/انسائیکلوپیڈیا

۱۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور: فیروز سنز 1960ء
۲۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (تمام جلدیں) لاہور: دانش گاہ، پنجاب، 1969ء
۳۔ اُردو لغت (تاریخی اصول پر) (تمام جلدیں) کراچی: ترقی/اُردو بورڈ، 979ء
۴۔ نور اللغات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 1976ء

اخبارات

۱۔ الٰہی بخش سرائی، حکیم فقیر: لیہ تاریخ کی روشنی میں، مظفر گڑھ ہفت روزہ ''بشارت''، 31 جنوری 1962ء
۲۔ برکت اعوان تاریخ لیہ سے ایک ورق، ملتان، روزنامہ ''نوائے وقت'' 14 جون 1990ء
۳۔ ایضاً جنگ چاہ نڑکی پڑوپی 1857ء ملتان، نوائے وقت 6 دسمبر 1992ء۔
۴۔ ایضاً جنگ چاہ ڈیڈو والا، ملتان، نوائے وقت 8 اگست 1991ء
۵۔ ایضاً جنگ واڑہ گشکوری، ملتان، نوائے وقت 8 مئی 1994ء۔
۶۔ ایضاً حضرت للّی لال اور مائی میراں کی کہانی، ملتان، نوائے وقت 8 فروری 1990ء۔
۷۔ برکت اعوان، غازی خاندان کی جرأت مندانہ داستان، ملتان نوائے وقت، یکم مارچ 1988ء۔
۸۔ خیال امروہوی، ڈاکٹر، لیہ ایک شہر ایک انجمن، کراچی رابطہ، نومبر 1991ء۔
۹۔ طاہر لاہوری، حضرت خواجہ غلام حسن سواگ، لاہور: روزنامہ ''امروز'' 19 جنوری 1989ء۔

جشن لیہ 1989، ضلع کونسل لیہ

ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی، اسسٹنٹ کمشنر، لیہ (1979-1978)

ڈاکٹر خیال امروہوی

حضرت نسیم لیہ رحمۃ اللہ علیہ
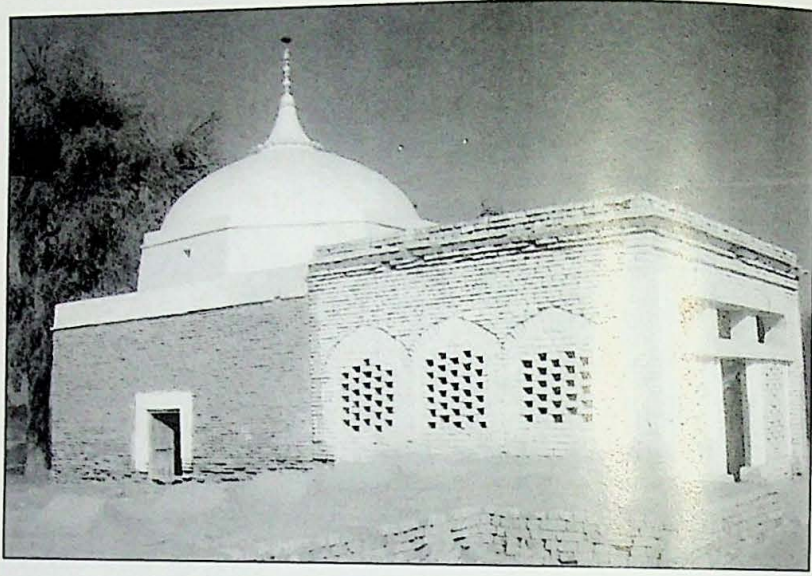
مزار حضرت سید حاجی شاہ، کوٹلہ حاجی شاہ

270ٹی ڈی اے (لوریتو) کا مرکزی چرچ

برج سکھے والا
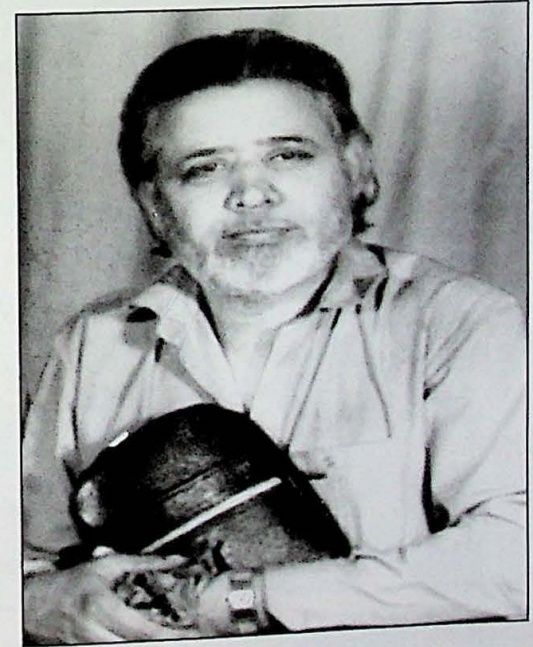
لیہ میں سکھ شاہی کی تعمیر کا شاہکار
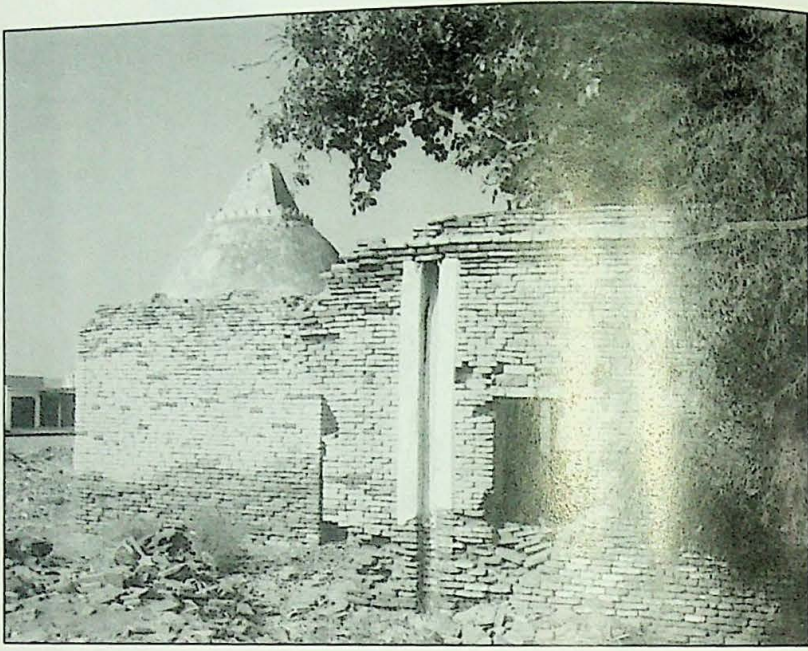
مندر مائی ماتاں، لیہ شہر
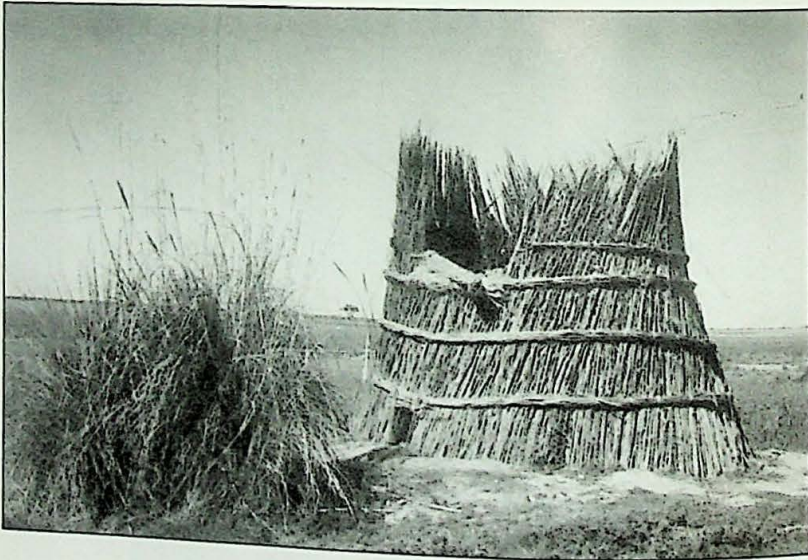
لیہ میں بھوسہ محفوظ رکھنے کا طریقہ

قلعہ نواں کوٹ

انگریزوں کے دور میں پرانا کمشنر آفس لیہ

مزار حضرت پیر جگی شریف
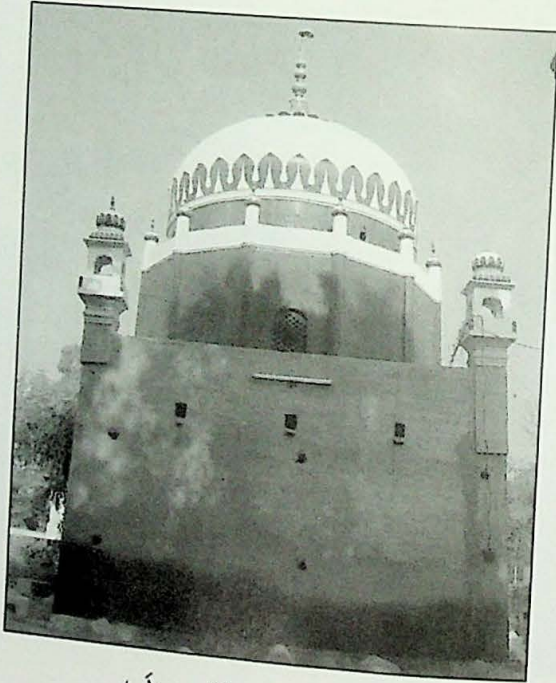
مزار حضرت شہید محمد عارف کاہوڑ اسرائی، لیہ

مزار حضرت شاہ اشرف بغدادی

مزار حضرت شاہ اشرف بغدادی کی ایک اور تصویر

تاریخ و ثقافت

پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگوئج، آرٹ اینڈ کلچر
پنجابی کمپلیکس-1، قذافی سٹیڈیم، فیروز پور روڈ، لاہور